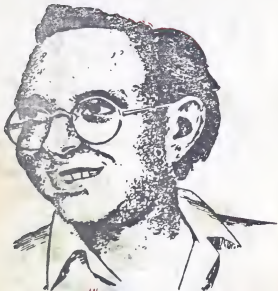


کرشن چندر



باون پتے

باون پتے
ایک ناول

باون پتے

کرشن چندر

ایک ناول

مکتبہ شعروادب، سمن آباد، لاہور



نقشہ	توازنہ
طبع	مفہم پر نظر لاہور
قیمت	۲ روپے

رفعیہ داد میں روڈ پر بحیثیت سٹوڈیو کے قریب ایکسٹرا ڈیوٹین کے آفس کے باہر بھی کے کعبے سے لگی اپنی سسلی رضیہ سے باتیں کر رہی تھی کہ اتنے میں نو بھارت پر ڈکشن کا سسٹمنٹ ڈائریکٹر بٹھا چارہ دوڑا دوڑا اُس کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا "سیٹو تمہیں بلاتے ہیں" رفعیہ نے ہاتھ جلا کے گویا پوسٹلے کو لپٹے ذہن سے دور دفنان کرتے ہوئے کہا "جاؤ۔ جاؤ تمہارے سیٹو دس بار بلانے کی کام نہیں دیتے۔ میں نہیں آؤں گی۔"

مسلے بٹھا چارہ کا دوڑتے دوڑتے دم پھول گیا تھا۔ حالانکہ نو بھارت پر ڈکشن کا دفتر یہاں سے پچاس ساٹھ گز سے زیادہ دور نہ تھا۔ پھر بھی وہ بانپ رہا تھا۔ اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "نہیں رضیہ ابھی تھوڑی دیر میں ناچنے والی لوکیوں کی ٹرائل ہوگی۔ ابھی فیصلہ ہو جائے گا۔ راستہ کو شوٹنگ ہے۔ پانچ لوکیاں موجود ہیں۔ ایک اور چلے جائے۔ تم چلی چلو۔ ورنہ۔"

بھٹانے رضیہ کی طرف دیکھا۔ رضیہ نے اپنی گولڈ ڈائج کی طرف دیکھا اور پھر رضیہ سے سفارش کرتے ہوئے کہا "تو چلی جا۔ میری تو آج اپنے دلدار کے ساتھ جوہر پراجوائنٹ میمنٹ ہے۔"

"ہاں ہاں۔ رضیہ جگ کر رہی" تو جا جوہر۔ عیش کرے۔"

رضیہ نے کہا ”تو بھی عیش کر سکتی ہے۔ کسی کو دلدار بنائے“

”وہ میرے چھو دلدار گھر پر جو بیٹھے ہیں محرمی روڈ پر۔ اُن کا کیا کر دل گئی پھر؟ دن بھر سیٹ پر اُٹھ کے کُتیا کے پنوں کی طرح چاؤں چاؤں کرتے رہتے ہیں۔ ایک میرا دلدار وہ بیٹھ عاجی یا سین بھائی لوط بھائی ہے۔ ایک مکان جس کا چار بیٹے کا کرایہ مجھے دیتا ہے۔ ایک میرا دلدار وہ میرا بھائی سیگیا فی ہے جس کی دوکان سے میں راشن لاتی ہوں۔ ایک میرا دلدار ریلوے گپنی کا وہ کلرک ہے جس کے ہاں ہوا مجھے نوکس ٹرین کے پاس کے روپے جمع کرانے پڑتے ہیں۔ ایک میرا دلدار —“

بھٹا چاریہ نے اپنی مٹھی تاک پر اپنے موٹے موٹے شیشوں والی عینک ٹھیک کی اور گڑ گڑاتے ہوئے بولا ”رضیہ بولی؟“ (رضیہ ہائی)

”ہاں بھائی؟“

”سیٹھ بولا کہ ہے؟ بھٹا چاریہ نے ٹہنی عاجزی سے نو بھارت پروڈکشن کی بلائنگ کی طرف اشارہ کر کے کہا ”اچھا ہیں۔“ رضیہ نے بھٹا چاریہ کی گویا درخواست منظر دکھاتے ہوئے کہا۔ پھر رضیہ کی طرف مڑ کر بولی ”میں نے گی ناہینا۔“

”ہاں؟“ رضیہ نے اپنے سونے کے لاکٹ کو اپنے صاف ستھرے سنہرے رنگ کے سینے پر گھماتے ہوئے کہا۔

”کہاں؟“

”یہیں.... چوبیسے شام کو۔ اسی بجلی کے کھمبے کے نیچے۔“

”ہائی۔ ہائی۔“

رضیہ جلدی جلدی نو بھارت پروڈکشن کے دفتر کی طرف چلنے لگی۔ گو بھٹا چاریہ کا دم پھٹلا جا رہا تھا۔ بھر بھی وہ جلدی جلدی کسی نہ کسی طرح قدم ملائے رضیہ کے ساتھ چل رہا تھا۔ اور چلتے ہوئے

تقریباً ہاتھ جوڑتے ہوئے ٹنگیاتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا: رضیہ بولی، تم کہاں ظلم پس آگئیں؟ یہ
 سے تم بہت شریف معلوم ہوتی ہو۔ یہ لائن تمہارے لئے ٹھیک نہیں ہے۔ اب اگر آگئی ہو تو ان مندرجہ
 پتہ یوں، گجراتیوں کے ساتھ کام کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ صرف بڑھکانی ڈائریکٹروں کے ساتھ کام کرو۔
 بڑھکانی لوگ بڑے پکھڑ ہوتے ہیں۔ ہمیرا بھال، ہمیرا ٹیگور، ہمیرا دیو کی بابو، ہمیرا فیروز تھیسرس، یہاں
 میں نے ستین گھوش سے تمہارا بات کیا ہے۔“

بھٹا چا دی نے رضیہ کی طرف اس طرح پگھلی محبتوں سے دیکھا۔ جیسے بچہ اپنے سالگرہ کے
 ٹیک کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ کچھ اور کہنے والا تھا کہ اتنے میں نو بھارت پروڈکشن کا دفتر آگیا۔ اور رضیہ
 جلدی سے اندر جا کے بڑے ہال میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے پانچ اور لوگ یاں بیٹھی تھیں۔
 غالباً اس کی طرح ڈانس کی ٹرانی دینے آئی تھیں۔ وہ اُن میں سے تین کو نہیں جانتی تھی۔ دو سے ہیں
 علیک سلیک تھی۔ رضیہ نے ہاتھ اوپر اٹھا کے انہیں آداب کیا۔ اُن دونوں نے سر کی جنبش سے
 بڑی نخوت سے آداب کا جواب دیا۔ کیونکہ وہ دونوں بے حد خوب صورت تھیں۔ گوری چننی، اچھے
 لباس، اچھے زینوروں میں بھیجی جوائی۔ گویا بالکل ڈھن بن کر ڈول میں بیٹھنے کے لئے تیار۔ اور رضیہ کی
 شکل صورت خدایوں ہی سی تھی۔ رنگ سانولا۔ آنکھیں بڑی بڑی گرہنے حلقے بڑے ہوئے۔ ناک
 نیچی۔ مگر ہونٹ موٹے۔ اور ہر کے دانت خدا میٹر سے میٹر سے۔ قد نہ چھوٹا نہ لمبا۔ مگر چہرے سے نیچے جسم
 بے حد متناسب تھا۔ سینہ، کمر، کولہے، رانیں، پنڈلیاں۔ اک بھیجی ہوئی، مشاق لہجے والی کی سڑا
 کیفیت لئے ہوئے۔ رضیہ جب سٹوڈیو کے فرش پر ناچتی تھی۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا جیس کی سٹار
 کوئی کنول رقص کر رہا ہے۔ مگر سٹی میں نودارو تھی اس لئے کام خدا شکل سے ملتا تھا۔

رضیہ نے ہال کی دیوار پر لگے ہوئے کلاک کی طرف دیکھا۔ اُسے یہاں آئے ہوئے چند
 منٹ ہوئے تھے۔ اور ابھی تک ڈائریکٹر کا کوئی پتہ نہ تھا۔ اُس نے نظر گھما کر ہال کے اندر دروازے

کی طرف دیکھا۔ جو پلائی ڈڈ اور دودھیا رنگ کے کاغذ کے استخراج سے بنا ہوا تھا۔ دودھیا رنگ کے کاغذ پر ایک نئی عورت کی تصویر تھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کاغذ ہی کی سطح پر ابھرے ہوئے الفاظ میں لکھا تھا۔ ”نوبھارت پروڈکشن“۔ اسے میں پلائی ڈڈ کا دروازہ کھلا۔ اور بٹھا چاریہ ایکسپریس کے گھنٹے اور گھنٹی رنگ کے آدمی کو جس نے ایک سفید پتلون اور بوکی کی تیس پہن رکھی تھی اپنے ساتھ لے کر ہال میں آیا۔ اندر آئے اس نے رفیع کی طرف اشارہ کیا رفیع نے اٹھ کے آداب کیا۔ لائے گئے آدمی نے اپنی بوکی کی سی جھوٹی مگر نہایت تیز آنکھوں سے رفیع کو دُور سے بھانپا۔ پھر وہ اس کے قریب چلا گیا۔ اور اس کے گرد ایسے گھوم گیا۔ جیسے کسی شے کے گرد گھوم رہا ہو۔ اس نے چہرہ، سینہ، اکر، کو لہجے سب کا اندازہ کر لیا۔ پھر اُس نے بٹھا چاریہ کی طرف دیکھ کر کہا: ”ہوں؟“ اس کے بعد پلائی ڈڈ کا دروازہ دیر تک فیس کے دل کی طرح لڑتا رہا۔ کیونکہ یہ شخص غم ڈار، کٹر جوشی تھا۔ جس کی تصویر میں رفیع کو کام لےنے والا تھا۔

رفیع نے بٹھا چاریہ سے پوچھا: ”اس ہوں کا کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ تم پاس ہو۔“ بٹھا چاریہ نے جواب دیا۔

”مگر ڈانس کی ٹرائی تو لی نہیں۔“ ساتھ ساتھ جواب ہو گئے ہر رفیع نے کھاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”مجھے گھر جانا ہو گا اور گھر جاکے کھانا تیار کرنا ہو گا۔ کیونکہ اماں بیمار ہیں۔ اگر میں پاس ہوں تو ان سے پوچھ کے۔۔۔“ رفیع نے پلائی ڈڈ کے دروازے کے اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

کہا: ”مجھے بتادو۔ میں وقت پر شوٹنگ میں آ جاؤں گی۔ جوشی جی سے پوچھ لو؟“

بٹھا چاریہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور اندر پوچھنے کے لئے چلا گیا۔ اگلے پیر دن لوٹ آیا بولا: ”ڈانس کی ٹرائی ہوگی پھر فیصلہ ہو گا؟“

”کب ٹرائی ہوگی؟“ ایک پنجابی لڑکی نے اپنے رخسار پر بڑے ٹھٹھے سے اٹھی رملہ کر کہا: ”ہم تو یہاں سچ بچے سے شہی ہیں۔ آں تو ہم کب ٹرائی ہو گے۔ ہم کو کوئی کام دیا نہیں ہے اور؟“

”آں؟ بھلا؟“

پنجابی لڑکی کو بڑا مختصر آ رہا تھا۔

بھٹا چاریہ نے اُسے بھلاتے ہوئے کہا ”ابھی ہوگی۔ سیٹھ کا انتظار ہے“ سیٹھ تو اندر بیٹھے ہیں۔ ایک اور لڑکی نے چمک کر کہا ”میں جب آئی تھی تو اُن کو اندر جلاتے دیکھا تھا۔ مجھ کو کیا بناتے ہو۔ دس سال سے فلم انڈسٹری میں کام کر رہی ہوں سیٹھ جیال بھائی کو میں نہیں جانتی کیا؟“

بھٹا چاریہ نے اور بھی دھیرے سے دھیرے سروں میں اُن سب سے کہا ”وہ تو کہنی کے بالک ہیں نا سیٹھ جیال بھائی باکڑیا۔ مگر یہاں اس وقت ایک دوسرے سیٹھ کا انتظار ہے۔ سیٹھ بھگت۔ لال ڈسٹری بیوٹر کا...“

”یہاں کون کس کا سیٹھ ہے کچھ پتہ نہیں چلتا“ دس سال سے فلم میں کام کرنے والی لڑکی بڑی آندگی سے بولی۔ اور بھٹا چاریہ کی طرف چٹوہ کر کے بیٹھ گئی۔

بھٹا چاریہ نے بائیں بے بس ہو کر کہا ”بس ابھی آتے ہوں گے۔ اُن کا ٹیلی فون آیا تھا۔ ابھی آدھ گھنٹہ میں آجائیں گے۔ ٹرائی ہو جائے گی“

”ٹرائی دابچہ“ وہ پنجابی لڑکی بھٹا چاریہ کے اندر جانے کے بعد بولی ”ساڈا امرتسر ہوتا۔ تو اس کی مائیں حیر دیں۔ پنج روپے دا بلکہ بھٹا یا ہوا۔ اس سو روپے پُرنے اُ“

رفیہ کو اس کی باتیں سُن کر مزا آگیا۔ اچھا تو یہ بے پاریاں پانچ بجے سے ڈانس کی ٹرائی کے لئے بیٹھی تھیں! رفیہ نے دل ہی دل میں تسکریہ ادا کیا کہ وہ ابھی آئی ہے۔ ورنہ اُسے بھی ہتھکڑیاں اتار کر لٹا کر دیتا۔ اتنے میں یلائی وڈ کے دورانے کے اندر سے ایک زوردار قہقہہ سنائی دیا۔ اور سب لوگوں کی نظرس ایک لمحے کے لئے دروازے پر جا کر جم گئیں

پلائی وڈ اور کاخ کا دروازہ ایک پلائی وڈ کین کے اندر کھلتا تھا۔ یہ دروازہ اس کین میں کچھ اس طرح سے فٹ تھا کہ بال میں بیٹھنے والے کو اس کین میں بیٹھنے والے کا صرف دھڑنظر آسکتا تھا۔ اور اس دروازے سے اوپر جھانکنے والے کو صرف دھڑ سے اوپر کا حصہ نظر آسکتا تھا۔ یہی نہ یہ دروازہ اس کین کے وسط میں اوپر سے اور نیچے سے دونوں طرف سے کھلتا تھا کہ پلائی وڈ کم خرچ ہو۔ گو بایہ دروازہ نہ تھا۔ لکڑی کا ایک ٹیکر تھا۔ جو ہر کے سامنے پر بنانے والی حسیہ کے لئے تیرکی کا لباس تھا جس میں نظر زیادہ آتا ہے۔ اور چھپایا کم جاتا ہے۔

رفیہ جو بال میں ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ پلائی وڈ کین میں ایک میز کے نیچے بہت سی کٹھی جگہوں کا اجتماع دیکھ رہی تھی۔ ہنسا چاریہ جو کین کے اندر دروازے سے لگا کھڑا تھا وہ ان ہانگوں سے اوپر کے انسانی جسم دیکھ رہا تھا جو اُس وقت بظاہر زری ایسے دل چپ کھیل میں مصروف نظر آتے تھے۔ مگر ہنسا چاریہ جانتا تھا کہ اُن میں سے ہر شخص کے کان ایک کونے میں پڑے ہوئے ٹیلی فون پر گئے ہوئے ہیں۔ جہاں ابھی ابھی سیٹھ بھگت لال کا کال آیا تھا۔ ہنسا چاریہ نے یہی کھینے والوں پر نظر ڈرائی۔ اُن میں سب سے نمایاں ظلم کے پر وڈر سر سیٹھ میناں بھائی بانکو باتھے۔ اور بھاندر۔ زریہ اندام سر کے بال بال مکمل سفید۔ موری چٹی رگت پر بڑا شست کھیتی ہوئی۔ ہاتھوں میں ہیرے کی تین انگوٹھیاں

پہننے ہوئے سب سے کم متفکر دکھائی دیتے تھے۔ سیٹھ میتال بھائی نے جنگ کے زمانے میں غلوں کے لائسنس کی بلیک مارکیٹ کی تھی، ان دنوں فلم کے ایک لائسنس کے عوض بلیک مارکیٹ سے لاکھ سوا لاکھ روپیہ لیا جاتا تھا، بس گورنمنٹ آف انڈیا سے فلم بنانے کا ایک لائسنس لے آئے اور اُسے بلیک مارکیٹ میں بیچ دیکر بیٹے سوا لاکھ روپیہ مل جائے گا۔

سیٹھ میتال بھائی بانٹھا یا اب تک کوئی پختہ نہیں بنا چکے تھے۔ جنگ سے پہلے ہر راہ تفسیر یا ایک فلم تیار کر لیتے تھے۔ بارہ لائسنس یوں ہی آگئے۔ پھر ان کے پاس تین سٹوڈیو تھے۔ چار چاروں کے لائسنس اُن سٹوڈیو کے حصے میں بھی آئے۔ بارہ لائسنس یہ ہو گئے۔ جو میں لائسنس اگر وہ بازار میں بیچے تو ہر سال خیرے میں بیٹھے بٹھائے تیس لاکھ کی آمدنی ہو جاتی۔ مگر سیٹھ اتنے فوجی نہ تھے۔ انہیں قوم کا بھی خیال تھا۔ تین سٹوڈیو میں جو لوگ کام کر رہے تھے ان کی بیوی بچوں کا بھی خیال تھا۔ اس لئے وہ سال میں صرف بارہ لائسنس کالے بازار میں بیچتے تھے اور بارہ کی تصویریں بناتے تھے۔ اُن سے جو منافع ہوتا تھا وہ اس کی ایک پانی ظلم میں نہیں لگاتے تھے۔ بلکہ اس سے زمین خریدتے تھے۔ مکان، جڑی بڑی بلا لگیں۔ ۳۳ فلوڈ کے حصے۔ روٹی کے مل کی یکینی۔ شکر کی مل کی پارٹنرشپ۔ غرض کہ جہاں سرمایہ زیادہ محفوظ لگتے۔ وہاں اپنا منافع لگاتے تھے۔ اور یہ بات انہیں اُن کی میڈم بھائی تھیں۔ میڈم اُن کی بیوی نہ تھی۔ اُن کی بیوی تو کالابادیوی روڈ میں ایک چھوٹے سے فلیٹ میں اپنے پانی بکڑوں کے ساتھ رہتی تھی۔ میڈم اُن کی داشتہ تھی۔ ان کی جان۔ اُن کی ڈارنگ۔ اور جب سے میڈم نے اُن کے کاروبار میں دل چسپی لینا شروع کی تھی، میڈم اُن کی عقل بھی تھی۔ سیٹھ میتال بھائی بانٹا۔ باب اپنی عقل کا استعمال صرف خاص موقعوں پر کرتے تھے۔ کیونکہ سرسائے کے حصوں میں عقل ایک اس حد تک کام کرتی ہے۔ ایک خاص حد کے بعد جب سرمایہ جڑو جاتا ہے۔ تو پھر خود بخود جڑو جاتا ہے۔ پھر عقل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ پھر سرمایہ اور منافع کی اپنی عقل ہوتی ہے۔ جو خود بخود کٹ

کھدائیں کی طرح کام کرتی تھی ہے۔

سیٹھ میتال بھائی بائیکٹر کا سرمایہ جب پچاس لاکھ سے تجاوز کر گیا۔ تو انہوں نے بھی سرمایہ کی اس خود عقل سے کام لینا شروع کیا۔ اتنا بڑا سرمایہ برت کے گولے کی طرح ہوتا ہے۔ جوں جوں اُسے گھماتے جاتے۔ یہ خود بخود برت کے گولے کی طرح بڑا ہوتا جاتا ہے۔ اور اپنے گرد اور روسیہ سمیت جاتا ہے۔

سیٹھ میتال بھائی بائیکٹر اپنے روپے کو منافع کی اس بڑی منزل پر پہنچا کر خود ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اور کاویا زیادہ قریب تک کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ خود اس وقت نہایت ٹینگنگی اور زندہ دلی سے بیٹھے ہوئے ری میں مار رہے تھے۔ اور بیٹم کا انتظار کر رہے تھے۔ جولاہ بگت لال ڈسٹری بیوٹر کو لانے کے لئے گئی ہوئی تھی۔ بٹنا چارہ کی کھانہ میٹم کی کرسی پر گئی جہاں اس وقت بائیکٹر باسیٹھ کا نیا فلم ڈائریکٹر اکرم میز پر گھڑوں مٹیا ایک منٹھل سے اُداس انداز میں رمی کھیل رہا تھا۔ اس کے چہرے سے قریح ہوتا تھا۔ جیسے اُسے اس کھیل میں قطعی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ صرف وقت کاٹنے کے لئے یہاں بیٹھا ہے اور یہ صحیح بھی تھا۔ اکرم کا دل اس وقت تاش کے چٹوں میں نہ تھا۔ وہ بھی لالہ بگت لال ڈسٹری بیوٹر کی آمد کا منتظر تھا۔ کیونکہ سیٹھ میتال بھائی بائیکٹر اپنے اس سے وعدہ کیا تھا کہ لالہ بگت لال کے آتے ہی وہ اُسے اس کی نئی ٹچکر کے لئے جو اکرم سیٹھ صاحب کے لئے شروع کر رہا تھا ایک ہزار روپیہ دے دیا۔ اکرم کو سیٹھ میتال بھائی نے ایک قوی فلم بنانے کے لئے نوکر رکھا تھا۔ کیونکہ اکرم فلمی حلقوں میں سوشلسٹ سمجھا جاتا تھا۔ وہ دراصل فلم انڈسٹری میں بیرونی کے لئے آیا تھا۔ میانہ قد، خوب صورت کٹائی چہرہ، فراخ ماتھا، گنگھریلے بال۔ اُسے کسی بھی فلم کا ہیرو بنا دینے کے لئے کافی تھے۔ فلم انڈسٹری میں آنے سے پہلے وہ اردو تاتاری میں بھی ایک مستند حیثیت کا ادا تھا۔ اس نے بہت وہ فلم انڈسٹری میں آیا۔ تو شروع شروع میں اس کا بہت آؤ بگت ہوئی۔ وہ دونوں کا یکے بعد دیگرے ہیرو بننا۔ مگر اوکاسی اُسے اس نہ آئی۔

جس قسم کی قلعہ بندی اور کاری کی ضرورت تھی۔ وہ اس سے ہوشیار نہیں سکی۔ اور جس قسم کی نظری انداز کاری وہ پسند کرتا تھا اسے یہاں کے فلم ڈائریکٹر گماں سمجھتے تھے۔ پھر انداز کاری محدود کر اس نے گیت لکھنے کمالے لکھے۔ کہانیاں لکھیں۔ تین چار فلمیں بھی ڈائریکٹ کر ڈالیں۔ مگر ان فلموں میں وہی مسیبت تھی۔ یہ فلمیں عام راستوں سے اس قدر مٹی ہوتی تھیں ان میں جھانسنے نہ تھے۔ ناج تو بالکل نہیں تھے۔ وہ ہڈ ہڈی کا سیٹی بھی نہیں ان فلموں میں کوئی مسخرہ اپنی توند ہلا کے ہنسانا نہ تھا۔ نہ کوئی نظریات بشلہ کی سی مٹھیں لگائے آدمی آدمی اور آدمی انگریزی بولتا تھا۔ ان فلموں کا ماحول ایسا ٹریل اور گینگو جیسے ہندوستان میں رہنے والے کرداروں کا انوں اور غریب فردوں کا ہوتا ہے۔ گروار ایسے فیئر شاعرانہ موضوع اس قدر روزمرہ کی بھینٹوں اور مصوحتوں کے ساتھ بندھا ہوا کہ فلم دیکھنے والے تو دوسری دن میں پکڑا گئے اور تصویریں فیل ہو گئیں۔ اور وہ جو خوب صورت تھا۔ حسین تھا۔ جو اپنے وطن سے اپنا لوکا سا جسم۔ یوسف کلاشن اور غالب کی سی نظر لایا تھا۔ جنگ کے آخری چار سالوں میں پچھلے کے زد گیا۔

اس وقت اس کی وارٹی بڑھی ہوئی تھی۔ اس کی تپلون پرمیل کے چمکتے تھے۔ اور دوسرے نظریات آنے والے لٹکے تھے۔ جنہیں اس کی دوسرے منہ بہ منہ نے بڑی محنت سے سہا تھا۔ سیٹو میٹاں بھائی باکریا کچھ جیسا سوچ رہے تھے گویا جنگ کے بعد قوی موضوعات کا زمانہ آئے گا۔ اس نے انہوں نے پہلے ہی سے سوچ بچھ کے اکرم کو اپنے ہاں دوسال کے کنٹرکٹ پر رکھ لیا۔ مگر اب وہ اکرم کی پچیس شروع کرنے میں بہت چپکا رہے تھے۔ جانے چلے نہ چلے۔ اس ملک میں جہاں دو آنے کے منافق کے لئے افراد اپنے ملک سے غداری کر جاتے ہیں! جانے اس ملک میں قوی موضوعات کو جیتنے ہونے کوئی کچھ چلے گی بھی کہ نہیں.... کہ ان کا حشر بھی ان تصویروں کی طرح ہو گا جو اکرم نے اس سے پہلے بنائی تھیں سیٹو جہاں سے کوئی فیصلہ نہ کر پائے تھے۔ اکرم کی پچہ شرفی نہیں ہو رہی تھی۔ اور اکرم پریشان تھا گواہ کے پاس دوسال کا کنٹرکٹ تھا۔ لیکن جس ڈائریکٹر کے پاس پچہ نہ ہو اس کے کنٹرکٹ کی

کیا حیثیت ہوتی ہے۔ کیا کرم اب ان چار سالوں میں خوب سمجھ چکا تھا۔ دیکھتے کچھ قیامت کیا رنگ لاتی ہے۔ کچھ سیٹھ نے اس کی کچھ شرور کرنے کے لئے اس سے ایک ہزار کے چیک کا وعدہ تو کیا ہے۔

بھنا پار یہ خوب جانتا تھا کہ کرم کے دل دو ملنا پر کیا گزر رہی ہے۔ مگر اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے اپنے فلم ڈائریکٹر شری جوشی جی بھی اسی چیک کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ری کھیل رہے تھے۔ جوشی جی بڑے سنجے ہوئے فلم ڈائریکٹر تھے۔ ان کی فلم ڈھونگی، ڈالی، ڈم ڈم، اور ڈڈاں ڈڈاں ڈڈاں ڈڈاں عوام میں بے حد مقبول ہوئی تھیں۔ جوشی جی کی ہر فلم ڈاں سے شرور ہوتی تھی، اور وہ اپنی فلموں میں عورت کے جسم کی نمائش کے بے مثال تھے۔ عورت کے بال، عورت کی آنکھیں، عورت کا سینہ، عورت کے بانو، اس کے کولے، رانیں، پنڈلیاں ہر چیز کی نمائش کرنے کے قائل تھے۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا، اور وہ عورت کو باطل نگاہ کر کے فلم میں لے آتے تھے۔ کیا کرم سیٹھ؟ جوشی جی نے ٹنگی اٹھا کر رنگ لگاتے ہوئے کہا "سنس کی قسمی سے ڈھنگا ہے۔ اور ایسی کچھ بناؤں کہ قیامت تک ڈائریکٹر سے!"

سیٹھ جیتاں بھائی نے اس کی ایک ٹہلی لیتے ہوئے کہا "مگر جوشی جی تم نے اپنی جتنی کچھ کام کیا سو چاہیے۔" "نام، نام؟ جوشی جی نے میز پر زور سے ٹکڑا مار کے کہا "اسے نام، اسے سیٹھ اور ڈھونڈ نام لوں گا، وہ ڈھونڈ نام لوں گا۔ پھر بچا ایک رنگ کر اپنے گنچے سر پر ہاتھ پھیر کے بولے "اسے سیٹھ یہ ڈھونڈ نام خود کیا ہے؟ ڈھونڈی ڈڈاں، ڈم ڈم، ڈڈاں ڈڈاں ڈڈاں اور ڈھونڈ!"

"ڈھونڈ کا مطلب کیا ہے؟" کرم نے ذرا اک تیز قسم کی آندہ دگی سے پوچھا جس میں تھوڑی سی حقارت بھی شامل تھی۔ یہ ڈھونڈ کس زبان کا لفظ ہے؟

کسی زبان کا بھی ہو اپنے کو اس سے کیا ہے۔۔۔۔۔ جوشی جی گرج کے بولے "مگر اچھا لگتا ہے"

کہ نہیں۔ جوتے وقت نہ بھرتے کہ نہیں۔ ڈمنو! ذرا بول کے دیکھو۔ ایسا سالا معلوم ہوتا ہے کسی نے
منہ میں خیال رکھ دیا۔ ڈمنو!!

”راہ راہ میرے یار!“
جوشی جی نے خود اپنی پیٹھ کو ہٹا دی۔

بھٹا چارہ زور سے بولا ”راہ! راہ! جوشی جی کیا نام سُجھا ہے۔ ڈم فو ایک دم نیا۔ ایک دم اور کھل
ایک دم بھگلی!“

میز پر ڈالس ڈاؤن رکھ کر بابولال بھی بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں میں سرمہ لگا رکھا تھا اور کنبھو
پرانی لائبریری میں بڑھ چکی تھیں۔ اس کا چہرہ ایک دیے خارش زدہ کتے کی طرح لبو تھا اور کچکا ہوا تھا
جسے غالباً چھ مہینے سے کبھی پیٹ بھر کے کھانا نہ ملا ہو۔ مگر یہ بات نہیں تھی۔ بابولال غلی صفت کے
رقاصوں میں سب سے عمدہ اور ڈرجیا رقص مانا جاتا تھا۔ وہ ایک عمدہ غلیٹ میں رہتا تھا۔ ایک عمدہ
کار میں گھومتا تھا۔ ایک عمدہ چوکری کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ کاریں اور عمدتیں بدلنے میں اُسے یرغیوئے
حاصل تھا۔ وہ بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ وہ دنیا کی ہر قوم کی عورت چمک چکا ہے۔ اور خیر امراض میں سے
کئی ایسا مرض نہیں جو اسے لاق نہ ہو۔ اس کا چہرہ انہیں امراض کا بیٹا جاگتا تھا۔ ڈمنو! پھر وہ بھی
پھل پڑا اور جوشی سے اتھلائے ہوئے کہنے لگا۔

ڈم فو۔ ڈم فو

بجم فو۔ بجم فو

کمر کما کمر۔ کمر کما کمر

ڈم فو!!!

تالی سے ترحیم کا بھاؤ تھا کہ اس نے کہا۔ ایسی اسپینی ٹینگوں میں اس پر دوں گا کہ سارا بانی وڈا کا

نہے دیکھ کر کہے چکر اے وہ جائے۔ سیٹھ دم فوجیت عمدہ نام ہے۔

اب میز پر صرف ایک آدمی خاموش تھا۔ بجن دت موسیقار بینی سورگ ڈائرکٹر بجن دت کی ذہین آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ اور اکرم جانشا تھا کہ اسے یہ نام پسند نہیں ہے۔ بجن دت ہندوستانی فلم انڈسٹری میں آنے سے پہلے اپنی قوی موسیقی کے بہترین ماہروں میں شمار ہوتا تھا۔ اس نے گاؤں گاؤں گھوم کے کوئی دو ہزار سے زیادہ لوگ گیت اور سینگلوں دھنیں جیج کی تھیں وہ جب فلم انڈسٹری میں آیا تھا تو اکرم کی طرح ایک آئندہ شہ۔ ایک خواب۔ ایک قوی فلسفہ۔ ایک سماجی مقصد۔ ایک نیا زاویہ نگاہ لے کے آیا تھا۔ جس تصویروں کی موسیقی مرتب کرنے کے بعد اس کے دل کی چمکاری روشن تھی۔ مگر چاندی کے ڈھیروں تلے دبی تھی۔ کیونکہ اس نے کامیابی کے لئے لوگ دھنوں میں فحش اور بازی گیت بندھے تھے۔ وہ دھنیں جس میں اس کے ٹنک کے کسانوں نے گندم کی فصل بونی تھی۔ دھان کے خوشے ہارائے تھے دھنیں جو کنواریوں کے ترچھن۔ دھن کی ڈولی اور ماں کی لوری کے لئے وقف تھے۔ آج قصا بوں کی طرح کوٹھوں کا گوشت۔ مگر کاغذ اور پٹلیوں کی گاؤں دی بچ رہے تھے۔

بجن دت کو معلوم ہوا تھا کہ فلم انڈسٹری میں نہیں کسی بوجہ خانے میں آگسا ہے۔ مگر سب اُسے قوی موسیقی کو ذرا کرنے کے لئے پچاس ہزار روپے مل رہے تھے اور فلم کے باہر کوئی اُسے پاس دینے کو تیار نہ تھا۔ اس لئے بہت عرصہ ہوا بجن دت نے سوچ بھ کے آنکھ بند کر لی۔ اپنے دماغ کو آلاکھیا اپنے سماجی مقصد کو دھنوں گہری چاندی کی بھوت میں چھپا دیا۔ اور خود ہاتھ میں ہارمونیم کا بخرے کر اُن لوگ دھنوں کو ذرا کرنے بیٹھ گیا۔ جنہیں اس نے اپنی جوانی کے بہترین ایام میں اس کاوش سے اکٹھا کیا تھا۔

بجن دت نے دیکھی کا ایک بہت بڑا بیگ ایک ہی سانس میں مقلق میں اندر مل لیا اور آنکھیں نیچی کر کے ہلا کیونکہ اکرم اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سیٹھ سدا پھے (بہت عمدہ ہے) چلے گا۔

سیٹھ میاں بھائی بانگڑیا نے خوش ہو کر جوشی جی کی طرف دیکھا۔ پھر بیٹا چاری کی طرف دیکھ کر کہنے لگے ”بیٹا کل سیٹھ میاں خیر سے بہرہ دے کر وہ جوشی کی نئی فلم ڈوم فوکا شہارہ دے دے فلم نوز میں اپنا مصروف کر دے“ اکرم نے شرم سے سر جھکا لیا۔ کیا وہ کوئی انوکھا نام نہیں کر سکتا۔ کیا وہ کہیں بھاگ کے نہیں جا سکتا کیا وہ ایشیں نہیں ڈھو سکتا۔ کیا وہ تگی گیری نہیں کر سکتا۔ کیا وہ مدوئی کی دل میں خود دہری نہیں کر سکتا۔ کیا وہ ٹوک پر جہاز لیں گا کام نہیں کر سکتا۔ کیا وہ ————— بھیک اکرم نے محسوس کیا کہ وہ جی میں سے کوئی نام نہیں کر سکتا۔ وہ بھیک ایڑیاں درگڑ کے خاموش ہو گیا اور ایک پتہ اٹھانے لگا۔ جو کہر جو کہر تھا۔ جیسی ہر نہیں رہا تھا۔ تاش کا پتہ۔ زندگی کے ایک فزینہ لمحے کی طرح اس پر تپیں رہا تھا بھیک اکرم نے تاش نیر پر بھیک دئی۔ اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

سیٹھ میاں بھائی گہرا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اکرم نے کہا ”کچھ نہیں سیٹھ۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔“ اکرم یہ کہہ کر کہیں کے اس طرف کی کھڑکی میں چلا گیا جو باہر بازار کی طرف مٹاتی تھی۔ اس کھڑکی پر تھے وہ بازار کا لگد و کچھ سکتا تھا۔ ایرانی کی دوکان فلم ایکسٹراؤں سے بھری پڑی تھی۔ پان دالے کی دوکان پر تین رنگے کھڑے پان کمار ہے تھے۔ اور چند بے ٹکڑے اُن کے گرد کھڑے ہنس رہے تھے۔ رنگ بکے پاد پڑانی موٹر وی کے پڑے بیچنے والا بچہ سنگ اپنی کھاٹ پر میٹھا میٹھا ڈنگ رہا تھا۔ نیلی فون کے بجھے کی تاروں پر کوڑے بیٹھے تھے اُن سے اوپر آسمان بنے مدد گدلا اور کشیت حملہ اور اُس آسمان کی دھندلی آنکھ بدلی داری تھیں ایک پیلا بد نما وجہوں والا پانڈا ایک جلی ہوئی روٹی کی طرح نظر آ رہا تھا۔

اکرم نے قند سے اپنی ٹھنڈی گچھ لیں۔ وہ جانے تو کہاں جاتے۔ کھڑکی سے واپس چلا آیا بیتال بھائی نے اس کے گلاس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”تہارا گلاس اسی طرح بھرا پڑا ہے۔“ اکرم پر کڑی ہنسی کر دیکھنے لگا۔ دیکھی تیغ! زندگی کی طرح۔ ناگامی کی طرح۔ اس کے گچھے ہوئے کرے کی طرح۔ اچھی فلم کے خالی ہال کی طرح۔ محبوب کے آخری انکھار کی طرح۔ موت کے جاہر لمحے کی طرح۔ کیا

اتنی ساری تلخیوں سے دسکی کا ایک گھونٹ بڑھاپے؟ مگر لوگ تو کہتے ہیں اس میں نشہ ہوتا ہے۔ آج نشہ کہاں ہے؟

جھٹلا کے اکرم اٹھ کھڑا ہوا۔ مین اُسی وقت پلائی ڈو کے مردانے کی نگلی عورت اپنی جگہ سے ہلی۔ قریب آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ دروازہ کھلا اور سیٹھ بھگت لال ڈھٹری بیوٹر کو اس ترک و انتظام سے داخل ہوا کہ لوگ اپنی کرسیوں سے کھڑے ہو گئے۔

سیٹھ بھگت لال کا چہرہ اس قدر گول تھا۔ گویا معلوم ہوتا تھا کسی نے پرکار رکھ کر دائرہ کھینچ دیا ہے۔ اُس کے چہرے کے نیچے کا جھٹ یعنی سینہ، مکر اور پیٹ بھی موٹاپے کی وجہ سے اس قدر گول تھے کہ اس کے چہرے اور پیٹ کو دیکھ کر لوں محسوس ہوتا تھا۔ گویا کسی نے بڑے دائرے کے اوپر ایک چھوٹا دائرہ رکھ دیا ہے۔ اگر سیٹھ بھگت لال جیومیٹری کی اشکال کا ہی مجموعہ ہوتے تو خیریت تھی، مگر وہ تو اس کے علاوہ کچھ اور بھی تھے۔ وہ دشنامی ہند کے سب سے بڑے ڈھٹری بیوٹر تھے۔ تن و توش ہی میں نہیں دولت کی فراوانی کے اعتبار سے بھی وہ سب سے بڑے تھے۔ گھٹنوں میں رہتے تھے۔ سال میں چار بار بھی آتے تھے اور جب آتے تھے تو پروڈیوسر لوگ شہید کی نگلیوں کی طرح اُن سے چھٹ جاتے تھے۔ اس وقت بھی جب وہ اندر آئے تو دو چار مصاحبوں کو ساتھ لے آئے۔ ایک تو اُن میں سے جو ناما سا۔ وُجے قدا اور جی کی ہی آنکھوں والا آدمی تھا۔ وہ تو فوج چنڈ تھا۔ امرت سر کا ایک ایگزیکٹو تھے۔ امرتسر کا سب سے عمدہ سینا گھر اس کا تھا۔ دوسرا وہ جو کلمے رنگ کا، اونچے دانتوں والا، نہایت ہی سیاہ بالوں والا۔ جن پر اس نے بہت زیادہ تیل چھڑکھا تھا۔ وہ جو گھڑے تھا۔ چور گھڑے کے دو سینا تو احمد آباد میں تھے۔ کپ ناسک میں۔ اور ایک راج کوٹ میں تھا۔ چور گھڑے گجرات کا مشہور ایگزیکٹو تھے۔ چور گھڑے کے ساتھ ایک ڈبل پتلا دھوئی پہنے ہوئے مرداڑی تھا۔ بٹشہ نے اُسے مچپان لیا۔ یہ سیٹھ امر چند تھے جو پُر میں مَن کے تین بیٹے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کالی مچوں کا ہیرا پار بھی کرتے تھے۔ یہ بٹشا کو اس لئے

معلوم تھا کہ سیٹھ امر چند نے ایک دفعہ اس کے ساتھ دسکی پیتے ہوئے خود بتایا تھا کہ جب انہیں کالی مرجی کے بیوپار میں زیادہ فائدہ ہوتا ہے تو وہ اچھی کچریں حاصل کر کے اپنے سینا گروں میں چلاتے ہیں۔ اور جب نقصان ہوتا ہے یا کم فائدہ ہوتا ہے تو سٹنٹ یا دیوی دیوتاؤں کے قصوں دلی تصویریں حاصل کرتے ہیں۔ اگر آج وہ جوشی جی کی کچر لینے آئے ہیں تو اس کا مطلب ہے، بھٹانے سوچا کہ اُن کا کالی مرجیوں والا بیوپار اچھا چل رہا ہے۔ اور اگر وہ اکرم کی تصویرے کے جلاتے ہیں تو سمجھو کہ کالی مرجیوں کے بیوپار میں مسئلہ ہے۔ اس چھوٹے سے کہیں میں اتنی کرسیاں نہ تھیں کہ سب لوگ وہاں بیٹھ سکتے۔ گو سب لوگ اُٹھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ پہر بھی سیٹھ بھگت لال نے یہاں بیٹھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جیال بھائی بانڈرا کو لے کر ساتھ ملے کہیں میں چلے گئے۔ جو میڈم کا کہیں تھا۔ میڈم کے کہیں میں جلاتے ہی جیال بھائی کو میڈم کی یاد آئی۔ بولے ”میڈم کہاں ہیں؟“ سیٹھ بھگت لال نے مشکرا کے کہا ”وہ تو اپنی سہیلی راج لستہ کے ہاں گئیں ہیں۔ مجھ سے کہا۔ آپ انہیں وہاں ٹیلی فون کریں۔ اگر کوئی کام ہو۔“

جیال بھائی نے ہرچھا ”چیک؟“

”ابھی دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر سیٹھ بھگت لال نے چور گھرے کو اندر بلایا۔ ایک لمحہ جیال بھائی کی نظر دیکھا پھر چور گھرے کو لے کر ”ایک منٹ کے لئے معاف کرنا“ کہہ کر وہ چور گھرے کو لے کر سب سے اندر کے کہیں میں چلے گئے۔ جو میڈم کے کہیں سے ملحق تھا جس میں سیٹھ جیال بھائی خود بیٹھتے تھے۔

اندر جا کے بھگت لال نے چور گھرے سے کہا ”اسے بار مجھے یہاں آنے کو آیا۔ جیال بھائی اگر ایک ہزار روپیہ دینا ہے نقد، تم اُس رقم میں سے دے دو۔“

چور گھرے بولا ”جوشی جی کی تصویر پر دوں گا۔“

”اچھا۔ اچھا۔ بھگت لال بے مبری سے بولے۔“

چور گھرے پہلے ہی سے جیب میں ایک ہزار کی رقم لے کے آیا تھا۔ وہ یہ سب باتیں

موت کہہ رہے۔ رویہ آج کل "ہانکوا یا سیمو مونہ بنائے گئے" سلسلے بجکت لال نے ساٹھ ملٹ ہو
 دسے کے ہزار کی رسید لے لی ہے۔ یہ کوئی دھندے کا زمانہ ہے۔ اب میں ہزار روپیہ کہہ رہے ہوں
 کروں۔ اچھا۔ اے۔ تو بھی اس ہزار کی رسید پر دستخط کر دے گا۔
 جوشی جی نے چپکے سے رسید پر دستخط کر دئے۔

باہر کی گلیں میں آگے جوشی نے بیٹا کو آنکھ ماری۔ بھقا اور وہ دونوں چپکے سے کہیں سے کسک گئے۔ اُن کا
 خیال تھا کہ کسی کو معلوم نہیں ہے۔ کیا ہو رہا ہے۔ حالانکہ سب جانتے تھے۔ وہ جو رلی کھیل رہے تھے
 وہ سب سے زیادہ جانتے تھے۔ مگر کُپ تھے۔
 جوشی نے بیٹا کو پانسو روپے دے کر کہا "بس وہی شے نے دئے ہیں۔"
 "مگر؟"

جوشی نے بھقا کو آنکھ مار کے کہا "اگر کچھ نہیں۔ اب اسی میں کام چلا لے۔ ہزار کی رقم اسی میں پورا کرنا چاہیگی۔"
 "ایک ہزار کی رسید بھی مجھے چاہئے۔"

"بہت اچھا جناب لال۔ وہ دونوں گا۔ بھٹا نے سر ہٹا کے بڑی خوش اسلوبی سے کہا جیسے سب کام
 ٹھیک ہو گیا ہو۔ اس کے بعد اس نے گلیں کے اندر بیٹھے ہوئے بالو لال کو بلا کر اس کے ہاتھ میں ہاتھ د
 روپے دئے اور کہا "اگلے ساٹھ چار سو ملے ہیں۔ اس میں پچاس ہیں نے شوٹنگ کے لئے رکھ لئے ہیں
 باقی یہ چار سو روپے تم لوگوں میں بانٹ دو۔"

"انہیں چار سو میں سب کچھ۔ بالو لال نے سنی غرنگاہوں سے بھٹا چارویہ کی طرف دیکھ کر کہا
 "جی ہاں۔ یہی نہیں بلکہ ایک ہزار کی رسید بھی انہی سے بنے گی۔ لڑکیاں تو سب تمہاری بھانجیاں ہیں
 نا؟" بھٹا نے پوچھا "اُن سے زیادہ رقم کی رسید بھی حاصل کر سکو گے؟"

بالو لال نے اپنی جگہ سے جیسا وہ کھڑا تھا۔ بال میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں کی طرف نظر دوڑائی۔ بولا "نہیں۔"

کے حوا میں سب کو جانتا ہوں :

”رضیہ کس ٹھیک کروں گا : بھٹا چارینے مسکرا کر کہا۔

”تو پھر ٹھیک ہے :“ باولال بولا ”میں لوگوں کو موٹروں میں بٹھاتا ہوں :

چھڑکیاں تھیں۔ چھڑکتے۔ دو موٹروں میں ٹھونس ٹھانس کے کسی طرح بیٹھ گئے۔ لڑکیوں نے پہلے انہیں کہا : ہاں : ہاں : کی۔ کچھ دھڑکتے سے قہقہے لگائے۔ لیکن ”ہٹو“، ”چھوڑو“، ”مرگ بخت“ کے بعد سب سلسلے سے ٹھکانے پر لگ گئیں۔ بس ایک رضیہ تھی۔ جو سب سے الگ بیٹھی تھی۔ موٹر دائرے سے بچی۔ غلاداد سڑک پر پہنچی۔ تنگ برتنے پر پارک کے شواہجی پارک کی طرف مڑ گئی۔ تو پنجابی لڑکی نے جو جگہ نہ ہونے کی وجہ سے اور بھگت لال کی آغوش میں بیٹھی تھی۔ اس کے پیٹ میں انگلی چھو کر کہی ”اے بیٹھے۔ تیرے پیٹ میں کتنی براہ ہے :

سب لوگ ہنسنے لگے۔ رضیہ جل کے ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئی۔ چور گھڑے بابا راس پر گرا کر اڑتا تھا۔ اور وہ سمٹ کر الگ بولتی تھی۔ بیتال بھائی اس لڑکی کو گود میں لئے ہوئے تھے جو دس برس سے غلاماں شری میں کام کر رہی تھی۔ وہ بیتال بھائی کو خوب اچھی طرح جانتی تھی۔ واقعی اچھی طرح جانتی تھی بیتال بھائی اور دوسرے لوگ بھی دیکھ رہے تھے۔ کہ چور گھڑے کا سادہ کپڑا نہیں رہا ہے۔ گرد سب لگ غلاموں تھے پھر باندھ کی سمجھ گئی۔ سانا کروڑ کا شیشن گیا۔ جب موٹریں کالینا کی سڑک سے کبھی آگے پہنیں تو رضیہ نے چلو کے کہا اور کونسا ٹھوڈیو ہے : بھگت لال نے چور گھڑے کی طرف چور بٹھا بول سے دیکھا۔ چور گھڑے نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا : ”ایہ ٹھوڈیو تو کوئی نہیں ہے۔ بہار جیل ہے :

بہار جیل پر چم کیا کرنے جا رہے ہیں :

”وہیں تو ٹرائی ہوگی“ ایک لڑکی نے جس کے کہا۔

اور اس کی آواز مرد اور عورتوں کے بلند بانگ فہم ہوں میں ڈوب گئی۔

رفیہ نے کہا: گاڑی مدک دو۔

گاڑی چلتی رہی۔

رفیہ نے چلا کے کہا: گاڑی مدک دو۔ نہیں تو میں شور مچاؤں گی۔

بانکڑا نے غصے سے بابولال کی طرف دیکھا جو ایک ہاتھ سے گاڑی چلا رہا تھا، اور دوسرے ہاتھ سے

اپنی جیب میں چٹائی ہوئی لڑکی کی کمرٹول رہا تھا۔ بابولال نے اپنے شانے ہلا کے بانکڑا سے کہا: "سیٹھ

اسے بٹالایا تھا۔ کہا تھا میں مجھ کو اس سے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

بانکڑا نے بابولال سے کہا: "گاڑی مدک دو بابولال۔ بانی کو جانے دو۔ رفیہ بندی سے دردناک کر

کر اتر گئی۔ گاڑی آگے چل دی۔ ایک لڑکی غصے سے چلا کے بولی۔ بڑی شریف نادانی تھی ہے۔ دوسری

بولی نئی نئی آئی ہے۔ تلو۔ چارچہ ماویں جب جم کے خاتے لگیں گے پھر خد بخود ٹھیک ہو جائیں گی۔ سب

سننے لگے۔ گاڑیوں کی آواز رفیہ سے دُور ہوتی گئی۔ رفیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آج میرے گھر

میں پھر کچھ نہیں ہے۔ اسے اپنی بہن کے پانچ بچوں کا خیال آیا۔ تم کیوں مر گئیں میری بہن۔ اُس

مرحوم بہن کو بد دعا دی۔ تم کیوں مر گئے میرے شوہر! اس جوانی میں۔ اس نے اپنے مرحوم شوہر کو بد

دی۔ تم کیوں مر گئے میرے باپ۔ اُس نے اپنے مرحوم باپ کو بد دعا دی۔ اب کہاں سے پتے تھے

کنبد والوں کو ہاں۔ میرے پاس تو اس جسم کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور نالچ لگی میں نے شوقیہ کی سکول

میں یوں ہی سیکھ لیا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے۔ یہاں نالچ کا فن بیچنے سے پہلے جسم جینا ہر گا۔ میرے شوہر ج

باپ۔ میری بہن۔ میرے خدا۔ میرے کنبے والو۔ میرے خاندان والو۔ میری بولی بولی کاٹ کے

کھانے والو تم پر ہمت۔

جب وہ ایک درخت سے لگ کر غروب اپنی طرف سب کو گایاں لے پئی تو پھر اس نے اپنے آنسو روک لئے

اور اپنے آپ کو سمجھانے ہوئے اور کالینا کی طرف واپس چلتے ہوئے اپنے آپ سے دل ہی دل میں کہنے لگی۔ آج بھوک ہو تو کیا ہے۔ کام کم تھا ہے تو کیا ہے۔ کبھی کبھی تو لٹا ہے۔ اور عزت سے۔ ہے۔ اور جب بے عزتی سے لٹا ہے۔ تو تم نہیں لیتیں! تو اس میں مر جانے کی کون سی بات ہے۔ ایک دن دنیا دیکھے گی۔ مونا تباری قدر کرے گی۔ ایک دن تم اس سارے جہاں سے نکل جاؤ گی۔ بس کسی طرح پالا کی سے کسی کو پہلا پھسلا کے ایک ایک بڑا سا رول حاصل کرو، پھر سب ٹیک ہو جائے گا۔ ہاں۔ ہاں! میں یہی کروں گی۔ رفقہ اپنے دل کے اندر کی دوسری رفقہ کو سمجھانے لگی۔ میں اپنی محنت تھوڑے چھوڑے گی۔ ان سستی لوگوں کی طرح۔ مگر میں ذرا چالاکی اور ہوشیاری سے کام لے کے کسی ٹائمر کی گھڑ کو بناؤں گی۔ اور اس سے ایک بڑا سا رول لے سکے اُسے وعدہ بتا دوں گی۔ پھر جب یہ مشہور ہو جائے گی۔ پھر مجھے کون ہاتھ لگ سکے گا۔ رفقہ اپنی شطرنج کی چال پر خود ہی مسکراتے لگی۔ اور تیز رفتاری سے واپس چلتے لگی۔

اُدھر ہاکڑا سیٹھ کی گاڑی میدان میں کیڑا گئی۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد لاہور میٹرو کی
 جیکو فوجا ہت پر دو کوشش کے باہر کے ٹکی گاڑی میں سے میٹرو دو سڑکوں کو لے کے اُتری۔ راج لٹا
 اور ششاد۔ دونوں غم اندازی کی آواز دے کر سر دھنیں بھی جاتی تھیں۔ جو بھی وہ گاڑی سے اُتری
 تیر خوشیوں کے جھونکے تھوڑے ایرانی دستروں تک اُبلتے گئے اور راہ چلتے لوگ جو مسنون پرانی
 ڈبل سوئی کی باس۔ بیڑوں کے پرانے جہاز کی مشابہت اور دیں پھر گاڑی کی طرح اُلتی ہوئی دستروں کی خلیق پٹا
 کی کمانہ سے واقف تھے۔ یہ ایک ہزار روپے کے بے خوش روکدھر سے آئی تھی۔ مگر اس سے چیز کو وہ
 کچھ دیکھ سکتے۔ ریشمی لباسوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ میر تقی میر کے ساتھ فوجا ہت پر دو کوشش کے ان میں
 داخل ہو گئے۔ جہاں جوشی جی کے کہیں میں بہت کم اور بیٹا چاریر۔ دو ایس ایسے ہوئے جہازوں کی
 طرح بڑی بے دلی سے آتش کے پتے میں لپکتے ہوئے تھے۔ یہ ایک ہی تھے۔ یہ ایک ہی تھے۔ یہ ایک ہی تھے۔
 ریشمی تھی اور کم کے ہاتھ سے ہزار کاچک۔ اس نے زندگی کی آتش کا ہر پتہ چاہے نہ لگی ہو بلکہ ہوا میں
 اکرم اور بیٹل کے لئے ایک ہی حشرت رکھتا تھا اسی نے جب میٹرو راج لٹا اور ششاد کو لے کے اندر آئی تو اکرم
 جان بوجھ کے نہیں اُٹھا۔ اگر وہ لوگ اس کی بے غرائی کر سکتے ہیں تو وہ بھی اس کی بے غرائی کر سکتے ہیں۔

روپے والے اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔ مگر بٹنا کھڑا ہو گیا۔ میڈم نے کرسی پر سر جھکائے اپنے جام میں غرق اکرم کی طرف دیکھا۔ اور سمجھ گئی کہ کیا ماجرا ہے۔ اس بے چارے کو آج بھی ہزار کا چیک نہیں ملا۔ اس نے اکرم سے بات بھی نہیں کی۔ وہ بھٹسا سے مخاطب ہو کے بولی۔

”سیٹھ کہاں گئے ہیں؟“

”شوڈ لو!“ بھٹسا چارپے نے موڑ بانہ بھیجے میں کہا۔

”ہاں دو اس نئے شوڈ لو میں گھسنے ہیں۔ جو بہار جمیل کے کنارے تیار ہو رہا ہے۔“ اکرم نے دسکی کے پیکی طرف بڑبڑ غور سے دیکھ کر کہا۔ ”ساتھ میں چھ لڑکیاں بھی تھیں۔“

میڈم سب سمجھ گئی۔ مگر اس نے اپنے آپ پر قابو پایا۔ بھٹسا سے پوچھنے لگی۔ ”اور کون کون تھا؟“

بھٹسا نہ جانتی ہوئی آماد میں بولا ”لازمی لال تھے۔ خری چور گھر سے تھے۔ بالوالا تھے۔ بچن دت تھے۔“ اکرم نے غصے سے کہا۔ ”اور اپنے ڈائریکٹر خوشی جی کا نام کیوں نہیں لیتے ہو جن کے بغیر بار جمیل کا کوئی پروگرام ممکن نہیں ہو سکتا۔“

میڈم پھر اکرم سے کچھ نہیں بولی۔ اس نے اپنے ہونٹ چبائے اپنے فرائڈ کو گردن کے قریب سے ٹھیک کیا۔ یہ میڈم کی عادت تھی۔ جب اسے غصہ آتا۔ یا جب وہ کسی گہری سوچ میں ہوتی یا جب کبھی بزنس میں وہ کوئی نیا داؤں کیلئے کو ہوتی وہ اس غصے پہلے بالکل بے اختیار ہو کر بالکل غیر شعوری طور پر اپنی گردن کے قریب سے فرائڈ کو ٹھیک کرتی تھی۔ فرائڈ میں کوئی نقص ہوتا ہو۔ گردن کے قریب فرائڈ میں چاہے ایک بل یا ایک چٹ بھی نہ ہو۔ مگر میڈم اپنا فرائڈ ضرور ٹھیک کرے گی۔ یہ اعلان ہوتا تھا کہ میڈم کو غصہ آیا ہے یا سنبھل کے شیو نیا داؤں آیا ہے۔

مگر میڈم نے اس وقت کچھ نہ کہا۔ اس نے اپنے پتلے باریک سُرخ ہونٹ ایک دوسرے کے نیچے زور سے دبائے اور غصے کو چھٹی ہوئی راج نا اور عشاد کو لے کر اپنی کہن میں علی گئی کیوں کہ

اسے اپنی اگلی دونوں کچھروں کے لئے راج لا اور شاد سے فیصلہ کرنا تھا۔ اُن کے اندر چلے جانے کے بعد اکرم نے ایک گھونٹ بہت آہستہ آہستہ سے پیا۔ جیسے شراب کی تلخی ہر قطرے میں سے کشید ہو کے منظر اور مصفا ہو کے اس کی زبان پہ آ رہی ہو۔

واہ واہ! کیا تلخی ہے! میڈم کے موڈ کی طرح اس وقت اس میں کتنا غصہ ہے۔ جیسے یہ وہی اپنے دانتوں سے میری زبان کو کاٹ رہی ہو۔

بھٹا چار یہ چپ تھا وہ ابھی اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھا۔ اس نے اپنے سے بڑوں کے سامنے شراب بھی نہیں پی سکتا تھا۔

اپنے سے بڑوں سے بیمار جھیل پر دو عشرت بھی نہ دے سکتا تھا۔ کوئی کیسی ہی غلط بات کیوں نہ کہہ دے اس کا فرض تھا کہ وہ ہر ایک کی ہاں میں ہاں ملائے اسسٹنٹ کا بھلا اور کام بھی کیا ہوتا ہے۔ یوں کہنے اور کرنے کو تو کام بہت سے ہیں۔ لیکن اگر اسسٹنٹ ڈائریکٹر یہ کام نہیں کر سکتا تو کچر بھو رو کسی کام کا نہیں۔

”بھٹا! اکرم نے اپنی آنکھیں بھٹا چار یہ کی عینک پر جلتے ہوئے کہا
 ”یہ جو سُرخ و سپید عورت اس کہیں کے اندر گئی ہے۔ جس کے بال سنبلے ہیں۔ جس کی دو ٹوٹیاں ہیں
 جو ہمیشہ تنگ فراک پہنتی ہے۔ جس کے ہاتھ میں میرے کی دو انگوٹھیاں چمک رہی ہیں۔ یہ مساری
 میڈم ہے۔“

بھٹا نے کہا ”میں جانتا ہوں۔“

”تم شک نہیں جانتے۔ کچر نہیں جانتے۔“ اکرم نے اسکا ریں نید سے سر جھک کے کہا ”یہ بیماری میڈم
 ہے۔ اس کا نام میں نہیں جانتا۔ مگر برسوں سے لوگ اسے میڈم کہتے ہیں۔ اس نے ہم بھی اگر اسے میڈم
 کہیں تو کیا ہرج ہے۔ یہ میڈم جو ہے نا۔ اصل میں اس فلم کمپنی کی ہی مالک ہے۔ اس دفتر کی

پرو پرائیڈ ہے۔ اس کی باگھی خوب مسودتی پر نہ بلاؤ۔ اوپر سے یہ جتنی نرم دکھائی دیتی ہے۔ اندر سے اتنی ہی سخت ہے۔ اس نے سپر سوتیوں کے سے واسوں کی چٹکتی ہوئی سکراہٹ میرے کی کئی کی مسرت سجت ہے۔ اس سکراہٹ کو آج تک کوئی نہیں کاٹ سکا بڑے بڑے بلند بانگ لہجے والے جالاک پنجابی۔ سنڈی مگر نوجو۔ گراتی پاکٹ مار اور مارواڑی غانوں غپ آئے مگر غور و کث کر چلے گئے۔ دراصل اس سکراہٹ میں میڈم کا کوئی تصور نہیں کبھی یہ سکراہٹ برنی منسوق تھی۔ نرم تھی۔ بھولی بھالی تھی کبھی اس میں پھول کی پتیوں کی سی نرمی اور بیار کی کوئٹلوں کی سی تازگی تھی مگر آہستہ آہستہ یہ سکراہٹ سخت ہوتی گئی جس میں مزید بڑے ان باپ مرگے پھر اس کے چیلے ٹسے دھر کر پٹا۔ اس کی سکراہٹ نے اوپر سے نرم رہنا اور اندر سے سخت ہو جانا سیکھ لیا۔ اور جس روز اس کے چیلے اسے چھ سو روپے میں ایک سکراہٹ خریدے تاہم فروخت کر دیا اس روز اس کی سکراہٹ کے اوپر آنسوؤں کے لہرے پڑ گئے تھے لیکن اندر سے یہ سکراہٹ بوجے کی طرح سخت ہوتی گئی۔ پھر جب وہ سکراہٹ اور دوسری عیاشی میں اس سے اپنی رقم وصول کر چکا تو اس نے اسے بچی کے ایک ٹپے بانے پاس آٹھ سو میں فروخت کر دیا۔ تو۔۔۔ تو اس سکراہٹ میں میرے کی کئی انگی بجتے پر بھنا:

تجی! بٹھا بڑی نرمی سے اور آہستہ سے بولا: "کون کبھی میں میڈم نہ سن لے گا"

"اب اس سکراہٹ کو کوئی نہیں کاٹ سکتا۔" اکرم نے اپنے دونوں ہاتھوں سے انکار میں مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی طرف جھٹک کر کہا: "اپنی چھوٹی سی زندگی میں میڈم نے نہ کر نہیں سکا اگر مٹا سیکو نیلے۔ اسے جلد معلوم ہو گیا۔ کہ کسی میں نرم دل خوردقوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے خصوصاً ایسی خوردقوں کے لئے جن کا کوئی ٹکڑہ نہ ہو۔ میڈم کا کوئی ٹکڑہ نہیں ہے۔" اکرم نے نور نور سے چلا کر کہا: "تم کیا جانتے ہو بھٹا۔ مگر کیا کائنات سے ہوتا ہے۔ کروں سے۔ نیلی فوں سے۔ ریلو گرام اور ریلو گرام سے ہوتا ہے۔ مگر کیا غلوں، گبنوں، روشنی کے شعروں اور مٹی کی پلیٹوں سے ہوتا ہے۔ یہ سب چیزیں آپ

کو ایک ہی بازار میں مل سکتی ہیں۔ مگر گھر اور بازار میں فرق ہے بھائی !

بھائی نے کہا - آجستہ ہوئے۔ میڈم کہیں سن لیں گی :-

”شس لے۔ میں اسے سنانا چاہتا ہوں۔ ساری دنیا کو بتانا چاہتا ہوں۔ کہ میڈم کا کوئی گھر نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے کبھی کوئی گھر نہیں بنایا۔ کیونکہ گھر بنانے کا حق اُس سے شروع میں ہی سے چھین دیا گیا تھا اب رو کیا کرے۔ میڈم۔ میڈم بڑی چالاک ہے۔ اس نے سوچا اگر وہ ایک گھر نہیں بنا سکتی تو ایک آفس تو بنا سکتی ہے۔ اُس نے سوچا۔ کیا ہوا۔ اگر اس کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ اس کی پاس پیسے جیسے تخت۔ لیکن تاپاں اور درخشاں سکراہٹ تو ہے۔ پیسے کی کئی تو فراد کو بھی کاٹ سکتی ہے دھما کا دل کیا چیز ہے۔ اس نے تو میڈم نے اس قسم کو ایک تھیٹر کی طرح استعمال کر کے دھیرے دھیرے اُس کے بڑھتا شروع کیا۔ آں۔ مگر اس کا دعویٰ نہ ہو۔ شروع شروع میں اُسے اکامیاں بھی ہوئیں اُس کے بڑھنا کوئی غلامی کا کھیل نہیں ہے۔ مگر میڈم نے سب کو کاٹ کے پینک دیا۔ اور آخر میں بیٹھ باکڑیا سے محبت کرنے میں کامیاب ہو گئی :-

”محبت کرانا کیا ہوتا ہے۔“ بقا کو فرادوں چپی محسوس ہوئی کیوں کہ اُسے اپنی رضیہ یاد آ رہی تھی۔

اکرم خود ہنسا۔ بولا :- ”ہنسو نہیں۔ محبت کرانے پر ہنسو نہیں۔ اس میں کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ آدمی مگر خود کسی سے محبت نہ کرے۔ بلکہ اپنی چالاکاکی سے اپنے سے محبت کرنے پر مجبور کرے تو اسے محبت کرانا نہیں تو اور کیا کہیں گے۔ بیٹھ باکڑیا کا خیال تھا کہ انہوں نے خود میڈم سے محبت کی ہے۔ حالانکہ بیٹھ باکڑیا جانتی تھی کہ کس جتن سے اس نے باکڑیا سے محبت کرائی تھی۔ اس پورے معاملے میں وہ بالکل ٹھنڈی رہی۔ اور ہرے آگ۔۔۔۔۔ اندر سے ہرقت۔۔۔۔۔ ایک روز بیٹھ باکڑیا نے گھٹے ٹیک ڈنٹے اور پیر فرمائی :-

”اور آخر تین سٹوڈنٹ۔ کالینا کا مکان۔ بہت بڑا باغ۔ باغ سے پرے جے ٹیڈ پچھلوں میں لیلہ کی رہیں سب میڈم کے جتنے میں آئی۔ اور وہ جہاں ہوں کی رہنے والی تھی اور شکار اور کھس پختی حتیٰ اب موجود تھی

پہننے لگی اور وقت بے وقت انگریزی بولنے پر اصرار کرنے لگی۔

”دیکھو بھلا میڈم سے سنی سیکھو۔ میڈم خود اس قدر خوبصورت ہے کہ چاہے تو آج میری بن سکتی ہے مگر میڈم کو میری بننے کا شوق نہیں ہے۔ اُسے موت، ویسا کٹھا کٹے کا شوق ہے۔ اپنی چوٹی سی عمر ہی بیٹھا۔ لاکھوں ویسا کٹھا کر لیا ہے۔ رچے بچے کے معاملے میں میڈم بہت محتاط ہے اور کیوں نہ ہو وہ میری طرح چند ہیں۔ جس نے دس لاکھ روپے بے کار ملک اور عوام کی خدمت کرنے والی تصویروں میں گڑویا۔ کون جانتا ہے ملک اور قوم کی خدمت کرنے والی تصویروں کو دیکھنا، نعمت ہے میری عقل پر میڈم بہت بھروسہ دار ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ زندگی نے خود مجھے مار کر اُسے بھجا دیا ہے۔ وہ وقت وہ کیسے بھول سکتی ہے۔ جب اُسے ایک بار اور دو بار نہیں بلکہ سہ بار اور چار بار روپوں کے عوض بیچا گیا۔ پھر وہ چیز جو اس کی شخصیت سے اس کی ذات سے اُس کے فن سے۔ اس کی عصمت سے اس کے باپ اور خاندان والوں کے پیار سے اُس کے پیچھے اور آخری معاشقے سے زیادہ قیمتی ہو۔ وہ کیوں لئے حرز جاں نہ لے۔ وہ کیوں اس روپے کی ایک ایک پائی کو اپنے سینے سے نہ لگا کے رکھے۔ میڈم کی نفی دراصل ایک طرح اس کی مداخلت ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ وہ دن واپس آئیں جب کوئی اُسے ترازو میں تول لے۔ جیسے وہ پروڈیوسر اور فنانسر لوگ آج بے ترازو میں تول لے ہیں۔ ناکام پچھروں کا ڈاکٹر وہ نہیں چاہتی کہ اب پھر کوئی اس کی طوٹ اس منگاہ سے دیکھے جیسے قصاب کسی بھی موٹی تازی بکری کی کٹڑ دیکھ کے اندازہ لگاتا ہے کہ اس میں سے کتنا گوشت بچھے گا جیسے یہ لوگ میری طوٹ دیکھ کے اندازہ لگاتے ہیں کہ اب اس کی عقل کی تہی پر کتنا گوشت باقی رہ گیا ہے۔ اور کیا اب یہ کامیاب پکڑ سکے گا نہیں اس لئے تو آج بالکل زلنے جڑی جی کوچیک دے دیا۔ اس لئے تو میڈم اب خود اندازے لگاتی ہے۔ خود تولی ہے۔ اور پھر طرزی احتیاط سے چیک لگتی ہے۔ جیسی تو لوگ کہتے ہیں کہ میڈم کی نگاہوں میں اس کے جسم میں میرے تکی کئی کی کاٹھ ہے۔ اور کوئی اُسے دھکا نہیں دے سکتا۔ اور کوئی اس کے

جذبات سے نہیں کھیل سکتا۔ گراس میں بھی میڈم کا کوئی تصور نہیں۔ "اکرم ذرا جگ گیا۔ اوپر دیکھنے لگا ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھیں خوابیدہ سی ہو گئیں۔ ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے پر ایک عجیب فزی سی آگئی۔ اور وہ دھیرے دھیرے کہنے لگا۔۔۔ "بھئی میڈم کے پاس بھی خواب تھے۔ خوابوں میں کتنے ملکہ بھلی تھے۔ ترم دجیا کی طرح مٹنے والے جذبات تھے۔ مگر زندگی نے آہستہ آہستہ پیٹ پیٹ کر اس کے سارے جذبات کا پانی نکال دیا۔ اب میڈم کی روح ایک کلائے ہوئے چڑے کا ٹکڑا ہے جس کے اندہ پانی کی ایک بوند بھی نہیں کہیں سے بگ، دواؤ، آنسوؤں کا ایک قطروہ نہ ٹپکے گا۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے۔ بھٹا۔ کہ ایک عورت۔ ایک خوب صورت عورت کی آنکھ کا پانی مرجائے!۔۔۔۔۔ مگر کس کے لئے ٹریجڈی ہے؟ سہلج کا پڑا بیچہ دالوں کے لئے تو نہیں ہے؟"

میڈم نے بیکام انداز کے کہا "کیا بات ہو رہی ہے؟"

"آپ کے کردار پر اس بے چارے کو لکچر دے رہا تھا میڈم! اکرم نے دسکی کا آخری قطروہ اپنے حلق میں اُتار کے صلاصس نکالی کر دیا۔

"اور سوجے؟" میڈم بغیر کسی قسم کے ہولی۔

"نہیں۔ اکرم نے فیصلہ کن لمحے میں کہا۔

میڈم نے بھٹا سے کہا "انہیں مگر چھوڑ آؤ میری جگہ لے جاؤ۔" اور آپ۔" بھٹا پارہے پر چھا۔

"نیں ششاد کی نلکن میں چلی جاؤں گی۔"

اکرم نے کہا "یہ کہیں نہیں جائیں گی۔ رات بھر یہیں بیٹھ کر کرا دیں گی۔ جب تک اُن کے سینٹر نہیں آتے

.... ڈم فو.... ڈم فو.... بہت عمدہ نام ہے۔ میڈم.... جوشی جی کے بچہ کا نام ہے۔ اب میں بھی

ایسی ہی بچہ پڑاؤں گا۔"

"حرام زادو، حرام زادو۔ کیسا نام رہے گا یہ میڈم...."

نیلیم نے بٹھا کر اشارہ کیا۔ بٹھا اکرم کو دونوں کندھوں سے پکڑ کے کہیں کے باہر لے گیا۔
 باہر جاتے جاتے اکرم اپنی آنکھوں پر گنتے گنتے کہنے لگا۔ باکڑیا۔ باکڑیا۔ باکڑیا۔ باکڑیا۔ جھاکڑیا۔ آکڑیا
 کما پڑیا۔ سلا کیسا نام ہے؟ دنیا کی کسی زبان میں اس کا قافیہ نہیں ملتا !

میڈم اس لئے باہر نہیں آئی تھی کہ وہ اکرم کا تجزیہ سننے کے لئے بے قرار تھی یا لےکرم سے کسی طرح کی جھڑپ تھی۔ دراصل اپنے کہیں کے اندر وہ جو معاملہ ان دو ہیروئنوں سے طے کر رہی تھی۔ اس میں ایک اڑچن آپڑی تھی۔ وہ دونوں ہیروئنیں اس کی اگلی پچھ میں کام کر رہی تھیں وہ جانتی تو دونوں کو الگ بلالکے معاملہ کر سکتی تھی۔ مگر چونکہ دونوں کا کام ایک ہی تصویر میں تھا۔ اکٹھا تھا۔ اور وہ دونوں سپیلیاں تھیں۔ اول درجے میں شمار ہوتی تھیں۔ اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ معاملے کی رقم ایک دوسرے سے چھپی رہیں۔ اگر وہ ایک کو زیادہ اور دوسرے کو کم پورا مافی کر لیتی۔ تو ایک نہ ایک دن یہ بھید کھل جاتا۔ اور پھر کم رقم لینے والی ہیروئن پچھ کے بیچ ہی میں وہ فساد شروع کرتی.... نہیں.... نہیں.... میڈم نے کچھ سوچ کے ہی دونوں کو اکٹھے بلالکے دونوں سے ایک ہی وقت میں فیصلہ کرنے کا اقدام کیا تھا۔ اب نصیب یہ آچڑی تھی کہ دونوں ہیروئنیں پچاس پچاس ہزار سے کم لینے پر تیار نہ تھیں۔ اور یہ رقم میڈم کے بجٹ میں نہ آتی تھی۔ اس لئے میڈم اٹھ کے اپنی کہیں سے جوشی بی کے کہیں میں آگئی تھی۔

اکرم کے جانے کے بعد ہی میڈم کچھ دیر اس خالی کہیں میں کھڑی سوچتی رہی۔ پہلے تو اس کی بھوئیں گھٹنی

ہر ایک دوسرے سے قریب ہو گئے۔ پھر اُٹھ ہو گئے۔ مطلق صاف ہو گیا۔ میڈم مسکرائی اُس نے
گروں کے قریب اپنے فزک کو ایک جھکا دیا۔ جوشی جی کے نیزے تاش اُٹھائی۔ وہ اپنی کہیں میں ہٹی
گئی۔ میڈم نے شکار لایا تھا۔

میڈم نے فزک جاکر کاش کے پتے نیز پر پیک لکھا "میں ایک ڈوئیز تاش کا بوجھ
شریکہ سی کہ اگر میں جیت جاؤں تو تم دونوں کو سی بچر میں ایک ہر دو دیر بعد پر کام کرنا پڑے گا۔
اور اگر تم دونوں میں سے کوئی جیت جائے۔ تو میں تم دونوں کو ایک ایک بچر ہر دو دیر میں ہر
دو دیر ہی دونوں کی۔ ملے؟

"ملے؟ راج نے شکار کے بچے لے کر کہا۔

"ملے؟ شکار نے بھی کہا۔

راج نے اُٹھا جوشی جی کی بچر ہے ایک سونے سے کم میں بچر نہیں بناتے۔ بس ایک
سروں میں پچاس ہی تو اپنے بھیس لگے گی۔ اور اگر نہ ملے۔ تو وہ بزرگ جاتی ہے۔ وہ کیا
دو شاٹ سے زیادہ نہیں چرکتے۔ اور میڈم نے سچا۔ میری تو تم جو کس خیال میں تھو
کا کہ بھیس دونوں میں ختم کر کے نہ کہ دونوں تو براہ میڈم نہیں۔ پچاس کے بھیس میں گے۔ میڈم نے
تاش سیٹی شکار لے کر کہا۔ میڈم نے تو میں جیتے ہر ایک کو پیسے پتے اُٹھاتے وقت راج اُٹھا
نے تین کو چم لیا۔ شکار جلد میں تینوں کو چم ماحول گئی تھی اس نے اب دو بچے کہہ کے
مسکرائی اس کے تینوں میں غلام سمجھ اُٹھ گئی۔ راج کے تینوں میں وہ شکار تھے۔ پیسے شکار
نے جیسی سچا پتے تھے کھول کے سامنے رکھ دیے۔ پھر راج نے۔

ابھی تک میڈم نے اپنا پتہ نہ کھولے تھے۔ راج نے دونوں ہاتھوں سے کلی بکا کے کہا۔ ہر گز

میڈم۔ تم ہار گئیں۔ لاؤ پچاس ہزار کا کنٹریکٹ بناؤ۔ میڈم نے درمیں میز پر رکھے ہوئے پتوں کو باری باری سیدھا کیا۔

پہلا جو کر تھا!

دوسرا کیٹہ!!

تیسرا بھی کیٹہ!!!

”ہائے!“ ایک دم راج اور شمشاد دونوں کے منہ سے نکلا۔ حالانکہ ایک صبح بنارس تھی۔ دوسری شام اردن۔ مگر ہائے دونوں میں تھی۔ ہائے کے بغیر کوئی عورت تختل نہیں ہوتی۔

میڈم نے کہا۔ ”چلو۔ ایک ہزار دوسیر روز میں۔ ٹھیک ہے؟“

ابھی تک راج اور شمشاد اُداس تھیں۔ دونوں کچھ نہیں بولیں۔ میڈم اپنی جگہ سے اٹھی اپنے پرے کو کھول کر اس نے چابیوں کا گھما ہکا لا۔ چابی لٹکا کر سیف کھولا۔ دو ہزار کے نوٹ بکھلے۔ اور دونوں کو ایک ایک ہزار دسے کے بولی۔

”اچھا ٹھیک ہے؟“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ اب کی دونوں نے سر ہلکے کہا۔

اس کے بعد راج بولی شمشاد سے ”چل تاج چلے گی؟“

”چلوں گی؟“

”اور آپ میڈم؟“

”تم جاؤ“ میڈم نے کہا۔ میں میڈم کا انتظار کروں گی۔

میڈم کی آواز نہیں لگی سی ٹھکن تھی۔ لگی سی اُداسی۔ جیسے کسی نے ذرا سی راکھ کر دی تھی۔ اور اس کے نیچے ذرا سی چنگاری اور اس کی سُرخ زبان دیکھتی ہوئی، تڑپتی ہوئی دیکھ لی تھی۔

راج نے اپنا پنلا ہونٹ ذرا سانچے دکھایا۔ اور اپنی آنکھوں کو بڑے معصوم انداز میں میڈم سے شمشاد کی طرف گھما کر اپنی آنکھوں کو اس طرح غپایا جیسے وہ اپنے دام سے نہیں اپنی آنکھوں سے سوچ رہا ہو۔ اور یہ واقعی سچ تھا۔ وہ جب بات کرتی تھی تو اس کا چہرہ اس قدر بھولا اور معصوم معلوم ہوتا تھا۔ اور آنکھیاں اس طرح جلدی جلدی حرکت کرتی تھیں۔ جیسے وہ واقعی مرنے اپنی آنکھوں سے سوچنا جانتی ہو۔ اس وقت بھی اس نے یہی حرکت کی۔ آہستہ آہستہ بولی۔ ”میڈم تو . . . اپنے۔ . . شمشاد کا انتظار کریں گی۔ ہم کس کا انتظار کریں؟ چلو ہنسنا آج میں . . .“

راج نے شمشاد کا ہانوا اپنے بازو میں ڈال لیا۔ اور لیکن میں بیٹھ کر تاج میں چلی گئی۔

”کھانا کھاؤ گی؟ شمشاد نے پوچھا۔

”اوں ہوں؟“ راج نے جواب دیا۔

”شماج دیکھو گی؟“

”اوں ہوں؟“ راج نے جواب دیا۔

”پھر؟“ ————— ”شمشاد نے دھیرے سے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

”اوں ہوں؟“ راج نے اسی بلند لہجے میں کہا۔

”پھر؟“ شمشاد نے یہی انہوں کے پوچھا۔

”پھر ہمارا سر؟“ راج شمشاد کے گلے میں باہیں ڈال کے بولی ”ہائے شمشاد۔ تو کس قدر خوب صورت

ہے۔ جی چاہتا ہے۔ تجھ سے شادی کروں؟“

”شادی کر کے کیا کرے گی؟“ شمشاد نے پوچھا۔

”اسی لئے تو کرتی نہیں؟“

”اتھا بول راجو۔ کیا ہے گی؟“ شمشاد نے پوچھا۔

”ٹما ٹو جوس“

”ٹما ٹو جوس؟“ ششاور نے حیرت سے پوچھا۔ ”تو یہاں ٹما ٹو جوس پیئے آئی تھی؟“

”اور کیا؟“ راج نے ایک میرے کو آواز دی۔ اور اس سے ٹما ٹو جوس لانے کو کہا۔ اور جب ہوا دونوں ٹما ٹو جوس پی چکیں تو راج نے۔ دو روپے کے بل کے اور پر سو روپے کا نوٹ رکھ دیا۔ اور جب بیرو اٹھانے دوپٹے کے آیا تو راج نے بڑے بھورے لہجے سے کہا ”KEEP THE CHANGE“ ”بیرو چکر گیا۔ بولا ”حضور..... یہ اٹھانے دوپٹے؟“

”رکھو“ راج اُٹھتے ہوئے بولی۔ ”پل ہینا؟“

اور وہ ششاور کو لے کر تاج سے باہر چلی گئی۔ بیرو حیرت سے راج کی لڑت دیکھتا رہ گیا۔ اسے میں ایک اور بیرو پہلے میرے کے قریب آگے کھڑا ہو گیا۔ ”کیا ہوا؟“ پہلے میرے نے زیر لب سنی ہی بھاگے کہا ”میاؤں میاؤں۔ فیش فیش!“

فکں میں بیرو کر ششاور سوچنے لگی۔ راج بھو پر رعب کا منتھی ہے۔ اس کے پاس تو بچہ کا کڑکٹا ہیں۔ اور میرے پاس آٹھ ہیں۔ میں اس کو دکھا دوں گی۔ میں اگلی دفعہ سارے کے تاج میں آؤں گی اور عزت سو ڈیڑھوں گی۔ اور بیرو کو دو سو روپے بخشش میں دے دوں گی۔ بیرو جب میرے پاس بلے کر آئے گا۔ میں اس پر سو روپے کے دوہرے نوٹ ڈال کے کہوں گی! KEEP THE CHANGE یہ راج کیا اپنے آپ کو مجھ سے بڑی میر دن بھتی ہے۔ اور نہ مکالے تو ٹھیک سے بول نہیں سکتی فیصل دیں کو بکھن دیں کہہ رہی تھی اس روز شوٹنگ میں۔ اور یہاں تاج میں آگے دن کی بھتی ہے KEEP THE CHANGE ششاور ماندری اندھے سے کہیں گئی۔

پھر ششاور نے مسکرا کر اپنا سر راج کے کندھے پر رکھ دیا۔ اور بولی۔ ”ہائے تو کتنی — میری کتنی اچھی سہیلی ہے راج۔ تیرے بالوں سے کتنی اچھی خوشبو آ رہی ہے جی چاہتا ہے تیرے کندھے سے لگی لگی

سو جاؤں؟

”سونا اپنے گھر جا کر نہیں تو وہ تیری دادی اماں چلائے گی۔ بولے گی۔ جلتے یہ راج میری شہزادیوں
سٹنڈے کے پاس لے گئی؟“

ششادہ بنی! اُسے سٹنڈے کا قتل عمدہ معلوم ہوا جیسے مضبوط مضبوط باہیں اور
خدا دل کو چھڑتی ہوئی مٹھیں۔ وہی کیا یہ سچ ہے؟ تیری دادی اماں ہر ایک پروڈیوسر سے کہتی ہے۔
میری شہزادی۔ میری شہزادی۔ توجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ راج گک ویسی کی ویسی ہے۔ کیا یہ سچ ہے بتا! راج
نے پٹ کے شہزاد کو چیلنج کرتے ہوئے بولی۔ جواب میں شہزاد نے راج کے گدگدی کی اور دونوں ہیلیاں
فاتحانہ کی طرح ایک دوسرے سے پیار کرنے لگیں۔

امیر علی ڈراموں کے حرم میں ایک عیب سی مجر جھری سی آئی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر سے
جیسے جیسے گزر رہے تھے۔ وہ ایک لمبا ترنگا تنو مند ٹھکانا تھا۔ اُسے عورتوں کا یہ پیار پسند
نہیں آیا تھا اس نے بڑی شکل سے اپنے جذبات پر قابو پا کے کہا: ”بائی کہہ رہی ہوں؟“
”مگر“ ششادہ نے جواب دیا۔

ششادہ وارڈن روڈ پر رہتی تھی۔ مگر جب وارڈن روڈ کے گھر میں ششادہ نے دادی اماں کے کمرے میں
روشنی دیکھی تو راج سے کہنے لگی ”دادی اماں جاگ رہی ہیں۔ ابھی نہیں جاؤں گی؟“
”پھر کہاں جے گی؟“

ششادہ نے امیر علی سے کہا: ”امیر علی کا ڈی بیٹنگ مگر وارڈن کی طرف گھمے؟“

ہنگامہ گھنٹوں کے سامنے دل آرام، ستوریں تھا، سر سبز اور باغیچہ، دلی خوشی
 وہاں تیسری منزل کے کچلے فرش پر پڑی گئیں۔ انہوں نے پرے سے کہا کہ ایک چوٹی ہی تیرے صبر کریں
 وہاں کے جگمگے کے قریب سر لائیں۔ یہاں سے پکی کا شہر چاند چلتا پھیلتا تھا۔ چاند چلتا
 پھیلتا ہوا دھندلیاں اور آسمان پر چاند چلتا پھیلتا ہوئے ستارے۔ اور سب سے زیادہ اچھا
 میں تکی تکی دھندلیوں کے قوس کسی دھندلیوں کے گنگن کی طرح جھلکتی ہوئی اور تکیسے کے تھلے کی گنگن
 ٹکرانے والی چڑیا کی گنگن اپنے محبوب کو جوری تھی وہ پہلے کے ہر سانس میں بات کی رات کی خوشی پر
 حسی اور چرائی کی ریت پر ایک گوانی مندر کی چلتا منہ کے گیتا ریخا رہا تھا۔

اس خوب صورت شہر کے اوپر کچلے خوب صورت آسمان اور دھندلیوں کی جگمگاتوں سے تھی
 و ستارے ہی ستارے کو دیکھ کر کہا کہ یاد نہیں آتا۔۔۔۔۔ یہ کائنات!۔۔۔۔۔ یہ منہاں کے ہاتھوں
 کی بات کی تاک کی خوب صورتی میں کا یہ شہر کہ اس نے سگر شہر ہے۔ وہ کھڑی جگمگاتوں میں
 بہتی تھی۔ رات کی وہ پہلی جگمگات۔ جواب کتنی دور رہ گئی تھی۔ وہ ابلی کے جب طبع پہلی دھندلی طرح
 دھڑکتا تھا۔۔۔۔۔ وہ کجا جب شہر پہلی بار سکون گئی تھی کتنی ہی تاک سی پیاری باتیں عرفیت کا
 تھوس لے۔ طلوس ایک عجیب سی پاکیزگی ایک عجیب سی خفگی کے احساس کو چھانے والی تھی
 ایسے لوگوں میں یاد آتی ہیں۔

شہر نے کہ تو میرے اپنی ٹھوڑی رنگ پر چھادی۔

میں نے کہا کہ تو رہا ہے؟ رات نے پوچھا۔

”نہیں میں شہر! شہر آباد رہے کے بولی۔۔۔۔۔ تو نہیں؟“

”اے میرا ایل اوڈی رات کا باطل بے قرار ہو کر شہر کے کدو سے لگ گئی شہر کے کدو میں ٹوٹ

اور رات کا کدو میں ڈھپنہ تھا۔ وہاں ہانڈی کے کدو تھے۔ یہ وہاں بندہ سناں ہو کر نہیں گئی

ابنِ حشر تک کوئی مکان اس کا نہیں تھا کہ کوئی انہیں اپنی دُڈ بٹکے انہیں جس میں سٹوارٹ یا لین لاڈ کے ساتھ کام دے سکے۔ اس لئے بادل ناخواستہ ان دونوں نے اپنے اپنے محبوب کی تصویر اپنے ڈسٹنگ ٹیبل پر رکھ لی تھیں یہ بات نہیں تھی کہ ہندوستان میں خوب صورت مردوں کی کمی تھی۔ مگر ہندوستان کی چوٹی اداکارہ اگر ہائی وڈ کے چوٹی کے اداکار سے محبت نہ کرنے تو کس سے کرے۔ ذرا اس سے کم سچہ کے محبت کرنا کچھ گھنیا سا معلوم ہوتا ہے۔

ادب تو اولین لاڈ کی ایک عرصے سے شہر میں کوئی تصویر بھی نہیں آئی تاج تقریباً دو کرہلی۔ شمشاد نے پھر اک آد بھری۔ یہ آہ۔ جو صاف اور صریحاً کہہ رہی تھی۔ تمہارا لین لاڈ جلے بھاڑ میں مجھے تو اس وقت اپنا پیارا تھی یا دارا ہے۔
 ہرے نے اُسے پوچھا "حضور کیا پسں گی؟"
 راج ہوتی "اُٹھ بہنا۔ یہاں نہیں کوئی مجھے نہیں دے گا۔ پھر وہ میرے سے مخاطب ہو کے بولی۔
 "ہم اپنا غم پسں گے۔"

بیرہ چران رہ گیا۔ راج کا شمشاد کو لے کے ٹیڑھیوں سے نیچے اتر گئی۔ اُترتے اُترتے اُسے خیال آیا۔ اس نے کتنا عمدہ فقرہ کہا تھا۔ وہ خود ہی اپنے خیال کی غفلت سے مرعوب ہو گئی کتنی بڑی بات ہم اپنا غم پسں گے۔ فلسفے میں ڈوبی ہوئی بات! ہائے میں نے کتنی اچھی بات کہہ دی۔ پھر اسی نے فیصلہ کیا۔ کل جب وہ سنت گمن گمن گھنیشور کے سیٹ پر شوٹنگ کرنے جلے گی۔ تو نشی جبر و س جبر ناوی کا لڑنوس کو ضرور فقرہ بتائے گی مگر اس سے اصرار کرے گی کہ وہ یہ فقرہ ضرور اس کے کسی ڈائلاگ میں ڈال دے۔ راج کا ادب اور شاعری کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتی تھی۔ چنانچہ اس نے نشی بھاگیرام جبر و س کے سامنے نادل اور ہنزاد کھنوی کے سارے دیوان پڑھ ڈالنے تھے اب جب کہ دوسری بیرونیس بڑی شکل سے مرعہ کھانے کا مینو پڑھ سکتی تھیں۔

روٹے ہوئے ششاد نے بڑے اُداس لہجے میں کہا: راج! نہاری بھی کوئی زندگی ہے یوں
 دیکھو تو سب کچھ ہے۔ غلیٹ، گاڑی، شہرت، دولت، مگر یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے جتنی کے بغیر
 سب سونا مسلم ہوتا ہے۔

”نہایتی ہے تو اراج آہستہ سے بولی: اسے میرا لاڈ.....“
 ششاد کچھ دیر خاموش رہی، کچھ دیر گاڑی خاموشی سے وارڈن روڈ کی طرف متنی رہی۔ پھر ایک ندر کی
 آہ بھر کے ششاد نے کہا۔

”راج! مجھے وہ مانی بلا شاعر۔ کیا نام ہے.... کم ذات کی غزل سنا دے۔“
 ”کم ذات نہیں ہزار۔“

”ہاں ہاں ہزار کی غزل ہی سنا دے۔ بہنا ابھی بہت اُداس ہے۔“

ششاد کو وارڈن روڈ پر چھوڑ کر راج اس کی ٹکن لے کر اپنے جگے کو چلی گئی جو باندھ میں
 تھا۔ پالی پل پر۔ پالی پل کی طرف ٹرتے ٹرتے میرٹلی ڈرائیو نے سوچا۔ میں اسے پالی پل، کیوں
 لے جاؤں اسے باندھ کے ساحل پر کیوں نہ لے جاؤں۔ اس وقت وہاں باندھ کے ساحل پر کوئی
 نہ ہوکا۔

پھر اس نے سوچا۔ اگر اُسے تین سال کی جیل ہوگئی۔ تو اس کی بیوی تربیدہ اور اس کا چار سال کا بچہ
 شہباز کیا کرے گا۔ میں ٹکن ہے۔ اس کے جیل کے دفوں میں کوئی اس کی بیوی کو باندھ کے ساحل
 پہلے جائے۔ غری میں کیا کچھ ٹکن نہیں ہے۔

”مگر اس وقت موقع اچھا ہے۔“ امیر علی عثمان نے امیر علی ڈرائیو سے کہا۔

”ہاں مگر اس موقع کو حاصل کر لینے کے بعد زندگی بھر کوئی مجھے ڈرائیور نہیں رکھے گا۔“
ایمر علی ڈرائیور نے ایمر علی پٹھان سے کہا۔

”خو...“ پٹھان امرار کرنے لگا۔

”چپ رہو، ڈرائیور نے بڑی سختی سے کہا۔ اور پھر کچھ گاڑی کا سٹرخ پالی بل کی طرف موڑ دیا۔

راج کو پتہ نہیں چل سکا کہ ایمر علی نے اپنے دل میں کیا باتیں کیں۔ کیونکہ وہ اپنے دل کی باتوں میں مصروف تھی۔ اسے میں اس کا جھگڑا گیا۔ جیوں ہی گاڑی پورے میں مڑی ایک ٹبلے پتلے سوکھے گھاٹ سے آدمی نے آگے بڑھ کے گاڑی کا دروازہ جلدی سے کھول کے راج کی طرف مشتہہ بھاہوں سے دیکھا۔ جیسے وہ نکاہیں کہہ رہی ہوں؟ کہاں گئی تھیں؟

یہ راج کا خاوند مشطر تھا۔ راج اس وقت تک چپ رہی۔ جب تک ایمر علی گاڑی کو جھگے سے باہر نکال کے نہیں لے گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے خاوند کی طرف مڑی اور گرج کے بولی ”جہنم میں گئی تھی!“
اُس کا خاوند گھبرا کے چھپے بٹ گیا۔ ”میں نے تو کچھ نہیں کہا راج!“

راج اس کی بات کا جواب دے بغیر آگے بڑھ گئی۔ آگے برآمدے میں اُس کے چچا کھڑے تھے جو ڈیڑھ پانچاڑھ برس پر دوٹی۔ چہرے پر جھڑیاں۔ آنکھوں میں وہی مشہد اور عجیب ڈر سا....
راج نے ڈپٹ کے پوچھا۔ ”آپ ابھی تک سوئے نہیں؟“
”تھرا انتظار کر رہا تھا!“

راج نے بڑی سختی سے کہا۔ ”میں نے کب کہا ہے میرا انتظار کیجئے۔ میرا انتظار کسی نہ کیجئے گا۔ دس صف کہہ چکی ہوں۔ کوئی بھی نہیں ہوں۔ اپنا بُرا بھلا خوب سمجھتی ہوں۔ خبردار جو آئندہ سے کسی نے میرا انتظار کیا۔ راج اِدھر اُدھر دیکھ کر گرجی۔ مگر وہاں برآمدے میں چچا کے سوا کوئی نہ تھا خاوند چپکے سے کھن پیٹ کے گراج میں چلا گیا۔ کیونکہ وہ گاڑی چلاتا تھا۔ اور باہر دنیا میں اُسے صرف ڈرائیور ہی کہا جاتا

تھا۔ یہ بہت کم لوگ جانتے تھے کہ وہ راج کا خاوند تھا۔

راج چاکو دیں برآمدے میں ٹھہر چھوڑ کر اندر ہال میں چلی گئی۔ ہال میں اس کا بھائی، اجمینو بنگ پٹے
 مٹھیاں بیٹھنے بیٹھا تھا اس نے آتے ہی راج کو بائیں سے بچوایا ”کہاں گئی تھی سالی“
 راج نے اس کے منہ پر زور کا ایک طمانچہ جڑوایا۔

بھائی نے ایک گھونسا مارا۔ راج رونے لگی۔ مگر روتے روتے لڑائی بھی گئی۔ اس نے ناخنوں سے اپنے
 بھائی کا چہرہ جگ جگ سے ہولناک کر دیا۔ چلا چلا کر کہنے لگی۔ ”سور کا بھڑا“
 ”صدا کی بجی؟“ بھتیجا اجمینو غصے میں غرائے ”سالی روز رات کو میرے آتی ہے یہ مگر بے کردی کا کوٹھا ہے“
 ”مرا نام ہے یہی کا کھلتے ہو۔“ اُس پر سے اُڑتے ہوئے راج اس کے ایک طمانچہ مار کے بولی۔

اجمینو کو طیش آیا۔ اس نے راج کے اتنے زور سے ہاتھوں کو کپڑے گھسیٹا کہ راج صوفے
 سے نیچے فرش کے خالیچے پر گر پڑی۔ اور تپائی پر رکھا ہوا اگھدا ان گر کر ٹوٹ گیا۔

اتنے میں چچا دامود۔ اجمینو کی بیوی گوری اور چچی گیشی اور موسیٰ ٹھاری اور موسیٰ کی بیٹی رام پیادی ادا اس کا
 خاوند اجیت سنگھ اور دس بارہ لڑکے لڑکیاں۔ جاتے کہاں کہاں بیٹھنے کے کوئے کوئلے سے بھل کر ہال یا
 جمع ہو گئے۔ اور ایک ہی وقت میں ایک دوسرے ہنند زور سے چنے چلائے چنگھاٹنے اور رونے پٹنے لگے۔

اُس پاس کے بھگلوں کی روشنیاں جو گل ہو چکی تھیں۔ باری باری سے پھر چمکنے لگیں۔ ساتھ
 والے بھٹے کے انجینیر کمال داس نے اپنی بیوی سے کہا ”ارے دی روز کا شتاب ہے۔ دی راج دیر سے
 آئی ہے۔ تھوڑی دیر تک اُٹل خیال رہے گا۔ پھر سب سو جائیں گے۔۔۔۔۔ چلو اندر۔۔۔۔۔ کمال داس
 نے اپنی بیوی کی کمر پر ہاتھ رکھا ”ابھی ان کی شادی جوئے تین ماہ بھی نہ ہوئے تھے مگر۔۔۔۔۔“
 بیوی تلو کے بولی ”نہیں میں تو ذرا یہ جھگڑا سنوں گی“

”روز خوشی ہو یہ کمال داس نے جہان لئے کر کہا“ اس میں کیا رکھا ہے جاہل بد تہذیب غلی غلط ہے۔۔۔۔۔“

”تم کیا جانو۔ ہر روز کوئی ذکر کوئی نئی بات ہوتی ہے؟ کمال داس کی بیوی بولی ”تم کیا جانو عورتوں کی باتیں۔ تم جلد کے سوراخوں میں ابھی آتی ہوں“

کمال داس کو خوب معلوم تھا کہ ابھی آتی ہوں کا مطلب ایک گھنٹے سے ہے۔ اس نے کسی نہ کسی طرح صبر کرتے ہوئے کہا ”اچھا ایک پیار تو دے دو“

”نو“ کمال داس کی بیوی نے پیچھے سے دونوں ہونٹ جلدی سے اُس کے آگے کر دیئے۔ بڑی بے دلی سے۔۔۔

کمال داس کو بوسہ دیتے ہوئے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے وہ بوسہ نہیں لے رہا۔ رتیلی زمین میں پھاڑا چلا رہا ہے۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اور اپنے کمرے میں رنجیدہ ہو کے چلا گیا۔ چلتے چلتے اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ ہوں، سالی کا دل اس وقت جھگڑے میں ہے۔

کمال داس نے فیک ہی کہا تھا۔ کوئی گھنٹہ بھر میں جھگڑا رخ مٹ گیا۔ آہستہ آہستہ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ اب صرف راج کے کمرے میں روشنی تھی۔

اب راج اور بیٹیا میں صلح ہو گئی تھی۔ راج اپنے بھائی کے چہرے پر جہاں جہاں ناخون کے نشان تھے کریم لگا رہی تھی اور سسکیاں لے لے کے کہہ رہی تھی ”بیٹیا تم بھنگ کیوں پیتے ہو؟“

”تو کیا کروں۔ راجو۔ تم دوسری کے پیسے جو نہیں دیتی ہو؟“

”کیسے دوں؟ تم خود ہی گھر کی حالت تو دیکھتے ہو۔ بیٹیا جی۔ جو رشتے دار ہے۔ جو بے کار گاؤں والا ہے جس موٹے سے کبھی بچپن کی ایک دن کی جان پہچان تھی۔ وہ سید حایا باں باندھے میں راج کے بچلے پر ہلا کر رہا ہے۔ لگ بھگ کوئی پچاس آدمیوں کا کھانا صبح وشام تیار ہوتا ہے؟“

اور یہ بات باطل صحیح تھی۔ مگر اس میں راج کا خود اپنا تصور تھا۔ جب اس کے اچھے دن آئے

اور اس کا شمار ہندوستان کی گہنی چنی اداکاروں میں ہونے لگا۔ اور سب سے پچاس پچاس ہزار کے کاغذ ملنے لگے۔ تو اس نے بھی اپنا خرچ بے تحاشا بڑھا لیا، محلایاں، مکان، غیٹ، کپڑے، کتے تو تھے ہی۔ اب اس نے ایک ایک کر کے اپنے سب رشتہ داروں کو اپنے پاس بلانا شروع کیا پہلے چھانکے پھر اس کا خاندان۔ پھر پھر پھر آئے۔ پھر ان کا خاندان۔ پھر بہت سے بے کار لوگ۔ مگر وہ پار کے رشتے دار بھی بنا بلائے چل پڑے۔ راج کو اپنے بھٹکے کے ساتھ ایک اور جگہ کرانے پر بے کراں سب لوگوں کو دھمکا پڑا۔ ان کے علاوہ اس کا اپنا خاوند تھا۔ جو پہلے کچھ نہیں کہتا تھا۔ مگر زندہ تو تھا۔ اور ہر روز لافیا کا انگلشمن لیتا تھا۔ پھر اس کے چچا تھے۔ جو اپنی بیوی کے علاوہ ایک رشتی رکھے ہوئے تھے اس کا خرچ پانی بھی راج کو دینا پڑتا تھا۔ ابھینو بھنگ پیتا تھا۔ اور شر کہتا تھا شر تو نہیں کہتا تھا۔ لیکن اُردو کے سائے دیوان اُس کے پاس تھے۔ اُن میں سے شعر چڑھا کر کے غلم کے رساوں کو بھیجتا تھا اور وہ لوگ اس نے چھاپتے تھے کہ وہ راج کا بھائی تھا۔ کبھی کبھی اس کے سہارے راج کا یا تو تو راج کا کوئی اعزہ دیوان رسالے والوں کو مل جاتا تھا کبھی کبھی کوئی چٹھی خزانے دار خیر۔ کیوں کہ جب راج اور بھینا کی زور کی لڑائی ہوتی۔ تو راج کئی کئی روز اپنے بھائی کو سہ نہیں لگاتی اور اسے پیسے نہیں دیتی تھی۔ ان دنوں ابھینو بے چارہ کیا کرے بھنگ کیسے پئے۔ اپنی بیوی کوں کا خرچ کیسے پورا کرے۔ چنانچہ وہ ان دنوں اپنی بہن کے معاشقوں کے حالات رسالے والوں کو ہونے پونے میں بیچ دیتا کئی بار ایسا ہی ہوا کہ راج سے لڑائی ہو گئی۔ مگر کوئی معاشقہ نہیں ملا اور بھنگ کی ٹوٹ ہو رہی ہے اس نے ابھینو کو ایسے موقعوں کے لئے نئے معاشقے بھی خود ہی گھڑنے پڑتے تھے۔ گروادہ ایک خلاق فن کار بھی تھا مگر اس وقت ابھینو اور راج کی صلہ ہو گئی تھی۔ وہ اُسے بھینا کہہ رہی تھی اور وہ اُسے راج کہہ رہا تھا۔ اور دونوں بہن بھائی ایک ہی صوفے پر بیٹھ کر ایک دوسرے سے گلے ل رہے تھے۔

راج نے جیسے پیار سے کہا "میں آج اپنے بھینا کو دھکیلاؤں گا۔"

یہ کہہ کر راج صوفے سے اٹھی اور اس نے امدادی کھول کر دیکھنے کی باتیں نکالی۔ تپائی پر دو مگلاس رکھے
 رفریجیٹر سے سوڈے کی بوتلیں لائی پھر وہ دونوں دیکھنے لگے۔

”دو پیگ پینے کے بعد ابھینو نے کہا : ”راجو تم سب کو کھانا دو۔ ان سب رشتے داروں کو :
 ”ہاں بیٹا تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں کل ہی ان سب کو چمکا کر دوں گی :
 ”صرف ہم اور تم رہیں گے :“

”ہاں بیٹا صرف ہم اور تم“

دو پیگ اور پینے کے بعد ابھینو نے کہا : ”راجو۔ تم مشنر کو بھی کھانا دو :
 ”میشنر تو میرا شوہر ہے :“ راج بولی۔

”تو کیا ہوا۔ ابھینو بڑے غصے میں بولا : ”سالا۔ بالکل تمہارے لائق نہیں ہے۔ سوکھا پٹرا۔ دھکا۔ تمہارے
 ماں باپ نے اس سے تمہاری شادی کر کے تم سے بڑا غم کیا ہے۔ میں تمہارا بھائی ہوں میں تم سے انصاف
 کروں گا۔ تم شانتا رام سے شادی کر لو :“

”مگر شانتا رام تو شادی شدہ ہے :“

”اچھا تو محبوب سے کر لو :“

”وہ بھی شادی شدہ ہے :“

”اچھا تو کاردار سے کر لو :“

”وہ بھی شادی شدہ ہے :“ راج بولی۔

یہاں آ کے ابھینو کا داغ ٹک گیا۔ اور دو پیگ پینے کے بعد اس نے سب سب کے کہا : ”اچھا تو مجھ
 سے شادی کر لو :“

”مگر تم تو مجھے بھائی ہو :“ راج بولی۔

”ہاں ٹیک ہے“ بتیانے سر ہلا کے کہا: ”اچھا تو پھر مجھے اندر کی دو“

پیشتر اس کے کہ راج اس کے گھاس میں اندر کی اندلیتی۔ ابھینو نے آنکھیں بند کر لیں۔ اللہ صوفے پر اوندھا ہوا کرتا لے لیے لگا۔ راج نے اسے ٹانگے گھسیٹ کر فرش کے غایبے پر سلا دیا۔ پھر اس نے ندر سے گھنٹی بجائی۔ باہر پھر روشنی ہوئی۔ ایک لڑکا آیا۔ راج نے ابھینو کی ہین اشارہ کیا۔ وہ قہر لے لیے ہوئے ابھینو کو اپنے بازو میں اٹھا کے لے گیا۔ راج نے چٹنی چڑھادی اور جتنی گل کر کے مسبری پر لٹ جئی۔

راج نے کروٹ لے کے مسبری کے قریب تپائی پر رکھی ہوئی ایلن لٹو کی تصویر کی طرف دیکھا۔ جو ریشم کے فریم میں جڑی ہوئی اندھیرے میں بھی جگ جگ کر رہی تھی۔ ریشم راج کی طرح

”ڈرنگ“ راج لٹو کی طرف دیکھ کر دھیرے سے مسکرائی، اللہ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

رئیس گنج کا عشرت بہت خوب صورت تھا۔ اس کی خوب صورتی میں اس کی تخلیق میں اس کی افزائش میں۔ اُسے عشرت کی ذات میں پختہ کر لے جس عشرت کے لب باپ کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اور انہوں نے عشرت کو ایک جیہ پر وقار خوب صورت تعلیم یافتہ مستعد فوجیوں نے بنانے میں بے دریغ و بے خرچ کیا۔ کوئی تاج محل بناتا ہے، کوئی عشرت بناتا ہے۔ خوب صورتی کی تخلیق کا بندہ ہر انسان کے دل میں ہوتا ہے۔

ہر باپ اپنے بیٹے کے آئینے میں اپنی صورت دیکھتا ہے۔ عشرت کے والدین کا رشتہ بیچ تھے۔ اس نے عشرت کو کم از کم ہائی کورٹ کا جج تو بنانا چاہئے تھا۔ اس نے وہ چاہتے تھے کہ عشرت بی بی، اس کے بعد لاکالچ میں داخل ہو جائے۔ اس کے بعد وہ اپنے اثر اور رسوخ سے آہستہ آہستہ ایک نئی — ایک طرز کو بھی نہیں آیا۔ اور عشرت کے والد اس کی حسرت کو اپنے دل میں لے گئے۔ انسان آئینہ سار کیوں ہوتا ہے۔ وہ انسان کیوں نہیں ہوتا۔ وہ اپنے بیٹے کی شبیہ میں ماضی کا عکس کیوں دیکھتا ہے مستقبل کی قدر کیوں نہیں دیکھتا ہے؟

عشرت کے باپ نے کالج کی سطح پر جو عکس دیکھتے تھے وہ ان خواہوں سے بہت مختلف تھے جو

عشرت کے دل و دماغ پر چھاپے تھے۔ ہر شخص کا دل۔ اس کا اپنا دل ایک ذاتی آئینہ ہوتا ہے جس میں کوئی دوسرا اپنی تصویر نہیں دیکھ سکتا۔ بہت سے باپ ہی نقلی کر جاتے ہیں اور پھر ساری زندگی لمبے بگھٹتے رہتے ہیں۔ عشرت کے باپ اور ان کے مرنے کے بعد اس کی ماں اگر عشرت کے دل کے آئینے میں بھانک سکتی تو دمک سے رہ جاتی۔ کیونکہ اس آئینے میں ان خوابوں کی تعبیر موجود نہ تھی جنہوں نے اپنی زندگی رنگ برنگی کیفیوں سے اُن کے خاندان کو بھار رکھا تھا۔ بات بھی ٹھیک ہے۔ عشرت اکثر سوچتا تھا۔ میرا آئینہ کسی کے آئینے سے کیوں ملے۔ میں انسان ہوں۔ کالج کی سطح نہیں ہوں شریعہ شروع میں عشرت کے خواب مختلف تھے۔ اسے ورزش کا بہت شوق تھا۔ وہ بڑا ہو کر جتنا تک کا اُستاد بننا چاہتا تھا جب وہ اور بڑا ہوا تو فوج میں جنرل بننے کے خواب دیکھنے لگا جب وہ اور بڑا ہوا۔ اور جب اسے دُور دیدہ لگا ہوں شرمائی ہوئی نظروں اور عرق عرق مینوں اور کانٹتی ہوئی نیم۔ ہوش انگلیوں کے پیام ملنے لگے۔ تو وہ فلم میں ہیرو بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ جشت!۔ وہ جتنا تک کا اُستاد کیوں بنے گا۔ ہادی نرسل بار پھر ورزش کرتے کرتے اس کا تو دم نکل ملنے لگا۔ اور فوج میں جنرل؟ پہلے تو وہ سپاہی میں بھرتی ہو گا اور لفٹ رائٹ کرتے پر یہ کرتے فٹبک کھاتے کھاتے جلتے کب جنرل بنے گا۔ کہ کسی دن کورٹ مارشل ہو کے پھر سپاہی رہ جائے گا۔ لیکن یہ فلم کا ہیرو بننا کس قدر اچھا اُو آسان کام معلوم ہوتا ہے جس طرح وہ چاہا گیا تھا جس طرح رئیس گنج میں اس کی خوب صورتی کے چرچے تھے۔ جس طرح اہمان بے بھم۔ نامستول لڑکیوں نے چپ چپ کر اس سے محبت کی تھی جس طرح کی اہمان۔ بے بھم۔ نامستول ہندوستانی فلمیں اس نے دیکھی تھیں۔ اس سے عشرت کو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ قطعی طور پر فلم میں ہیرو بننے کے قابل ہے اور ہیرو کا کام کس قدر آسان ہوتا ہے۔ فلم میں شروع سے آخر تک محبت ہی محبت کئے جاتا۔ محبت کے گیت گاتا۔ محبت کے خط لکھتا۔ محبت کے اُستاد بنانا۔ محبت کی موت مرنا یا محبت کی شادی کا ناگرا نوسے ہی نوسے ہیں۔ ہر طرف سے اس کے

مقلد پر ہندش کا مستویا فتح کا جہز۔ مینی ساری عواثر یاں درگزر کرنے کے نامہ۔ عشرت کا درخیم میں
لبوں ہم اس خیال کے آتے ہی کانپ گیا اور اس نے فلم میں بیرو بننے کا قطعی فیصلہ کر لیا۔

اس نے عشرت بنی لے پاس کرتے ہی کبھی بھاگ گیا۔ اور اپنی بیوہ ماں کو اکیلا چھوڑ گیا۔
رئیں گنجی کا شہر اس کے لئے بہت چھوٹا تھا۔ یہاں کی کامیابیاں بہت خیر نہیں۔ سکندر مقدونیہ میں کیسے
رہ سکتا تھا۔ اتنی بڑی دنیا فتح یابی کے لئے اُسے چاروں طرف سے بھاری تھی۔ اس نے سکندر رئیں گنجی
سے بھی آگیا۔

ہر سال ملک کے اطراف و اکنات سے ہزاروں لوگ یہی کام کی تلاش میں آتے ہیں اور
یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔ اور یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے۔ جسے رد کیا جاسکے۔ یہی ہندوستان کا سب
سے بڑا منشی شہر ہے اور کام کاج کے سلسلے میں ایک بڑا صنعتی شہر لیک بہت بڑا متقاضی ہوتا ہے جو
بے روزگار لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ہر ملک ہر ملک میں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ کیونکہ یہاں تجارت ہوگی
اور صنعت و محنت ہوگی۔ وہاں باہر سے لوگ کھینچے ہوئے آئیں گے اور گھر والے کو چھوڑ کر آئیں گے اور بیویوں کو
چھوڑ کر آئیں گے اور ماں باپ کی خواہشوں کو روند کر آئیں گے اور دوستوں اور محبوباؤں کے آسودگی میں
بیٹھے ہوئے آئیں گے جس طرح لوہے کے فرتے متقاضی کی طرف کھینچے ہوئے چلے آتے ہیں۔ یہاں منتظر
بھی آئیں گے اور ڈیوڈ بھی آئیں گے۔ اور کراہاں سٹو بھی آئیں گے۔ یہاں خدا بھی آئیں گی۔ سوشیو بھی
آئیں گی۔ انہیں بھی آسنے کی اور ساتری بھی آئے گی۔ کوئی ناقوں کے ساتھ آئیں گی تو کوئی ڈھائی سو
روپے کے آئیں گی۔ کوئی زیور چڑھائے آئے گی۔ تو کوئی کسی کی آنکھوں کی بیند چرا کے آئے گی۔ مگر
آئے گی ضرور کیونکہ یہی ایک بہت بڑا متقاضی ہے۔ جہاں دانستی رہتی ہے۔ مہلے چاری بیوہ
دانستی براپنے گاؤں میں بھوک مرنے تھی۔ پر یہاں کبھی میں ایک مل میں ساٹھ روپے پاتی ہے۔ یہاں
راتی ہلا ہے۔ جو سنا ہے ایک فلم میں کام کرنے کے لئے ڈیڑھ لاکھ روپے لیتی ہے۔ پھر یہاں اپنے

کر پال کا بیجا گرجش ہے۔ اسے دی گرجش جو اپنے قبضے میں مارا مارا پھرتا تھا۔ یہاں مٹا ہے اس کے پاس چھوٹکیاں ہیں۔ اور بچے کمار کو تو دیکھا ہو گا۔ یہاں کمار سدا چھنڈا بھی اس کے نالے نہیں چھاپتا آج وہ بچی کا سب سے بڑا فلی ادریب ہے۔ اور عشرت نے سوچا وہ تو راج کمار سے کہیں خوب صورت ہے۔ وجہ کدے کہیں تعلیم ہانت ہے۔ اس نے اس نے اپنے سوٹ کبھی میں تین اپنے پہلے ہوئے سوٹ کے پکڑتے ہیں، انگریزی جرابیں، جوتے، اندر تین سو روپے ساتویں لئے ہوئے۔ وہ جھاگ کر بچی آگیا اور ان کے سی سائیل ہوٹل میں ٹھہر گیا۔

سی سائیل ہوٹل کی غلام گردش میں پہلے ہوئے کھٹے نے عشرت کو دیکھ لیا۔ کھٹے راج محل اسٹوڈیو میں کیمرو میں تھا۔ اور بظاہر بہت عظیم۔ مرد بار اور تین مہتم کا انسان نظر آتا تھا، گول گول چہرہ، گول گول سینک، گول گول سکواٹ کچھ کچھ بھی ہے۔ کچھ کچھ بھی نہیں۔ پان کٹے میں دبائے ہوئے لیک نیلے رنگ کی چوڑی مہری والی چٹلون۔ اور چٹلون کے اوپر ڈھیللا ڈھالا براؤن رنگ کا بیش خرش پہنے ہوئے کھٹے ہوئے چلے آئے ہیں۔ کھٹے بظاہر سکتے ہوئے جیسے میں کام کرتا تھا۔ سوئی ہوئی رفتار سے چلتا تھا۔ سوئی ہوئی آدمی آٹھوں سے اس طرح دیکھتا تھا۔ جیسے وہ دنیا دہا فیا سے غافل ہے۔

مگر وہ اصل اس کی غفلت اک بظاہر سوئے ہوئے کنڈلی مارے ہوئے، دھوپ سیکے ہوئے سانپ کی غفلت تھی۔ آپ خدا اس کے قریب گئے اور اس نے ڈنگ مارا۔ کھٹے نے عشرت کو غلام گردش میں ٹپتے ہوئے تار لیا کر کئی آسامی ہے فلم کے جگر میں ہے۔ اس لئے معاملہ پٹ جلتے گا۔ چنانچہ اس نے عشرت سے دوستی کرنی۔ اور اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ اسے سیٹو بیتال برائی بائز یا کے راج محل اسٹوڈیو میں لے جائے گا۔ اصلے اپنے دوست جوشی ڈائریکٹر سے ملاوے گا۔ مگر تمہارے پاس کیا سٹیل ہیں ہا کھٹے کہا۔

”ٹیل کیا جوتے ہیں“ عشرت نے گہر کے پوچھا۔

”تمہاری تصویریں ایک آپ کے ساتھ روشنی اور زائے کے طے چپہ استخراج انسان کی صحت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں اور تم تو یوں بھی اچھے خامے بیرون کرتے ہو۔ پوری نظم اندیشی میں تمہاری ایسی شخصیت مجھے تو کسی دوسرے بیرون کی نظر نہیں آتی۔ ٹیل کھولنے میں پچاس روپے لگیں گے۔ میں خود کھینچوں گا۔“

عشرت کچھ تصویریں اپنے ساتھ لایا تھا کھنڈے انہیں دیکھ کر سر ملاتے ہوئے کہا یہ دس گنج کے نامزد گراں گاہک بال کے فوٹو کہاں نہیں ملیں گے۔ جن میں تم چیتے کی کمال پرکری رکھ کے یوں لکھنے پڑھے ہو۔ جیسے تمہیں پتہ چلا ہوا ہے۔“

عشرت ہنسا اور اس نے جیب سے پچاس روپے نکال کے کھنڈے کو دئے۔ کھنڈے گزشتہ تین مہینے سے ہوٹل کا بل نہیں دیا تھا۔ اس لئے۔ اور کچھ کھنڈے عشرت کو جوشی جی سے ملا دیا۔ اور اس طرح ایک جفتہ میں اس سے ڈیڑھ دو سو روپے اور کھینچ لئے۔ اس کا ایک سوٹ گری لکھو لایا دو تیس ہانگ لیں ایک جوتا پہن لیا۔ اور جب عشرت کے پاس کچھ ڈرہا۔ اور جب فیچر نے عشرت کا سامان ہوٹل سے باہر پھینک دیا۔ تو کھنڈے صاحب عشرت کی طرف سے یوں داخل ہو گئے کہ اس طرح اودھ مندی آنکھوں سے عشرت کی طرف دیکھنے لگے۔ جیسے انہیں موتیابند کی شکایت ہو۔

جب عشرت ہوٹل سے باہر نکلا۔ تو اسے ایک جھکسا گلا زندگی میں پہلی بار اسے کوئی آدمی ایسا بھی ملا تھا جس نے اس کی خوب صورتی کی رقی بھر پوراد نہیں کی تھی۔ جس نے ایک شائق جیب کترے کی نگاہوں سے اسے چاروں طرف سے ٹٹول ٹٹول کر اسے اچھی طرح سے اٹا پٹا کے جہان پھنگ کے غالی کر دیا تھا۔۔۔۔۔

یہ ایک عشرت کو مسلم ہو کر نہ اس شہر میں باطل اکیلا ہے۔ اس کی جبین استینوں سے

باہر فلک رہی ہیں اور ساری دنیا اسے مشتہ نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔

وہ رات اس نے باجے سینٹرل ٹیشن کے سینکڑوں کلاس وٹنگ روم میں جاگنے گزاری۔ صبح ہوتے ہی اس نے راج محل سٹوڈیو کا رخ کیا کیونکہ جوشی ڈائریکٹر نے اس کا فلم ٹسٹ لینے کا وعدہ کیا تھا۔

اگر وہ اس امتحان میں کامیاب ہوا، تو.... وہ عشرت سوچتے نکلا کہ پھر وہ اپنا نام کیا رکھے گا۔ پھر اس کے ذہن میں ایک باغیچہ کی پرکھلے سے گزرتی یہ پرکھ وہ خود چلا با تھا۔ تلخ میں ہلکیا فائرس روشن تھے۔ اور وہ ایک شفت شفت کی ساری میں حمر قرانی ہوئی تھی کے ساتھ دھس کر رہا تھا جوشی نے کہا: عشرت مسکراؤ =

عشرت مجھے بھوکا تھا۔ اس نے مسکراتے کی کوشش کی۔ وہ اسلم ہوتا ہے۔ جیسے کوئی بچے کے بعد مسکراتے کی کوشش کر رہے ہو۔ اسے بھائی تھا اسے ملنے ایک خوب صورت لڑکی لکھی ہے۔ بناؤ کیسے مسکراؤ گے؟ جوشی نے پوچھا۔
عشرت نے ہر مسکراتے کی کوشش کی۔

”باپ دے؟“ جوشی بڑے انداز سے نئے میں چٹایا۔ پھر اس نے کہا۔
”اچھا ہنسو۔“

”ہی۔ ہی۔ ہی۔“ عشرت ہنسا۔

اُسے اپنی ہنسی بڑی کمزور معلوم ہوئی۔

”گدھا! جوشی پھر حیا۔“ اچھا پڑھ کر بھی دکھاؤ۔ میرا مطلب ہے۔ چہرہ اس، آنکھوں میں آنسو نہ لگاتے ہوئے۔ چہرہ خبت کی حواں۔ جیسی کی زندہ تصویر =

عشرت نے پھر کوشش کی۔ اُسے خود معلوم ہو رہا تھا کہ اس کوشش میں اس کا چہرہ بہت بے باک

معلوم ہو رہا ہوگا۔

یہ ایک وہ کھبیانی ہنسی ہونے لگا۔

”اٹ اٹ اٹ“ ہنسی نے غصے میں کہا ”آج اے رُس گئے سب روغنہ، کم بہت ایکٹنگ کی دم سے تنہا نہیں رگیت آؤٹ!“

گیٹ آؤٹ۔ ہر کے عشرت جڑی بے دلی سے راج محل کی شیعہ نمبر ۷۷ کے باہر پڑنے فرخ پڑے ہوئے پردوں، مٹاٹ کے پردوں، کھڑی کی کھچڑیوں مولانا گ کے مٹاٹوں اور پلاٹر کے پڑنے قسمتہ تہوں کے درمیان مٹھا تھا۔ اس کے سامنے فٹ راج کا ٹوٹا ہوا بھتر تھا راج مٹی کا ہاند گیش کی سوڈ پڑا تھا۔ اور تندی بیل کا بت ایک مڑھی سے اپنا منہ لگائے ہوئے تھا عشرت نے سوچا اب وہ کیا کرے۔ سکندر واپس مقدونیہ چلا جائے۔ کہ خود کشی کرے۔ کہ ماں کو تار دے کے روپے چھلانے کی کوشش کرے۔ کہ فاقہ مستی میں کوشش کرتا رہے عشرت زندگی میں آج تک بھوکا نہ رہا تھا۔ اس نے آج اس کا جی بدلے کو چاہ رہا تھا۔ یہ ایک اس کے کانوں میں آواز آئی۔

”ابا اڑیاں کیوں پیچھے ہو جی؟“

عشرت نے سر اٹھا کے دیکھا۔ سامنے مادا اڑی رانا کا لباس پہنے عہدہ سیکر آپ کے ہوئے ایک جوان لڑکی اپنے ہونٹوں کو بڑی غوث سے بیکوڑتے ہوئے تھی سب کے رہی تھی۔ یہ رفیعہ تھی ”ساری کب کے وہاں سے عشرت اٹھ کھڑا ہوا، اور چلنے لگا۔

”لو!“ رفیعہ بڑی حیرت سے ہوئی ”میں نے ذرا دم کیا تو اٹھ کے چلنے لگے۔ اگلے ایسے میں تمہارا کیے گزر ہوگا۔ نئے معلوم ہوتے ہو“ رفیعہ کھیکھلا کے ہنس پڑی۔

عشرت بھی ہنسا۔

وہ دونوں پلاسٹک کے تہوں پر بیٹھ گئے۔ رفیعہ نے اپنا نام بتایا۔ وہ آج چوتھی تھی

منو بھائی کی شوٹنگ میں آئی تھی۔ ڈانس کئے۔ اس کی ایک ماں ہے۔ ایک بہن تھی سو گئی پانچ بچے چھوڑ گئی۔ وہ ان پانچ بچوں کو پالتی ہے۔ بھنڈی بازار میں ایک چھوٹی کھولی میں رہتی ہے۔

”تم کہاں رہتے ہو کیا کام کاتے ہو۔ یہاں کیوں آئے ہو؟“

عشرت نے سب بتایا۔ بتاتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”اباڑا مرد ہو کر روتے ہو“ رفیعہ غصے سے بولی ”چلو میرے ساتھ گھر پر...“

عشرت اٹھا۔

”لو یہ ابھی سے چلنے لگے؟ ارے ابھی نہیں شوٹنگ کے بعد چلیں گے۔ ساڑھے چھ بجے بیٹھوس ابھی جانی ہوں۔ شاٹ ہونے والا ہے۔“

رفیعہ کی کھولی میں روشنی بہت کم تھی۔ کالونج بہت زیادہ تھی۔ رفیعہ کی ماں کے خاکسری ماں چہرے پر انکھوں کے ان گنت نشان تھے۔ اس کی ٹھوڑی ایک پیٹروم کی طرح بڑی وقت آہستہ بہت حرکت کرتی رہتی تھی۔ اُس نے ایسی سٹی ہوئی نکلا ہوں سے عشرت کی طرف دیکھا۔ جیسے دنیا میں کوئی انہی نہیں ہے۔ اور کوئی دوست نہیں ہے۔ کوئی نیا نہیں ہے۔ کوئی پرانا نہیں ہے۔ کسی کے آنے کی فحش نہیں ہے۔ کسی کے جانے کا غم نہیں ہے۔ جتنے آنسو تھے وہ سب خشک ہو چکے۔ اور جتنے قسم تھے وہ سب مر چکے۔ بس ایک پنڈم ہے جو ایک ہی سقرہ رنٹا سے جھوٹا رہتا ہے۔ موت سے زندگی کی طرف اور زندگی سے موت کی طرف ایسی گھبری، رُکی ہوئی، جامد ساکت جگہ تھی۔ اس بڑی عورت کی کمرعشرت کو محسوس ہوا جیسے وہ کسی گھر میں نہیں۔ کسی برف خانے میں چلا آیا ہے۔ اس کے سارے جسم میں ایک جُھر جُھری سی آئی اور اسے ایک لمحہ کے لئے کانپنا چھوڑ گئی۔

رفیعہ عشرت کو ہاتھ سے پکڑ کر کہنے لگی ”تو کیا چپ کھڑے ہو۔ شرابی ہوئی تھی (دلک) کی طرح اب بیٹھ جاؤ۔ یہیں زمین پر مڑ جاؤ۔ ہم لوگ یہیں زمین پر بیٹھتے ہیں۔ یہیں زمین پر سوتے ہیں کھولی

کے ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ روضہ کمال کی ٹیکر تار کرواہاں دھونے کے لئے چلی گئی۔ بڑی ماں نے ہنڈیا میں چاول ڈالے۔ عشرت کرسی پر بیٹھ گیا۔ زمین پر پیاز کے چھلکے پڑے ہوئے تھے۔ ایک چمکا اٹھا کے۔ میدانے عشرت کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: ”تم فہم میں کام کرتے ہو؟“

”ہاں۔“ عشرت نے کہا۔

عشرت ذات سے بھوکا تھا۔ اسی لئے بار بار ابلی ہوئی بانڈی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بڑی ماں نے آٹوں کے ٹھوٹے کاٹ کے بانڈی میں ڈال دیئے۔ پہلے چاول ڈالے جا چکے تھے۔ جب تک کے بعد ہلدی ڈالی گئی۔ تو بانڈی میں بڑا مزے دار ہال آیا۔ سوندھا سوندھا۔ پیلا پیلا۔ جھاگوں والا سوں سوں کرتا ہوا ہال، عشرت کی آنکھیں اندر سے کھینچنے لگیں۔ اس کی نگاہیں بانڈی پر جم گئی تھیں۔ یکایک اُس نے دیکھا۔ اُن پانچ بچوں کی نگاہیں بھی اس بانڈی پر جمی تھیں۔ نگاہیں گرسنہ منہیں پانی گردن کا ملتون پیچھے سے اوپر اڑا رہے تھے۔ بچے جاتا ہوا مسلم ہوتا تھا۔ موت سے زندگی کی طرف، زندگی سے موت کی طرف۔

بانڈی کب اتاری گئی۔ کب چاول بانٹے گئے۔ کس طرح ہاتھ بچھے۔ کس طرح جبرے پلے اور ڈالے اُترے۔ عشرت کو اور دوسرے بچوں کو کوئی علم نہ تھا۔ بس ایک بھوک تھی جو ایک خون آشام چمکا لڑکی صبح رات کے تاریک سایوں کی طرح ان کی روح پر اُن کے جوش و احساس پر پھیلی ہوئی تھی۔ اور جب چمکا لڑکے نے اپنا خون پی لیا تو وہ سب نڈھال ہو کر وہیں فرش پر جانوروں کی طرح سو گئے۔ اہ۔ آٹھوں اور پیاز کے چمکوں اور نمک میں سننے ہوئے چاول کے چند دانوں کو اٹھا کر روضہ نے کمر کی کے باہر پھینکے ہوئے دیکھا کہ باہر بازار میں دکانوں پر خوب صورت کتا ہیں رنگی ہیں۔ اور ڈودروں پر انگوٹھ کے گتھے تلک رہے ہیں۔ کپڑے دانے کی دکان پر خوش پوش عورتیں ریشم کی ساواں خرید رہی ہیں۔ اور رستوران سے محلے دار شاہی کبابوں کی خوش بو اُٹھ رہی ہے اور روضہ نے سوچا کہ بازار

میں کتابیں پک رہی ہیں۔ لیکن اس کی بہن کے بچے اُن پڑھ رہی ہیں۔ وہ اخبار پڑھتے ہیں پڑھ نہیں سکتے۔ اور
 ڈورہوں پر تلے ہوئے انکار کئے ہیں اور رشیم بہت ہنگامے۔ اور شای کبابوں کی خوشبو بہت قوی ہے
 ایک آم کے ساتھ اس نے آہستہ سے کھڑکی بند کر دی اور فرش پر پاؤں پھیل کے لیٹ گئی۔ فرش ٹنڈا تھا
 اور اس کے جسم کا ہر انگ دین بھر کی شوٹنگ کی مشقت سے ٹوٹ رہا تھا۔

رضیہ نے کہا ”میری بہن کا خاندان کبھی کبھی تمہاری طرح آیا تھا، بیرو بھنے کے لئے آخر غور کشتی کے مرگیا
 اس کے غم میں میری بہن چپ وق سے رہ گئی۔ آج تم جب ٹھوڈیوں میں کوڑے کے ڈھیر پر بیٹھے تھے
 تو مجھے تمہارا ارادہ ٹیک معلوم نہیں ہوتا تھا۔“

عشرت نے اس پر اس ہو کے کہا: ”کیسی کیسی اُمیدیں نے کے آیا تھا۔“

”کوئی اُمید ایک دم پوری نہیں ہوتی۔ اس کے لئے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ اگر تم محنت کے لئے تیار
 نہیں ہو تو واپس اپنی ماں کی گود میں لوٹ جاؤ۔“ رضیہ نے طنز کیا۔

”میں واپس نہیں جاؤں گا۔“ عشرت نے جواب دیا۔

”تو پھر کیا کرو گے؟“

”تمہاری طرح ایجنٹر بن کر کام کروں گا۔ تمہاری ایجنٹر انجن کا ممبر بن جاؤں گا۔ کل بچے ایک کلاڈ
 مٹلا اور، ممبری کا۔ سنا ہے اس کلاڈ کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا۔“

”اور بیرو نہ بچہ، نو گے؟“ رضیہ نے پوچھا۔

عشرت چپ ہو گیا اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور کلاڈ بدل کے سو گیا۔

دوسرے دن رضیہ عشرت کو لے کر رضیہ کے گھر گئی۔ جہان پورہ کی ایک گلی میں ایک ایٹنی

دستوران کے اوپر واقع تھا۔ رضیہ کی ماں اپنا بیٹی کوٹ گھٹنوں سے اُپر کے سو رہی تھی رضیہ کا بانی جو ایک موٹر ورک شاپ میں مکینک کا کام کر رہا تھا۔ ایک کمر کی میں بیٹھا باہر دیکھ رہا تھا۔ رضیہ دانت مات کر رہی تھی۔

رضیہ نے عشرت کو رضیہ سے بلایا۔ رضیہ اُسے دیکھ کر مسکرائی۔ پھر ہنسی۔ پھر خوب نور سے ہنسی۔ حشرہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

رضیہ نے رضیہ کو گھگھانے کے کہا "ہائے کس قدر سوٹ ہے۔ باصل گذر سا معلوم ہوتا ہے۔ میں تو اگر اپنے دلدار کو نہ چاہتی۔ تو اُسے چاہنے لگتی۔ فنا ہو جاتی۔ بلکہ ..."

واقعی عشرت کی حوصلہ دہی میں کچھ ایسی ہی بات تھی۔ پہلی ہی نظر میں اکثر لڑکیاں اُس پر فریفتہ ہو جاتی تھیں۔ اس کی خوب صورتی میں مرد نہ وقار کے علاوہ ایک عجیب طرح کا بھولپن مصویت سی تھی۔ بھی نہیں مگر معلوم ہوتی تھی۔ اور جب وہ اپنی موٹی موٹی پلکیں اٹھا کر ترہی محاکہوں سے کسی لڑکی کی طوٹ ایک عجیب بے ہوشی ادا سے دیکھتا تھا تو وہ لڑکی بقول رضیہ وہیں "فنا" ہو جاتی تھی اس وقت بھی عشرت نے کچھ ایسی ہی نگاہ سے رضیہ کی طوٹ دیکھا تھا۔ اس کی نگاہ عورت میں ماسک کے ایسے شڈ جذبات پیدا کر دیتی تھی کہ اکثر لڑکیاں اُسے بیک وقت محبوبہ کے اور ماسک کے جلمے جلمے جذبات سے چاہنے لگتیں اور اس قسم کی چاہت بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ رضیہ کو نہیں معلوم تھا، مگر رضیہ جانتی تھی اسلئے کہ یہ نگاہوں میں اس نے جان لیا تھا کہ عشرت کا جس کس قدر خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

"ای ا تو کہاں پنس لگئی؟" اس نے رضیہ سے پوچھا۔

"مکس بھی نہیں؟" رضیہ اس کے شلنے پر ہاتھ داس کے سرگوشی میں ہلکی "موٹی، اباڑ، مائی بی۔ بات نہیں سنئی۔ اپنی کہے جاتی ہے سب سے پارہ۔"

رضیہ نے عشرت کی طوٹ اشارہ کیا "شریف خاندان کا ہے۔ بے کاس ہے۔ گھر سے بھاگ کے بھی ہیں

میر دہنے کے لئے آیا تھا اب اس کا داغ ٹھکانے آ گیا ہے۔ غلام بخش راؤن میں تم سے میر بخود
شاگرد گوارا تنہا ہی بات سن لیتے ہیں۔

ہاں مگر راؤن میں پہلے ہی سے پانچ ہزار مرٹیاں رضیہ نے اعتراض کیا۔

”ایک اور سہی، اُردو تو اس کی ماویٰ زبان ہے۔ بہت اچھی باتیں کرتا ہے۔ درجہ اول کا کارڈ اسے
مل جائے گا۔ اپنی روٹی کما کھائے گا۔“

”اور کارڈ کی فیس پندرہ روپے؟“

رضیہ بولی ”پانچ سو روپے پاس ہیں۔ دس تو ڈال دے۔“

”فنا ہو گئی تو“ رضیہ مسکرا کے بولی ”اکی ٹھپی۔ اگر اس طرح سے تو اس پر خراج کرے گی۔ تو باطل مر جائے
گی۔ یہ تو تجھے کچا کھا جائے گا۔ اس کی خوب سوچتی پر نہ جا۔ رتو۔“

”ہل ہٹ کہنی ...“ رضیہ صہجلا کے لہجے ”تجھے تو ہمیشہ ایسی ہی باتیں سوچتی ہیں۔ انسانیت
بھی کوئی چیز ہے۔“

”میں بھی تو انرا انسانیت کہہ رہی ہوں۔“

”تو بس ٹھیک ہے۔ انسانیت تک رہنا۔ کیس محبت تک نہ پہنچ جانا۔ درجہ انجام برا ہوگا۔ رضیہ
لے بھایا۔“

”اچھا اب پہلے گی بھی کہ باتیں بنائے گی؟“

”فرا تیار ہوں۔“ رضیہ لہڑی۔

کوئی ڈیرہ دھکے میں رضیہ تیار ہوئی۔ اس کا سنہارا رنگ سبز سلاخی میں اور بھی ٹھکرایا تھا
ماؤں کے لپٹے جو سر کے اوپر سے سیدھے آئے تھے۔ اس کے شانوں پر کچا کر سنہرے جوڑوں میں تبدیل
ہو جاتے تھے۔ پ۔ انک کی چھاپ بہت گہری تھی۔ باقوت سے بھی گہری۔ سرخ۔ کچا کوہ کا سنی رنگ۔

اس میں جبکہ احساس سے رضیہ کے لب بڑے زہریلے معلوم ہوتے تھے۔ رضیہ اپنے لبوں کی وجہ سے ۲۰ خطرناک مہنگ دل کش بھی جاتی تھی۔

علم الکھڑا یونین کے دفتر میں پہنچ کر جہاد یونین روڈ پر واقع تھا۔ رضیہ عشرت اور رضیہ کو لے کر یہی یونین کے صدر کے دفتر میں گھس گئی۔

دیکھ کر انہیں کاملاً ہلکا کر گرجا سنگو تھا۔ گرجا سنگو کا چھریس تھا۔ ایک کھدہ پست تھا۔ اور سماجی فیلوں کا ہیرو کی رو چکا تھا۔ مگر کھدہ پہنچنے والے باغیانہ سیاسی خیالات رکھنے والے ہیرو کی قدر اس ماحول میں کہاں ہوتی۔ جو اپنے رنکر رکھاؤ میں۔ غرور معاشرت میں، لباس میں، فرنیچر میں، پلٹی میں، زندگی کے ہر شعبے میں ہلکی ڈنگی نکالتا تھا۔ تیوہ۔ ہوا کر گرجا سنگو آہستہ آہستہ سماجی فیلوں میں خیر قبول ہوتا گیا۔ شراب سے، منڈی بازی سے، خیت سے، سڑوٹن سے، یعنی ان تمام باتوں سے گرجا سنگو کو نفرت تھی جن سے فلم انڈسٹری کا ماحول متاثر تھا۔ مجبور ہو کر گرجا سنگو کو دھارمک تصنیف میں آنا پڑا۔

جہاں پیسے بہت کم ملتے تھے۔ یہاں بھی اپنی اتنا دماغ سے مجبور ہو کے وہ زیادہ دیر تک نہ ٹیک سکا۔ اور دیر کے دیر کے بے کار ہوتا گیا۔ اب گزشتہ تین چار سال سے اسے کسی ظلم میں بیروں کا کام نہیں مل رہا تھا۔ اس سے پہلے تو نہیں۔ لیکن اپنی بے کاری کے دنوں میں اُسے ایک محشر لوگوں کی یونین بنانے کا

خیال آیا۔ جب وہ خود ملاقات سے عبور ہو کر تقریباً ایکسٹرا ساجہ کے رہ گیا۔ قوال سے ان لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ لوگ جو تعداد میں ہزاروں تھے۔ مگر منظم بلکہ قطعی طور پر نرجاسی حالت میں تھے یہ لوگ شوڈو یوہ شوڈو یوہ کہتے تھے۔ اور ایکسٹرا ساجہ لوگوں کے گھروں پر چڑھ لگاتے تھے۔ کام کے لئے۔ نہ ان کا کوئی ریٹ بندھا ہوا تھا نہ ان کی کوئی خرت مقرر تھی۔ ایک ایکسٹرا ساجہ گویا ایک طرح

ان کی جان و مال اور عزت کا تحفظ دیکھ کر ایک فلم کہانی ایک ایجنٹر سبلائز کو فلم کے دوران میں ایجنٹر لوگوں کو سبھائی کرنے کا تحفظ دے دیتی اور پھر سبلائز کی مرضی سے انڈیاریٹنگ کے ان لوگوں

کلام دیتا کہنی سے چند روپے فی ایکٹر لیتا۔ اور سات روپے اور ہارٹا کسی کو سات دیتا۔ کسی کو پانچ۔ کسی کو دو روپے پر ہی ٹرغا دیتا۔ اور ایکٹر احمد توں کی تو اسی جی بڑی حالت تھی۔ انہیں کام کرنے کے علاوہ اپنی فرت بھی سپلائی کرنی پڑتی تھی۔ ایک ایکٹر اسپلائر نے درجنوں آکاشیں پال لی تھیں جیسے ڈوبے خانے میں مرغیاں پالی جاتیں ہیں۔ کبھی ایک کی آکشا غلطی سے یا غصے میں کڑکراتی ہوئی گئی دوسرے ایکٹر اسپلائر کے پاس چلی جاتی۔ تو راند میں روڈ پر دنگا شروع ہو جاتا۔ پھر یہاں اور چانر چلنے لگتے۔ جس میں ایک ایکٹر اسپلائر کا گروہ دوسرے اسپلائر کے گروہ پر شتم ہو کر حملہ کر دیتا۔ پولیس آجاتی۔ بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوتا۔

دارمیں روڈ کی بہادیاں ایکٹر انگوں سے تھی۔ اس سڑک پر چار شوڈ بوجھے ایک چھوٹے چھوٹے گینوں والا قوی بوٹل تھا۔ ایک مسجد تھی ایک شراب خانہ تھا، مگر مسجد کے زیر سایہ تھا۔ کچھ پانی کی دکانیں تھیں کچھ لاندھریاں، دونوں کی دکانیں تھیں۔ باقی سب دستوران تھے اور پنجابی سندھو تھے۔ اور سب کے سب میلے کھیلے گندے غلیظ۔ ہر دکان دار ایکٹر انگوں کو اُدھار دیتا تھا اور یہاں بورا دھندا اُدھار پر چلتا تھا۔ پانے کے پیڑے سے شراب کی بوتل تک ہر چیز کو پانے سے ملتی تھی۔ اور اکثر اوقات جب کوئی ایکٹر ابھاگ جاتا۔ یا ایکٹر اسپلائر دیوالیہ ہو جاتا۔ تو دکان دار کے ہاتھ میں صرف کوہی ہی کوہی رہ جاتے۔ ان دکانوں کے اوپر کے کمرے میں مختلف فلم کمپنیوں کی عکاسیاں لگی ہوئی تھیں۔ وی گرٹ لوصیاد فلم کمپنی۔ سردار جگت سنگھ المودالیہ کی کمپنی تھی۔ جنہوں نے جنگ کے دوران میں بھارتی کوگی سپلائی کر کے ایک چھوٹے سے ٹھیکے میں چالیس ہزار اکٹے تھے۔ اور اب وہ چالیس ہزار سے ایک فلم کمپنی کھولے ہوئے تھے۔

”ادب چنٹرا“ فلم کے کوئی تیراوی جی کھولے ہوئے تھے۔ جن کا باب مولے شے کی کے لئے ایک پھل چھوڑ گیا تھا۔ تیراوی جی اس مکان کو جس ہزاروں ٹھکانے لگا کے بنی تھے۔ اب یہ

ہیں، ہزارہی ٹھکانے لگ گیا تھا۔ لیکن اس دوران میں انہوں نے ایک فنی مقام، کنول سے کھائی پیلا
 کر لی تھی، کنول کے پاس دس ہزار نقد تھا۔ جسے اب وہ ٹھکانے لگانے کی سوچ رہے تھے۔ انہوں نے
 کپہنی کے لئے ایک نئی جگہ پر لکھنے کو دیا تھا: "کنول چتر"۔ داورین سڈ پختیاں بدلتی رہتی ہیں۔ اور جس
 تیزی سے فلم کپہنی کی تختیاں بدلتی ہیں۔ اس سے فدا کیم تیری پہنچ، دکاؤں کی تختیاں بدلتی تھیں۔ مگر
 بدلتی ضرور تھیں۔ کیوں کہ پورے کا پورا بازار فلم انڈسٹری پر زندہ تھا۔ اس لئے اس کی جتنی معاشرت
 اس کے صحیح سماجی نقطہ نگاہ۔ اور اس کے پورے سماج و مالی اور منسی اصول کی بحکاسی کرتا تھا۔ داورین
 روڈ پر کھڑے ہو کر آپ آدھے گھنٹے میں دیکھ سکتے تھے کہ ہڈیاں فی فلم انڈسٹری کی کیا حالت ہے۔ حالانکہ اس
 نے شوژ بوندی۔ داور اور بلا باہرلی سے لے کر لڈاؤ تک سیلوں میں تک پہنچے ہوئے تھے مگر داورین روڈ کے ہیں
 آدھے فروگ کے فاصلے میں آپ اس سیلوں میں دور پہنچی ہوئی حقیقت کو ایک جگہ دیکھ سکتے تھے۔

بہت آہستہ۔۔۔ بہت ہی دیر دیر سے۔۔۔ بڑے مبرا اور استقلال سے وہ کئی
 ایک ناکامیوں کے بعد گوراج نے ایچسٹر لوگوں کی یونین بنائی تھی۔ شروع شروع میں اسے بہت سی
 ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ ایچسٹر اسپلائر لوگوں کی طرف سے بڑی مخالفت ہوئی۔ کئی لوگوں نے اسے
 جان سے مار دینے کی دھمکی بھی دی۔ اس پر وہ ایک بار چاقو سے حملہ بھی کیا گیا۔ مگر گوراج بڑی خندہ
 پختیانی سے سب کچھ سہتا گیا۔ ٹھیک ہے، اپنے کام میں اسے مفاہمت کرنا پڑی۔ اپنے اصولوں سے
 بہت ہٹ کے یہ یونین بنانی پڑی۔ کیوں کہ یہ رو کر نئی صحیح یونین نہ تھی۔ اس میں ایچسٹر اسپلائر لوگ
 بھی شریک تھے۔ اس طرح سے کہ گوراجسٹر لوگ یونین کے کارڈ پر فلم کمپنیوں میں جاتے تھے۔ گوان کے
 ریٹ بھی بندہ گئے تھے۔ مگر اب بھی وہ ایچسٹر اسپلائر کی معرفت ہی جاتے تھے۔ اور شوژ بوندی اور فلم کمپنیوں
 والے اب بھی ایچسٹر لوگوں کا معاوضہ سپلائر ہی کو ادا کرتے تھے۔ ٹھیک ہے۔ سپلائر لوگوں کا کیشن اب
 بھی ان کے ریٹ کی طرح بندہ کیا تھا۔ مگر چونکہ رقم کمپنی سے سپلائر کو ادا ہوتی تھی۔ اس کا پلہ ہمیشہ

بھاری رہتا۔ وہ کبھی کہتا۔ رقم نہیں ملی۔ کبھی کہتا کم ملی ہے۔ کبھی کہتا اتنے لے جاؤ۔ اتنے گئے رہتے ہو تو لے جاؤ۔ نہیں تو یہ بھی گئے۔ اور عورتیں، جو نظر نہیں دے کر تو کچھ بہتر حالت میں تھیں اور جو ریفیک کی طرح بدمن کے کھڑے پر بھروسہ کرتی تھیں وہ دھٹکے کھاتی تھیں۔

اور سپلاؤنگ اور کپنی کے لوگ اور سٹوڈیو کے لوگ یعنی سب لوگ ان سے ناخوش رہتے تھے۔ اور کبھی ٹھک بھی ہے۔ بے عقل، بے دماغ، بے وقوف بھری جیسے لوگ عورت کہتے ہیں۔ آخر کس لئے ہے؟ گجرانج سنگھ کو ان تمام غامیوں کا پتہ تھا۔ مگر وہ کہتا۔ دیکھو، اتنا تو ہوا، اب ہوسے ہوئے اس سے آگے بھی کچھ جو جائے گا۔ ایک دن میں تو کبھی نہیں بن سکی۔ ایک دن میں تو رام نے بھی سیتا کو دن سے نہیں جیت لیا تھا۔ پھر — میں تو ایک معمولی آدمی ہوں ۛ

گجرانج نے رضیہ کو دفتر کے اندر آتے ہوئے دیکھ کر زور کا قہقہہ لگایا۔ اور اُسے کاغذ کا ایک پتہ دکھا کے کہنے لگا: ایک اور کپنی تیرے ہاتھ سے گزری۔
 ”کیا ہوا؟“ رضیہ بڑے مطمئن لہجے میں بولی۔

”یہ چند اہلکار پر واکشن والوں کی طرف سے نوٹس آیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اُن کی کپنی میں ایکسٹرا لوگوں کو بھیجے وقت رضیہ کو کبھی بھرتی نہ کیا جائے ۛ
 رضیہ سکرٹری نائب تک کوئی پندرہ کپنیاں اُسے اپنی بلیک اسٹ پر رکھ چکی تھیں۔ گجرانج نے رضیہ کو بھلاتے ہوئے کہا: ”تو ایسا کیوں کرتی ہے رضیہ؟“

مگر رضیہ کیا بڑا کرتی تھی۔ وہ بھی کرتی تھی نا۔ کہ جب کبھی اُسے کسی فلم کپنی میں کام ملتا اور چونکہ وہ بہت خوب صورت تھی۔ اس لئے اُسے جلدی کام ملی جاتا۔ اور پھر ڈائریکٹر اُسے انتخاب کرتے جو اُلگ سے اپنے کمرے میں بلا کر اُسے ایک بہت عمدہ۔ بہت انچائمی میں بیروئن سے کچھ ہی کہ بجے کا رطل دینے کا وعدہ کرتے۔ اگر! اور اب اس ”اگر“ کے نو دم ہی جواب ہو سکتے تھے۔ یعنی ایک تو جوتا

پھر وہ کمرنگ سٹرو سے مخالف ہونے لگی۔ لڑنے پندرہ روپے۔ لڑاکا خوب صورت ہے۔ مگر کویت ہے۔ مگر وہ اس کی مادری زبان ہے۔ اول وجہ کا کارڈ بنا دو۔ تمہیں زندگی بھر دعا دے گا۔

کارڈ لے کے عشرت باہر نکلا۔ تو رضیہ نے اس کا تعارف دو چار دوسرے بکھر جائیں سے کرادیا۔ اور پھر شکر کے رضیہ سے کہنے لگی: وہ تو بہار پر دوشن والوں نے بلایا ہے۔ انہیں ڈانس کی کچھ لڑکیاں چاہئیں۔ چلو۔
رضیہ نے عشرت سے کہا: میں ملتی ہوں۔ اب تم خود گھر آ جاؤ گے نا؟
”ہاں!“

رضیہ جب چلنے لگی۔ تو عشرت اس کے پیچھے دھڑا دھڑا گیا۔ رضیہ نے پوچھا: کیا بات ہے؟ کیا ایک عشرت خاموش کھڑا رہ گیا۔ رضیہ نے پھر پوچھا: کیوں برو کیا بات ہے؟ آخر بڑی مشکل سے عشرت نے کہا: ”وہ میں کا کراہی۔“
رضیہ نے عشرت کو ایک اٹھنی دی، یعنی دیتے ہوئے رضیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”بے چارہ!“
بعد میں میں میں جینو کرو بہار پر دوشن کی طرف جاتے ہوئے رضیہ نے رضیہ سے کہا: ”کم نعت پر زیادہ ترس نہ کیا کر۔ مر جائے گی۔“

”کیا کروں؟“ رضیہ بولی: ”مجھے لے جاوے پر بٹارم آتا ہے۔“

رات کو جب رضیہ ڈانس کی ریہرسل کے بعد گھر لوٹی تو عشرت ابھی تک آیا نہ تھا۔ مالدار لیارہ بچ چکے تھے۔ رضیہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔ کہاں گیا۔ بھی میں تو وارہ ہے۔
لیا ہو۔ مگر یہاں پہنچی نہیں۔ پھر اس کے دل میں رضیہ کی باتیں گونسنے لگیں عجیب عجیب طرح۔

دوسرے اور شیعہ دل میں آنے لگے۔ رضیہ ٹھیک ہی کہتی ہے۔ ان مردوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ بارہ بج گئے۔ ایک بج گیا۔ دو بج گئے۔ رضیہ فرش پر بیٹھی اپنے کمرے میں انتظار کرتی رہی۔ ایک کونے میں اس نے عسرت کے لئے سجی اور چادر بچا دی تھی۔ فرش کو خوب بھاڑوں سے صاف کیا تھا۔ ٹبے میں اس کا کھانا بند کر کے رکھ دیا تھا۔ آٹا کو روشنی میں خیند نہیں آتی۔ اس لئے اس نے بجی گل کر دی تھی۔ مگر رضیہ کی آنکھوں میں خیند نہ تھی۔ بھلا خیند کیوں نہیں آتی۔ وہ کیوں ایک اجنبی کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ کون ہوتا ہے اس کا۔ وہ تو کچھ بھی نہیں جانتی اس کے متعلق۔ جلنے سے کیا ہوتا ہے۔ اسے اپنے متعلق اتنا کچھ معلوم تھا۔ ایک شریف مسلم گھر نے کی بیٹی۔ باپ چھوٹا سا جاگیر دار۔ مگر میں ایک موٹر۔ آبا کے ہاں لڑکا کوئی نہ تھا۔ پہلے ایک لڑکی ہوئی جو میاں دی گئی۔ پھر بہت مدت کے بعد رضیہ ہوئی۔ مگر آبا نے مجھے لڑکا ہی سمجھا۔ ہمیشہ لڑکوں کی طرح ہی دکھا۔ فقیص میں اور پاگلے میں اور ترکی ٹالیا میں۔ مجھ سے مردوں کی طرح باتیں کرائیں۔ پھر آبا مر گئے۔ وہ موٹر بھی چلی گئی۔ وہ مکان بھی چلا گیا پھر بڑی بہن کا شوہر مر گیا اور آٹا رضیہ کو اور بڑی بہن کے پانچ بچوں کو لے کر حیدر گورڈہ کے ایک چھوٹے سے غلیظ مکان میں چلی آئیں جس کے آٹھن میں جام کا ایک پیڑ تھا۔ آٹا نے ایک بہت ہی خوب صورت مرد سے رضیہ کی شادی کر دی۔ اسلام آنکھوں میں نہیں تھا۔ اب ایک بڑے جاگیر دار کا لڑکا تھا۔ اچھا ہے، شادی اپنے خاندان میں ہوئی۔ لڑکا اپنے خاندان کا ہے، گوا اور ہے۔ بڑپن ہے۔ اور بے کار ہے۔ مگر بے تو اپنے خاندان کا۔ خاندان کی عزت رہ گئی۔ آٹا نے بڑا شکر ادا کیا اور کسی کسی دغا کی ہے۔ اللہ اس جوڑے کو خوش رکھے۔ چند دن تو یہ جوڑا غوش ہی سا۔ مگر پھر پولیس انکشن ہو گیا۔ اور اسلام کے پاس چونکہ کوئی کام نہ تھا۔ اور اس لئے وہ رضا کا دل میں بہتا رہ گیا تھا۔ اس نے پولیس انکشن میں وہ شہرت باہر بھاگ گیا۔ تندو مٹی میں۔ مگر تندو مٹی میں بھی پولیس انکشن ہوا۔ چنانچہ اسلام مار گیا۔ مگر والوں کو اس کی لاش نہیں ملی، مگر موت کی خبر مل گئی۔ رضیہ

بہت بدلتی دھڑکتی۔ حالانکہ مرنے سے چند ماہ قبل اسلم نے اُسے ایک بہت ہی بڑی "خفیہ" بیماری عطا کی تھی۔ جو وہ کسی "باہر والی" سے لے کے آیا تھا۔ رضیہ تو کل شرکے کو لڑکھو گئی ہوتی۔ مگر اب اس کو ہر وقت پتہ نہ چل جاتا۔ اور حیدر کو لڑکے کے حکیم سلطان صاحب الزماں ہمدردی اس کا شافی علاج نہ کرتے۔

پھر کبھی اتنے علاج کے بعد بھی رضیہ کی رجحت جو پہلے گندی تھی، اب ساقوں ہی ہو گئی تھی اور اس کے چہرے پر اکثر دانے سے نکل آیا کرتے تھے..... پھر کبھی "۔۔۔ رضیہ اپنے خاوند کے مرنے پر روئی تھی۔ کچھ بھی ہو اس کا خاوند جو تھا۔ اور لوگ کہتے تھے کہ اسے رونا چاہئے۔ حالانکہ اندر سے اسے اپنے خاوند سے سخت نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔ وہ روئی، اور پھر اسے فائے بھی کرنے پڑے۔ کیوں کہ وہ لوگ عزت دار تھے۔ اور پولیس انجیشن کے دنوں میں اور اس کے بعد بھی کئی دنوں تک گھر سے باہر نہ نکلے۔ آنگن میں جام کا بیڑ تھا۔ رضیہ کو یاد ہے۔ کئی بار سالن نہ ہونے سے اس نے فشک روئی کے ساتھ جام کے پھل کھائے تھے۔ پھر جام بھی ختم ہو گئے۔ اور گھر میں کچھ نہ رہا تو۔۔۔ ایک دن۔۔۔ بلکہ ایک شب رضیہ گھر سے نکل بھاگی۔ اور سید کی ایک طوائف کے پاس پہنچی۔ کیوں کہ وہ ایک شریف عزت دار گھرانے کی عورت تھی۔ اور اس نے اُسے کوئی کام نہیں آتا تھا۔ نہ وہ چاول کوٹ سکتی تھی۔ نہ برتن صاف کر سکتی تھی۔ اس نے وہ سیدی طوائف کے پاس گھٹی۔ اور پھر جب اُس نے ٹھاکہ کو دیکھا تو لوٹ آئی۔ جانے کیا ہوا۔ کیوں اس کی مدد نے اس کے جسم نے اس کی بستی کے ذرے ذرے لے اس کام سے ایسی بغاوت اختیار کر لی کہ رضیہ بھور ہو کر روئی ہوئی وہاں سے واپس آ گئی۔ اُسے معلوم ہو گیا۔ کہ وہ یہ پیشہ اختیار نہیں کر سکتی۔ اور جب اس نے یہ دیکھا کہ وہ کتنی عورتوں کا یہ دھند بھی نہیں کر سکتی تو پھر وہ اپنی اُمّ کے صانع مشہد کے خلاف پردے سے باہر آ گئی۔

باہر کی دنیا میں! اس نے سوچا۔ وہ مردوں کی دنیا میں عورتوں کے لئے جگہ بنائے گی۔
 اس نے کہ اسے زندہ رہنا ہے۔ اور چونکہ اب وہ طواغیت بھی نہیں بن سکتی تو اسے لامحالہ ایک نئی
 عورت کی طرح رہنا ہوگا۔ کوئی نہ کوئی کام کرنا ہوگا۔ مگر حیدر آباد میں نہ کراچی پر اوری کے اصولوں کو
 توڑ کر۔ وہ براوری جو اس کے لئے کچھ کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ رہ کیسے سکتی تھی۔ کام کیسے کر سکتی تھی
 پھر بھی ریڈیو پر اسے کچھ کام مل گیا۔ اہل ریڈیو پر اس کی واقفیت پولیس ایجنٹ کے دنوں میں ہوئی تھی جب
 اس نے اپنے خاوند کی تقلید میں ریڈیو پر ایک ڈرامے میں کام کیا تھا۔ اور حیدر آبادی زبان میں مردار
 پیشیل کے خلاف ایک فخر بھی لکھا تھا۔ قیمت ہے کہ اب ریڈیو والوں کو اس کا کچھ پتہ نہ تھا کیوں کہ بہت
 سے پُرانے لوگ چلے گئے تھے۔ اور نئے لوگ آگئے تھے۔ اور یہ نئے لوگ کہتے تھے۔ غدا اپنے خوشامد
 تھی کہ حقیقت کہ اس کی آواز بہت اچھی ہے۔ اس لئے اس نے چند ماہ ریڈیو پر کام کیا۔ اور جب یہاں
 بھی ایک صاحب نے اُس سے محبت ظاہر کی۔ جین کا شعلہ ہی محبت ظاہر کرنا تھا۔ اور جو محبت سے اپنا
 جی اس طرح بہلاتے تھے۔ جیسے لوگ فرصت کے اوقات میں باکی۔ فٹ بال۔ گیند یا چوسر سے اپنا جی
 بہلاتے ہیں تو رنیر کو اس محبت کے لحاظ سے ایک عجیب کراہیت سی پیدا ہوئی! اس کی دلوں میں بھی یہی
 محبت کا زہر باقی تھا۔ جو اس کے شوہر نامدار نے اُسے دیا تھا اتنی جلدی وہ کسی دوسری جگہ کیسے
 محبت کر سکتی تھی۔ ناچار رنیر کو حیدر آباد چھوڑ کر کبھی آنا پڑا۔ اور فلم کمپنیوں کا سہارا لینا پڑا۔

جاگتے جاگتے صبح ہو گئی۔ اس رات رنیر نے اپنی ساری زندگی بھر سے چڑھ ڈالی جسے وہ کئی
 بار بڑھ چکی تھی۔ وقتی طور پر اس کے دل میں جو لوزش پیدا ہوئی تھی اچھ کے کہنے میں جو ایک آنسو سا
 چھلایا تھا اندر میرے میں کہیں سے جو روشنی کی ایک کرن آتی تھی۔ اس کے بازو دس میں جو ایک
 اُمید سی کھسائی تھی۔ بچاؤ کہ وہ اس کے اعصاب میں ٹوٹ ٹوٹ سی گئی۔ وہ اپنے جسم کے بند بند
 میں اُسے لٹاتا ہوا دیکھ سکتی تھی۔ سن سکتی تھی، چمک سکتی تھی۔ ہائے کشادہ دالہ تھا۔ مگر زندگی تو ہوتی

ایسی ہی ہے۔ ہزاروں آدمیوں کی زندگی۔ لاکھوں کروڑوں آدمیوں کی زندگی۔ خوب صورت سہنا تو ایک انحرافی کی طرح جوتلے۔ اور سر سے پاؤں تک سارے اعضاء کو چھوڑتا ہوا چلا جاتا ہے مگر چلا جاتا ہے۔ اور پھر کبھی نہیں آتا۔ عشرت کی طرح۔
 رقیہ کا جسم گندے آنے کی طرح کچا کچا سا ہو رہا تھا۔
 یکایک دروازے پر دستک ہوئی۔
 آنان نے دروازہ کھولا۔

عشرت دروازے پر کھڑا تھا۔۔۔۔۔ مسکرانا ہوا۔ جھبکتا ہوا۔ اندر آیا۔ سیدھا رقیہ کے پاس۔ اس کے چہرے پر میک اپ کے نشان تھے۔
 عشرت نے کہا ”مجھے رات کے لئے ایک میک اپ لگایا تھا بولنے کا پارٹ تھا۔ بہتر لپے کا۔ پہلے نے پانچ روپے کھانے کے لئے ایڈوانس دئے۔۔۔۔۔“ عشرت ترک گیا۔ پھر اس نے اپنی میرپلا میں سے ٹٹول ٹٹول کر پانچ روپے کا ایک ٹمٹانا بوسیدہ سافوٹ نکالا۔ اور اسے رقیہ کے ہاتھ میں نظریں نیچ کر کے دے دیا۔

رقیہ کا دل کانپنے لگا۔ اس ہلکے سے کمزور ٹوٹ کی طرح۔ جو اس کی آنکھوں میں کانپ رہا تھا۔ اس کے رد میں روئیں میں خوشی کی لہریں دوڑ گئیں۔ اس کا جی چاہا۔ کہ وہ عشرت کا سر جھکا کے اپنے سینے پر رکھے۔ جواب اس طرح ایک گناہ گار کی طرح اس کے سامنے آتھیں۔ بچے کے کھڑا تھا۔ مگر اس نے اپنے آپ پر ضبط کر لیا۔ اور بڑے تحمل سے بولی ”تمہارے لئے کھانا رات بھر سے رکھا ہے“ اس کے بعد چوٹے کی طرف کھانا گرم کرنے کے لئے چلی گئی۔

جب اکرم کے دن اپنے تھے۔ وہ کار میں رہتا تھا۔ کماریں اس کے پاس چار کر رہے
 کا ایک عمدہ فلیٹ تھا۔ فلیٹ میں غلیچے تھے۔ عمدہ فرنیچر تھا۔ ریڈیو گراموفون، ریفریجریٹر، ٹیلی فون، چاندی کے
 برتن، کتابوں کی لائبریری۔ سبھی کچھ موجود تھا۔ اس کی بادامی رنگ کی ڈائج اُسے اپنی جان سے بھی پیاری
 تھی۔ مگر جب اس کی تصویریں ناکام ہوئیں۔ اور جب پینٹریوں میں۔ ڈسٹری بیوٹروں اور فنانسروں نے
 اس کی سماجی مقصدیت کو روپے کے ترازو میں تولاد۔ اور اس میں بہت کم وزن پایا۔ تو انڈسٹری نے
 دھیرے دھیرے اُس سے ہاتھ کھینچ دیا۔ دھیرے دھیرے اس کی فلیٹ کی چیزیں جنہیں اُس نے شہائی
 شوق سے خریدا تھا۔ قرضے میں اُٹھنے لگیں۔ ریڈیو گرام گیا۔ ریفریجریٹر گیا۔ چاندی کے برتن گئے۔ آخر
 میں ڈائج کھڑی بھی گئی۔ کتابیں اس نے آخر تک بچا کے رکھیں، مگر جب وہ فلیٹ کا کرایہ دس ماہ تک
 مسلسل نہ دے سکا تو ایک مکان نے جو غیر معمولی طور پر شریف تھا۔ اس کی کتابوں کی لائبریری اپنے
 قبضے میں کر لی، اور اسے فلیٹ سے نکال دیا۔ اور اس سے کہہ دیا کہ جب بھی وہ فلیٹ کا کرایہ
 ادا کر دے گا۔ اُسے اُس کی کتابوں کی لائبریری واپس مل جائے گی۔

اس بات کو آج دو سال ہوئے کو اُسے۔ اکرم ابھی تک اپنی کتابوں کی لائبریری نہ چھوڑ سکا

تھا۔ اپنی کتابوں کے چھپ جانے کا اُسے انتہائی غم تھا۔ اب وہ گھارے پرل میں آگیا تھا۔ جہاں اس کی بڑی بہن رشیدہ جو یہودی تھی اور مسلم کرل اسکول بانی کھلا میں اسی روپے میں بچر تھی۔ اپنے تین بچوں کے ساتھ ایک کمرے میں رہتی تھی۔ جبکہ بہت کم تھی۔ کیوں کہ اسی کمرے میں بچے سوتے تھے رات بھر اڑتے اور پڑتے تھے۔ اسی کمرے میں رشیدہ کھانا پکاتی تھی۔ اپنے بچوں کے کپڑے سیتی تھی۔ کپڑے دھوتی تھی۔ کمرے کے کونے میں ایک ٹی تھا جس کے گرد دو فٹ اونچی دیوار تھی جو پرے کے لئے لٹا ہوتی تھی۔ ناچار رشیدہ نے پردہ ٹانگ کر کچھ تھوڑا سا انتظام کیا تھا۔ کمرے سے لگی ہوئی ایک بالکونی تھی۔ اگر وہی بالکونی میں سوتا تھا۔ یہیں پر اس نے اپنے کپڑوں کا ٹرنک اور چند کتابیں ایک ریک پر رکھ لی تھیں۔ بالکونی میں کھلی ہوا آتی تھی۔ اور سونے کے لئے بہت عمدہ جگہ تھی۔ اور اس کے سامنے کی بلڈنگ کی دو جنوں ایسی بالکونیاں تھیں۔ جہاں زندگی۔ اس کی اپنی زندگی کی طرح دھڑے اور پرنگی یا سرت ایک بنیان پہنے ہوئے نظر آتی تھی۔ آدمی کپڑے پہن کر کچھ اور ہی بویا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اُس کے احساسات اور خیالات اور جذبات نے بھی ایک غلامت پہن لیا ہو۔ لیکن بالکونی میں آدمی کپڑے اُتار کر خالی ایک بنیان اور تہہ پہنے یا ایک باڑی یا بچی کوٹ پہنے۔ گرمیوں میں پتھلا جھلٹے ہوئے یا برسات کے دنوں میں ٹاٹ کا بویا یا بندھے ہوئے کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔ دوسرے انسانوں کے ساتھ قریب اس قدر بے شکم طور پر ساری کو اُسے حیرت ہوتی تھی کہ آج تک کسی صبح کو انسانی مساوات کا ثبوت دینے کے لئے بالکونی کی مثال دینے کا خیال کیوں نہیں آیا۔ جہنم کی بالکونی میں ایک فلسفی رہتا تھا۔ پانچ نمبر میں ایک بل مزدور رہتا تھا۔ چار نمبر میں وہ خود ایک فلم ڈائریکٹر رہتا تھا۔ تین نمبر میں ایک ٹریڈی رہتا تھا۔ دو نمبر میں ایک اخبار بیچنے والا رہتا تھا۔ ایک نمبر میں ریلوے کا ایکسٹنٹیو رہتا تھا۔ لیکن جب یہ لوگ بالکونی میں تہہ یا دھوتی پہنے۔ بنیان یا بنیان کے بغیر کھڑے ہوئے تھے یا اپنے بڑے بچوں سے باتیں کرتے تھے یا دانت لٹختے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ تو اس قدر ایک ہی صف میں

اُٹھڑے ہوئے دکھائی دیتے تھے کہ امتیاز سن توڑٹ جانا تھا۔ پتہ نہیں سیاست دانوں نے جنگ کے بجائے مزاح سے فاسزم کو ختم کرنے کا طریقہ کیوں نہیں سوچا۔

بالکونی کے مناظر دیکھتے دیکھتے اکرم کا پنختہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ اگر کسی طرح جٹل کو نچکا کر کے یا اُسے صرف ایک بیان اور ایک لنگوٹ یا تہہ پہن کے ایک بالکونی میں کھڑا کر کے لاکھوں آدمیوں کے سامنے نظر پر کرنے کے لئے کہا جاتا۔ تو فاسزم اسی دن ختم ہو جاتا۔ لوگ ہنسنے ہنسنے مہرے ہو جاتے۔ اور جب وہ اپنے سینے کے اُلجھے ہوئے بالوں پر اپنا ہاتھ رکھ کے اپنی بھر مار کو بوجھ کو ہلاتے ہوئے یہ کہتا جرسن آریائی نسل دنیا کے انسانوں کی بہترین نسل ہے۔ تو خود جرسن لوگ ٹٹاڑ اور گندے انڈے پینک پینک کے اس کا بُرا حال کر دیتے۔ مصیبت تو یہ ہے کہ اس قسم کی باتیں جیسے ٹرے بچے چوئے پیٹ فارمولہ پر بیان کی روشنیوں میں۔ درجنوں انگریزوں کے سامنے تھے کلکے لگے فوجی وردیوں سے ملبوس سینوں سے نکلتی ہیں۔ پھر میڈیکل تھیں۔ مارچ ہوتے ہیں۔ ٹینک چلتے ہیں۔ لاکھوں آدمی قتل ہوتے ہیں۔ پھر کہیں جاکے ریفرنڈم دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کام کے لئے صرف ایک بالکونی کافی ہے نہاد جانے انسانوں کو کب عقل آئے گی؟

مگر آج تو وہ خود یہ سب کچھ نہیں سوچ رہا تھا آج تو وہ خود بالکونی میں اونٹن دھانسنے کے جٹیا تھا اور رشیدہ اُسے دور سے آکے جگائی تھی۔ وہ اولیٰ آل کر کے پھر اونٹن دھا ہوا تھا۔ رشیدہ ایک ڈوبی پتی عورت تھی۔ رنگت بے حد زرد۔ لیکن آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ۔ اُن آنکھوں کو دیکھ کر ایک عجیب قسم کی بخیرہ فرحت کا احساس ہوتا ہے۔ ہونٹوں کے کنارے ہر وقت مسکراتے رہتے ہیں۔ مگر کوئی بے فکر مسکراہٹ نہ تھی یہ تو ایسی مسکراہٹ تھی جس نے دنیا کے سارے غم دیکھ کر اس پر رونے کے بجائے ہنسا سیکر دیا ہو۔ یا شکر کرنا سیکر دیا ہو۔ رشیدہ کا لہجہ بڑا ملائم تھا۔ اور غلیظ تھا لیکن اس لہجے کے اندر کتنے تیز کاٹنے چھپے ہوئے ہیں۔ اس کا احساس بہت ہی ذہین لوگ

کر سکتے ہیں۔ اور کبھی کبھی وہ بھی آئے کہ کہہ کے رہ جاتے، کیوں کہ انہیں بعد میں پتہ چلتا کہ رشید چلے گئے۔
 ملائم اور نرم لہجے میں کسی تیزیات کہہ گئی۔

رشید نے پوچھا: ”دور تر جھگڑا کی ہوں آگے اُٹھو گے نہیں؟“
 ”نہیں!“ اکرم دین پاگلونی میں اندھا پاڑا پڑا ہوا۔

”جوشی جی کی بچہ کا جھوٹ ہے اس لئے؟“

”کیا مطلب؟ کیا مطلب؟“ اکرم جلدی سے اُٹھ کر بولا ”مگر رشید نے کوئی جواب نہ دیا، اس وقت اپنی دلی ہوشیاری اور قیاس نگاہ پر ناگہان ہی تھی، اور اب نئے جیل کوئی پرہیز کرنے کے لئے جاری تھی۔

رشید نے کچھ نہیں کہا۔ مگر یوں تو اس نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ وہ واقعی آج بستر سے اُٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ جوشی جی کی بچہ کا جھوٹ تھا۔ گو سیٹھ ہاتھ ملنے اس کی بچہ کا جھوٹ کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر۔ وعدہ جلتے کب سے مٹتا آ رہا تھا۔

”اور جلتے کب تک ٹلے؟“ رشید نے پوچھ کر بولے ”کیا؟ کیا؟“ اکرم نے غور سے ہو کے کہا۔ رشید کبھی کبھی اس کے اُٹھنے ہوئے خیالات کو یوں پڑھ لیتی تھی۔ جیسے وہ آدمی نہ ہو بلکہ کھلی ہوئی کتاب ہو۔

اکرم نے کہا ”تم چلے بناؤ۔ میں ضرور جاؤں گا“

رشید کبھی بھی چاہتی تھی۔ مگر نہیں چاہتی تھی کہ اسے یوں صاف صاف کہنا پڑے۔ اس نے جلدی سے چلے تیار کی۔ بستے میں اکرم بھی ہاتھ منہ دھر کر قیاس اندازہ کرتا رہا ہو گیا۔ جب اُس نے چلنے لگی۔ تو رشید نے ایک اٹھنی اس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔

اٹھنی کو دیکھتے ہی اُسے یاد آیا کہ کتنے دنوں سے وہ رشید سے وعدہ کر رہا تھا کہ وہ بیٹھے

اپنے گھر کے لئے کچھ رقم مانگے گا۔ مگر وہ کیا کرے۔ اس کی پچھری شروع نہیں ہو رہی تھی۔ اور جب تک پچھری شروع نہ ہو جائے۔ وہ سیٹھ سے رقم مانگتے ہوئے ٹوٹتا تھا۔ شروع شروع کے تین چار ماہ تو اس نے تنخواہ مانگ لی تھی۔ لیکن اب گزشتہ پانچ ماہ سے اس نے سیٹھ سے ایک پائی طلب نہیں کی تھی پہلے تو یہ خیال رہا کہ سیٹھ خود سے دے دیجے گا۔ اور جب سیٹھ نے تنخواہ نہ دی تو اکرم نے سوچا اچھا ہے۔ سیٹھ میری پچھری کسی طرح شروع کر دے۔ پھر کتنی رقم مانگ لوں گا۔ اب پچھری بھی شروع نہیں ہو رہی تھی۔ اور تنخواہ بھی نہیں ملتی تھی۔ ایسے کیسے کام چلے گا۔ رشیدہ کی نگاہ کہہ رہی تھی۔ تو کب تک بہن کے آسرے پر...؟
 ”نہیں نہیں“ اکرم بولا میں آج ہورت کے بعد ضرور سیٹھ سے بات کروں گا۔

رشیدہ کچھ نہ بولی۔ کئی بار اکرم نے ہتھ کیا تھا وہ سیٹھ سے بات کرے گا۔ مگر بات کو وہ اس طرح نہ نکالے ہوئے واپس آجائے گا کہ رشیدہ بھر کچھ نہ کہہ سکتی۔ کاشش اب کچھ کہہ سکتی۔ کاشش اس نے زندگی کو اس طرح نہ سمجھا ہوتا۔

کسی فنریہ مسکراہٹ تھی رشیدہ آپاکی! جیسے کسی نے زندگی کے سارے دکھوں اور تکلیفوں مصیبتوں اور صعوبتوں کو کشید کر کے اُن کا عطر نکال لیا ہو۔ اور اُسے ایک دلکش بٹم کی صورت میں رشیدہ کے ہونٹوں پر پھیلا دیا ہو۔ ایسی بھی بھلائی مسکراہٹ ہوئی۔ اکرم بھی کبھی تو اس سے پریشان ہو جاتا۔ مجھے مسکراہٹ قطعی پسند نہیں۔ اس قدر سوچو بوجھ رکھنے والی۔ ہر بات فوراً سمجھ جالے والی جیسے تو تنہا کی مسکراہٹ پسند ہے۔ اُنھل، فروغی، سلی۔ بے فکر مسکراہٹ، فضا میں اڑتی ہوئی تخیلی کی طرح شونخ اور خوش رنگ۔ یہ مسکراہٹ۔ جو کچھ سوچتی ہی نہیں۔

رشیدہ نے کہا ”ہورت میں ضرور جاذبہ شہاوت کی دہاں ہوگی؟“

اکرم نے پھر چونک کر اپنی بہن کی طرف دیکھا۔ رشیدہ پلٹ کر اپنے نتھے جیسے معصوم کو نماں اڑھانے لگی۔ معصوم کے دو ذراں پھیپھڑوں میں غمزہ مزاحیت کر چکا تھا۔ وہ بڑی شخص سے کما حقہ اس رہا تھا اکرم مرحوم کے

کرے سے باز رہ گیا۔

”وہ کیوں بدل نہیں سکتا؟ وہ کیوں ”لڑکا یا لڑکی؟“ دنیا گول مٹول ہے، ملت مسخرے ایک بڑی نہیں بنا سکتا۔ وہ کیوں پہلی ملاقات ہے۔ دوسری کرامات ہے، ایسے معرعے نہیں سوچتا۔ وہ کیوں انسان کی بھلائی کے چھپے ٹوٹے گوم رہا ہے۔ وہ کیوں اپنی بھلائی کی نہیں سنا وہ کیوں لڑکیوں کو لے کے جوہر نہیں جاتا۔ وہ کیوں اس قدر خشک، متین اور سفیدہ بنا رہتا ہے کہ لوگ اُسے سوکھا ہوا لکڑی کہنے لگے ہیں، دنیا میں کیا وہی ایک انڈ کچوئل رہ گیا ہے۔ ٹٹے ٹٹے گنچسوں والے اوندھے داغوں والے۔ انٹی کو پڑیوں والے انسان یہاں بستے ہیں۔ جن کی تجزیوں میں بھی لاکھوں دوسرے ہیں وہ کیوں سماج کی بھلائی کے لئے تصویریں نہیں بناتے، صرف تجلی چھوڑی بے چھپاتیں کر کے پھلنے والی عرسلی اور کوٹے مشکافے والی کلاوے کر اپنا گھر بھر رہے ہیں۔ اور ایک تم ہو میں اکرم کہ سارے جہاں کا وہ اپنے دل میں لئے فلتے کر رہے ہو۔ میاں کچھ عقل کے ناخن کو....

وہ ملتے میں ایک راہ گیر سے ٹکرا گیا۔ راہ گیر گھور کے اُسے دیکھنے لگا۔ اکرم نے جلدی سے کہا ”ساری“ ”ساری کا تپہ؟“ راہ گیر غصے سے چلایا۔ مگر اکرم آگے بڑھ گیا۔ بات یہ ہے کہ اس سماج میں روکے اُسے اس سماج کے اصول کے مطابق کام کرنا ہو گا۔ اس قسم کی باتوں کے لئے جس قسم کی سیاسی۔

کی ضرورت ہے وہ اس انڈسٹری میں قطعی نہیں۔ پھر خالی تصنیف سے دور۔ کیا کوشش کیوں کر رہا ہے۔ یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے، جوشی جی کی طرف دیکھو دم فوشروں جو بنگی۔ ان ڈومو کا مہور ست کر رہے ہیں۔ تین تین ہیروئنیں کو ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ اور ایک جناب اکرم ہیں کہ قوم کے غم میں بگڑے جاسے ہیں۔... چکر۔... چکر۔... اکرم نے سوچا چکر کیا نام ہے؟ عمو بڑھیا۔ ایک دم ہٹ! اکرم خوشی سے اُجھل پڑا۔ اور اچھلتے ہی کپلی کے کعبے سے ٹکرایا۔ اس پاس کے راہ چلتے ہوئے لوگ اس پر بس پڑے۔ وہ تو خیر رہے ہوئی۔ دلچیت ٹوڈو قریب آ گیا تھا۔ اکرم جلدی سے اپنی خت چھپائے ہوئے

ہاتھ سے اچھے کر رکھتے ہوئے دلچسپ ٹیوٹریل کے گیٹ میں داخل ہو گیا۔

اکرم کو سرخیا کر کے چلنے کی بہت بُری عادت تھی۔ چلتے ہوئے آگے بچھے کچھ نہیں دیکھتا تھا اس اپنی دُمن میں غرق چلا جا رہا ہے۔ اکرم نے سوچا اب اسے اپنی زندگی کا سارا دُعا رابل دینا پڑے گا۔ آج سے وہ سُرُخا کے چلے گا۔ بڑے بڑے کے باتیں کرے گا۔ منہ پر گھونٹہ مار کے گالیاں بک کے پروڈیوسر کو مزہب کیا کرے گا۔ یہ لوگ خرافات سے بنے والے نہیں ہیں۔ ان کے سامنے تو اسے دوسرا جوشی بھی بننا پڑے گا۔

شیخ نمبر تین میں مہورت تھا۔ مہورت میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔ مگر شیخ غلم خاں کی طرف سے پروڈیوسروں، فنانشروں، ڈسٹری بیوٹروں، دلالوں، ایکسٹرا کام کرنے والوں اور بچنے بچنے والے روٹ کھنے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ فلم انڈسٹری میں ہر روز کہیں نہ کہیں مہورت ہوتا رہتا تھا۔ اس لئے بہت سے بے کار لوگوں نے یہی مشغلہ اختیار کر رکھا تھا کہ صبح کا ناشتہ مہورت پر جا کے کریں گے۔ لڑو تو کھانے کو مل ہی جائیں گے۔ یہ لوگ مہورت سے کہلاتے ہیں۔ اور کوئی بھی مہورت جو کہیں بھی مہورت ہو۔ انہیں کارٹوٹے نہ ملے۔ وہاں ضرور کچھ جاتے ہیں۔ بلکہ زیادہ تعداد انہیں مہورتیوں کی ہوتی ہے۔ مہورت کی مدافعت انہیں کے دم سے ہے۔ ورنہ کام کے آدمی تو دس بارہ ہی ہوتے ہیں۔

مہورتیوں کی ٹولیوں میں گزرتے ہوئے سیٹھ باگھو یا اکرم کی طرف آ رہا تھا۔ اکرم کو بچو کر ایک کونے میں لے گیا۔ اور جلدی جلدی سرگوشی کرتے ہوئے بولا

”تھمادی پچو کا بھی آج ہی مہورت ہوگا“

”کب؟“

”ابھی۔ اسی دم۔ ایک ڈسٹری بیوٹر ایڈوانس دینے پر راضی ہو گیا ہے۔ ابھی چیک مل رہا ہے۔ تصویر کا

ہم بناؤ“

”چکر“

”چکر کیا؟“ ہنچو آریا غش کھاتے ہوئے بولا ”کئی قوی تصویر ہے؟“

”قوی تصویر کی ایسی قسم“ اکرم گھونسا اٹھاتے ہوئے بولا۔ اُس نے اس پاس دیکھا۔ لیکن اُسے نیز نظر نہ آئی جس پر گھونسا مار کے وہ چیخا اور ناثر پیدا کر سکتا۔ ایک لمحہ کے لئے اکرم کے داغ میں خیال آیا کہ کہیں نہ وہ یہ گھونسا سیٹھ کے چٹروں میں گھسا دے۔ مگر پھر اُسے تہذیب کے خلاف سمجھ کے اُس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اور گھونسنے والا ہاتھ بادل خواستہ نیچے کر کے بولا ”اے سیٹھ وہ کامیڈی دول کا۔ وہ کامیڈی دول کا کہ سالہ چار ملی جیلین بھی دیکھے تو غش کھا کے گر پڑے۔۔۔“

سیٹھ نے فدا اور دل چسپی سے صوفی کی۔ وہ ایک نئی نظر سے اکرم کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا ”مگر اکرم بجائی۔ یہ چکر نام کچھ۔۔۔۔۔؟“

اکرم جلدی سے بات کاٹ کے بولا ”تو جانے دو۔ اور نام لوں۔ ہموں کی اپنے پاس کیا کی بے خبر غوش“

کیسا نام رہے گا؟

”غیر غوش کیا؟“ سیٹھ میرانی سے بولا۔

”غیر غوش عرف نمن غوش“

”غیر غوش؟۔۔۔۔۔ مگر اس کا مطلب کیا ہے؟“

”تم مطلب چھوڑ دو سیٹھ۔ سوچو۔ نام بولنے سے منہ بھرتا ہے کہ نہیں؟“

”ہاں۔“ ہنچو دینے سر ہلا کے کہا ”منہ تو بھرتا ہے۔“

”منہ بھرتا ہے۔ تو ایک دن بخوری بھی بھرے گی سیٹھ۔ جلدی سے اعلان کرو۔ غیر غوش کا“

اعلان کیا ابھی کرتا ہوں۔ ڈوسری ہیڈ رٹ سے چیک لیتا ہوں۔ ہنچو دینا شکر کرتے ہوئے بولا ”کیا

م بتایا؟“

تقریباً غرض؟

”غیر غرض... کیا پیتھاسی! (PHANTASY) ہے؟“

”اسے پیتھاسی کی مانی ہے۔ سیٹھ، تم جاکے ڈسٹری بیوٹر سے بات تو کرو۔ وہ کہانی دوں گا کہ دماغ گھوم جاتے گا۔“

سیٹھ نے خوش ہو کر اکرم کی طرف دیکھا۔ اس کے خدشے پر ہاتھ رکھ کے کہا: ”ایسی بات تم مجھ سے پہلے بولنا۔ تو اب تک تیار ایکچر شروع ہونے کے ختم ہو گیا ہوتا۔ پھر وہاں تک کہ ماندہ اناج بچے میں اکرم کی بیچہ تھپتھپا کے بولے۔“ مہررت کے بعد پانچ سو کا چیک لے کے جانا مجھ سے؟“

”بہت اچھا سیٹھ؟“

جوشی جی، راج لا تشارو۔ ایسا چہرہ رینکا کے درمیان کھڑے ہنس نہیں کے باتیں کر رہے تھے۔ اُن کا ہاتھ بار بار رینکا کی پتلی کر کی طرف چلا جاتا تھا۔ سلور سکرین، موسیقی ہنوز کے کیرہ میں فروٹ لے رہے تھے۔ اکرم نے سوچا۔ باآؤب، با ملاحظہ ہو مشیار۔ اب میری باری آئی ہے! بیٹا جوشی۔ میں اپنی فلم میں پچاس لاکھوں کا ٹائٹل رکھوں گا۔ ڈیڑھ لاکھ کا ایک ہی سیٹ بنواؤں گا۔ دیکھے جاؤ... ایسا نیا چہرہ۔ ایسا نیا چہرہ لادوں گا کہ دیکھتے ہی عشق عشق کر اٹھو گے۔ اور جب اکرم کو نئے چہرے کا خیال آیا تو اس کے ذہن میں ولایت علی کا چہرہ گھوم رہا تھا۔

جب ولایت گج کو اکرم نے پہلی بار دیکھا۔ وہ گلانی رنگ کے ہر اشوٹ سلک کی قمیض اور
 سفید سانن کی شلوار پہنے اور سیاہ سلک کے برقعے کا نقاب اٹھائے گرانٹ روڈ ٹیشن پر گاڑی کا انتظار
 کر رہی تھی۔ دوپٹی نکڑ میں بجانپ گیا کہ یہ پنجابی لڑکی ہے اور بمبئی میں نئی آئی ہے۔ ورنہ اس کے رخساروں پر
 یسبب کی سی جگ نہ ہوتی۔ اور وہ اپنے برقعے کو یوں لئے دئے نہ پھرتی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا بھی
 جس کا رنگ بے حد گورا تھا نقش بھیگتے تھے۔ لیکن بے حد نامزدوں۔ بھونیں کمان کی طرح۔ آنکھیں باوام
 کی سی۔ ہونٹ چمکے ناک تلوار کی دھار کی طرح۔ تمام نقوش اپنی جگہ انفرادی حیثیت سے خوب صورت تھے
 لیکن اس کے چہرے پر لکھ کے ایک عجیب غیر مناسب ترتیب کا اظہار کر رہے تھے۔ ولایت گج کے ساتھ کھڑی
 ہو کے وہ اپنا برصورتی کو نمایاں اور ولایت گج کے شمس کو مد چند کر رہی تھی۔ جب تک گاڑی نہیں آئی ۵
 ان دونوں کے قریب کھڑا ہوا ان کے جسمانی تضاد کا اندازہ لیتا رہا۔ یکایک کسی بات پر ولایت گج ہنس
 پڑتی۔ اور اُس کے بے حد سفید اور متناسب دانت ویر تک اکرم کے ذہن میں چمکتے رہے۔ اور اس کی
 حاکم نسوانی آواز ویر تک اس کے دل کے گوشوں میں گونجتی رہی۔ پھر گاڑی آگئی اور وہ دونوں لڑکیاں
 تلسے توب میں چلی گئیں۔ اور اکرم پلٹ کر کتابوں کے مثال پر چلا آیا۔ کیوں کہ اب اُسی گاڑی میں ایک

الگ ڈبے میں بیٹھ کر جانے سے اُسے بڑی کوفت ہوتی۔

غیر غرض کے ساتھ کہ بت کے کچھ دنوں بعد اکرم نے ولایت عجم کو اسی مگلابی پیراشوٹ جسکے کہ قبضہ اور سفید ساٹن کی شلوار میں دلچیت سٹوڈیو کے باہر کھڑے دیکھا۔ اکرم کھڑکی میں تھا۔ اس نے صرخت سے پل بھر کے لئے دیکھ سکا۔ پھر وہ سٹوڈیو میں چلا گیا۔ اور دفتر میں آتے ہی اُس نے اپنے ہاں کے ایکسٹرا پہلائی کرنے والے دارا کو بلایا اور اُس سے کہا کہ دلچیت سٹوڈیو کے باہر اس دھڑکتی لڑکی کھڑی ہے اور بیشتر اس کے کردہ کہیں اور جانے اور یا اگر وہ راج محل سٹوڈیو میں چلی گئی ہو تو تم اُسے کسی طرح گھر کے پہنچاؤ کے لئے اپنے ہاں لے آؤ۔ دارا اس معاملے میں جراتیتر تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں اس کے چہرے پر جھپک کے داغ تھے۔ اس کا سر آگے سے چھوٹا اور پیچھے سے بڑا تھا۔ اور اپنے چھوٹے قدر کی وجہ سے وہ قند سے دیکھنے میں بالکل نئی چوہا نظر آتا تھا۔ مگر لڑکیاں پہلانے میں بے حد مشاق تھا۔ وہ چند منٹوں میں ہی ولایت عجم کو اکرم کے پاس لے آیا۔

ولایت عجم کے ساتھ وہی گورے رنگ کی بد صورت لڑکی تھی۔ اور زمانہ الطوار والا ایک لڑکا جو شکل و صورت سے ولایت عجم کا بھائی معلوم ہوتا تھا۔ ایک بار عجب بھاری بھر کم، تن آسان عورت تھی۔ جن کی گھریلو محبہ داد و مسکراہٹ میں خستہ طرز کے کئی پہلو تھے۔ یہ عورت ولایت عجم کی ماں تھی۔ جوانی میں ولایت عجم سے کہیں زیادہ حسین ہوگی۔ ایک ادیب نے لکھا کہ وہی عورت جو بڑی بڑی موٹھیں رکھتے ہوئے تھا۔ اور نکلاہ اور محرمی پہنے ہوئے تھا۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی پٹیلی پر ہم اللہ کھدار کھا تھا۔ اُس کا نام جلال الدین تھا۔ لڑکے کا نام شفیع اور ادیب نے لڑکی کو وہ سب لوگ بے بے کہتے تھے۔ گورے رنگ کی بد صورت عورت کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ شفیع اُسے "جان کہتا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ شفیع کی بیوی ہے۔ لیکن شفیع سے کہیں بہتر مردانہ اوصاف رکھتی تھی۔

بات چیت جان لے کر شفیع کی بولی "سلام اے" پھر ذکر ولایت سے کہنے لگی "خاکیر کھڑی

انہیں سلام کرو۔“ ولایت بگم نے اپنی کھلائی ہوئی آنکھوں سے اکرم کو ایک بار دیکھا۔ پھر نہیں کر مٹا بھیس رہا لیکن اکرم اب بھی اس کا رخ دیکھ سکتا تھا۔ وہ تیز نیکیا سرسری دنگار، وہ پلکوں کی گھٹی صفت اور اس کے نیچے وہ سنہری سنہری رگت۔ رخصتوں کی جہاں کوئی غار نہ تھا، موت شبنی شفاف چمک تھی۔ اس کی جھکی نگاہیں جھکی پیروں پر پڑیں۔ اور پھر ولایت نے جلدی سے اپنے خوب صورت ٹخنے چھپائے۔

جان بولی ”آپ نے ہم کو بلایا ہے؟“

”جی۔“

”پھر میں کام کرنے کے لئے۔“

”جی۔“

”رول کیا ہوگا؟“

”ایک چھوٹا سا رول ہے۔ مگر بہت اچھا ہے۔“ اکرم نے جواب دیا۔

تو چلو چلیں ”جان کرمی۔“ اٹھتے ہوئے بولی ”ہماری ولایت بگم تو صرف بیرون کاروں کے گئے ہیں۔“

”پہلے کہیں کام کیا ہے۔“ اکرم نے پوچھا

جان بولی ”لاہور میں لنگی بیابان مرہمہ دکن کا کام کیا تھا بعد میں ڈائریکٹر سے جھگڑا ہو گیا وہ مولا اس سے تعلق چاہتا تھا۔“

ولایت بگم نے سیاہ برتنے کی اوٹ کا سہارا لیا۔

جان بولی ”چلو چلیں۔“

کوئی نہیں بلا۔

اکرم نے کہا ”بیٹھے، بیٹھے۔“ جان بیٹھ گئی۔ شلیف ایک خرخ رول مال نکال کر اپنا منہ پونچھنے لگا۔

بے اکرم کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اکرم نے کہا ”رول چھوٹا سا ہے۔ مگر بہت اچھا ہے۔“

کہ میں گے گرد آسکر ہوں۔ بیرون کے ساتھ کھڑا کروں گا۔ سیٹی کے ٹکے کا آئی میرا دوست ہے وہ پہنچی کر اؤں گا ولایت عجم کی کہ دوسری بکچر میں بیرون بننے کے لئے لوگ خود خورشاد کرتے پھر یہاں پر دوسری بکچر بھی میں خود ڈاکٹر کث کر رہا ہوں ۝

اکرم نے بے بے کی طرف دیکھا۔ اس کی پختہ سوچو جو جو رکھنے والے قسم میں وہی ختم ہوتا مگر بڑا بے ضرر مٹا ہوا ملتا تھا ہے۔ اس اپنے ننھے سے کبے میں تیرے سامنے کر قوت جانتی ہوں، جان نے پوچھا ”تخوہ کیا ملے گی؟“
اکرم نے کہا ”ڈھائی سو روپے ماہوار۔“

جان، پھر اٹھ کھڑی ہوئی ”تو ملو چلیں۔ ڈھائی سو روپے۔ وہ اندھری کے ٹوڈیو والے ہیں۔ ساڑھے چار سو بتاتے تھے اور پھر وہ لوگ مجھے کئی کام دیتے تھے۔ پار سو روپے دے رہے تھے۔ مفت میں ہیں یہاں بلا کے خراب کیا۔“

شیخ بولا ”گئی بہار“ میں اُسے پانسول رہے تھے۔ سو روپے مجھے جیب خرچ ملتا تھا۔ سیگرٹوں کے لئے ۝

بے بے ہوئی ”بیرون بھی نہ ہوگی۔ اور تخوہ بھی ٹھیک سے نہ ملی تو مٹا تاؤ کام کیسے چلے گا؟“
بے نے لفظ کام پر ذرا زیادہ زور دیا۔ اس لئے اکرم کے لئے جواب دینا ضروری ہو گیا۔ اس نے کہا ”کام تو دنیا میں کسی نہ کسی ڈھنگ سے چلتا ہی ہے۔ اور چلے گا بھی۔ تو اس سے زیادہ نہ ملے گی۔ سبھ لوگ نہیں مانتے گے۔ اور یہ تو میں اپنی طرف سے کہہ رہا ہوں۔ جس میں ہے سبھ کو یہ سب نہ سمجھو۔“

جان ہوئی : ”یہ کسٹراک کا کسٹریٹ، ہم کو پسند نہیں ۝
چلو ہمیں ”شیخ بولا۔“

”پلو“ بے بے نے کہا۔

”ہاں ٹھیک ہے“ جلال الدین نے دھیمے سُرس کہا۔

دلایت گج دیا بیٹی کی مٹھی میں۔

بے بے نے کہا ”اٹھ دیتی ہے!“

دلایت اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ لوگ باہر چلے گئے۔ سڑک پر آگے نکل گئے۔ اکرم پھر دارا کو

بجھنے والا تھا۔ کہ دلایت بچا یک پٹی۔ اس کے ساتھ کے لوگ اسے بلاتے رہ گئے۔ لیکن وہ نہایت

تیزی سے چلی آرہی تھی۔ وہ سٹوڈیو کے اندر داخل ہوئی۔ اکرم کے کمرے میں آگئی۔ اس کی میز کے سامنے

آکے بولی ”میں کام کروں گی“

اس کا چہرہ غصے سے تنہا رہا تھا۔

اکرم میز پر جا رہا تھا۔ بجلتے بجلتے رک گیا۔ بولا ”بہت اچھا۔ میں ابھی انٹرنیٹ تیار کر دے

دیتا ہوں۔ دستخط کر کے جاؤ“

وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ بھوک ادھری منٹ ڈانپ کرتے لگا۔ وہ بولی ”مجھے کچھ روپے ابھی چاہئیں سرائے والے

کے پیسے دینے ہیں“

”تم سرائے میں ٹھہری ہو“

”اور کہاں ٹھہرتی۔ اپنے پاس زیادہ پیسے نہیں تھے۔ اور آج وہ بھی ختم ہو گئے۔ سرائے والا پریشان

کر رہا تھا۔ آج مجھے کہیں نہ کہیں ایگری منٹ کرنا ہی تھا“ اس نے بڑے افسردہ تھکے تھکے قہقہے لہجے میں

کہا۔ اس کے لہجے میں بڑھاپے کی تسکین تھی۔ اور بچپن کی مصیبت۔ اس کی عمر شکل سے چند رو برس ہوگی

ایگری منٹ ڈانپ ہو گیا۔ سیٹھ کے دستخط بھی ہوئے اور دلایت بیگنے کی جھٹ سے دستخط

کر دئے۔ اور اکرم نے ایک سو روپے کا نوٹ اس کی ٹھنڈی برقاب انھلیوں میں تھما دیا۔ تسخیر میں

کے گھر کے لوگ بھی چلے آئے۔ ولایت نے لاہر واپسی سے نوٹ بے بے کے ہاتھ میں دے دیا۔ بے نے اپنے دھننے کے آٹھل میں مضبوطی سے باندھ دیا۔ شیخ نے سگریٹ کا کش زور سے اندر کھینچا۔ اور جھان لے گھر کے غصے بھری نگاہوں سے اکرم کی طرف دیکھا۔ اور میرے لئے تو کام نہیں ہے۔
”نہیں۔“

”اچھا تو میں جاؤں؟“ ولایت نے اکرم سے پوچھا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اکرم نے کہا: ”شہر جاؤ میں ایک ہوٹل کا بندوبست کئے دیتا ہوں۔ آپ لوگوں کا سرائے میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔“
بے نے آٹھل پھیلانے اکرم کو دعائیں دینے لگی۔ اور سرائے والے کو گھایاں۔

اکرم نے تیلیفون پر بات کر کے کہا۔ ”وری بندر ہوٹل میں سٹائٹس نمبر کر دے آپ کے لئے طے کر دیا۔“
اپ لوگ سرائے سے وہاں چلے جائیے۔ چلتے چلتے جان لے کہا ”سلام لے!“

شام کو جب اکرم اپنے کام سے فارغ ہو سکے لوری بندر ہوٹل پہنچا تو ولایت عجم ایک گہری ہنر ساڑی میں ملبوس اس کی رو دیکھ رہی تھی۔ بے نے اس کے ہاں بڑی خوب صورتی سے بجائے تھیں۔ اکرم سٹوڈیو کی ایک گاڑی ساتھ لایا تھا۔ ولایت عجم کو پچھے بغیر اس کے ساتھ ہوٹل کے ریزیڈنٹ سے نیچے اتر آئی۔ پیچھے پیچھے خفیہ تھا۔

بے نے نہنے کے اوپر سے بلند آواز میں کھٹا شیخ کو ساتھ لے جاؤ۔ یہ باہر بیٹھا رہے گا۔
اکرم گاڑی بوہو کے ایک خوب صورت ہوٹل کے کشادہ فائن میں لے گیا۔ رستے بھر اس نے ولایت سے کوئی بات نہیں کی۔ اور ولایت نے بھی اس سے کوئی بات نہیں کی۔ اس نے دیکھا کہ اکرم بار بار دوندیدہ نگاہوں سے اس کے چہرے کے سمجھوڑ کو دیکھ لیتا ہے۔ اور اس کی کمر کے کھیلے تم کر۔ بھر بھی وہ سکراتی نہیں سنجیدہ روہو کے باہر نکلتی رہی۔ جہاں لوگ چلے جا رہے تھے، جہاں نوجوان بیویاں اپنے غامدوں سے نہیں نہیں کے باتیں کرتی ہوئی گزرتی جا رہی تھیں۔ ماؤں نے اپنے

پیارے پیارے بچے گود میں اٹھائے ہوئے تھے۔ جہاں کھرک تھیلیوں میں مکھنے کا مسلمان پاشی برہم کے
 نے جلد ہے تھے۔ ایک جگہ نیامکان بن رہا تھا۔ موڈ پر پولیس کا سپاہی اطمینان سے آمدورفت کا بندوبست
 کر رہا تھا۔ ہوٹل میں، پاروں طرف سمندر کے کنارے کنارے غشی ناکا کھینچے ہوئے تھے۔ وہ لوگ
 ایک کالچ میں چلے گئے۔

شیخ اڑی میں بیٹھا رہا۔ اور سرخ رومال میں گریں لگاتا اور کھولتا رہا۔ اکرم نے جلتے وقت پانچ کا ٹوٹ
 اور سگریٹ کا ڈبہ اس کے ہاتھ میں تھا دیا۔ شیخ نے سترت سے اچھن کر اکرم کے گھٹنے چھوئے "تو سنی
 بادشاہ ہے۔ ایک پارٹ فیکڑوں کو بھی دے دے۔ ولایت کو میں لاہور سے لایا ہوں کاس کو پارٹ
 مل جائے گا۔ تو فیکڑوں کو بھی مل جائے گا۔ کیوں؟ سنی بادشاہ"

اکرم نے کہا "عزیز سگریٹ پیو، اور سمندر پر چلو۔ کل بات کریں گے"
 شیخ نے اکرم کی طرف ہاتھ اوجھار کر کہا: "جیو چھیا!"

اندک کالچ میں پہنچ کر اکرم نے دیکھا۔ پتنگ پر ولایت پریم لٹی۔ نیم وا اکھوں سے چپت کر تک
 رہا ہے۔ اس نے ساڑھی اتار کے الگ رکھ دی ہے۔ ایک کرسی پر اور چپت کے چٹکے کے بلکے ہلکے
 جو بھگدڑ میں اس کا سز سائن کا بیٹی کوٹ لہز رہا ہے۔

اکرم نے کہا "یہ کیا یہ ہو گئی ہے۔ ساڑھی پہنوا اور دوسرے صوفے پر آؤ۔"

وہ بولی "بعض لوگ پہلے پتنگ پر رکتے ہیں۔ بعد میں صوفے پر جلتے ہیں۔ خیر یہ تم کہو؟ اس نے ساری
 پھر پہن لی، اور اکرم کے قریب صوفے پر آ کے بیٹھ گئی۔ اس نے میز پر پڑے ڈبے سے ایک سگریٹ نکال لیا
 اور دو گلاسوں میں خراب انڈل لی "تمہارے لئے سو ڈاڑھاؤں"

اکرم نے کہا "ہاں"

دہری "میں سو ڈاڑھیں پتی ہوں" اس نے سگریٹ کا ایک کش لگایا۔ اور پھر اپنا بیگ سو ڈاڑھ لے لیا

ایک ہی سانس میں چڑھا گئی۔ بٹی "کتنا آخِ ذائقہ ہے۔ مگر گھرا لے مجھے کبھی شراب اور سگریٹ نہیں پیئے دیتے چپ کرتی ہوں۔"

"وہ یوں؟"

"پتہ نہیں۔ ایک بار میں نے آپ کے سامنے سگریٹ پی تھی۔ آپ نے مجھے بہت مارا۔ ایک بار میں شراب کے نشے میں مہوش گھر آئی تو پہلے توہمتے میں شفع نے مجھے مارا۔ پھر کمر پر ہلاؤں آپ نے؟"

"آپ بے لے کیا کیا؟" اکرم نے پوچھا۔

"بے لے مجھے بڑا یاد کرتی ہیں۔ چوری چھپے ہم دونوں سگریٹ پی لیتی ہیں۔ مگر شراب کو وہ بھی منع کرتی ہیں۔"

"عجب چیز ہے۔ مگر کتنا آخِ ذائقہ ہے اس کا؟" اس نے دوسرا پیگ اٹھ لی لیا۔ "یہ کڑوا کڑوا ذائقہ ہے بہت اچھا لگتا ہے۔ اس سے بھی اگر کڑوی مشراب مل جائے تو مجھے بے حد پسند آئے"

اکرم نے کہا: "شیف نہیں پیتا ہے۔ اور تم اسے کچھ نہیں کہتی ہو؟"

وہ بولی: "مجھے اس کا پشیمانہ لگتا ہے۔ جیسے یہ سگریٹ اس وقت مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ وہ کرے کو ہماروں کو دیکھ کے بولی: "کتنا اچھا کر رہا ہے۔" خوب صورت پتنگ۔ رنگین دیواریں۔ یہ پنکھا۔ یہ دم دم مچھلی بدھتی والے قہقہے۔ یہ سنہری شراب۔ یہ سفید سگریٹ۔ یہ چمکتے ہوئے تلور کے گلاس (جان سے میرا خول تو بیت بُرا ہے۔ اور وہ سرائے نکلتی ہی تھی۔ جہاں ہم آکے چند روز ٹھہرے تھے۔ اور لاہور میں میرا گھر کتنا بُرا تھا۔ یوں تو اچھا تھا۔ مگر اس کے مقابلے میں۔۔۔ اس نے چُپ ہو کر سر ہلایا۔"

"کوہو میں تنہا رہا مگر کہاں ہے؟"

"شکار بار بار کے قریب ہے۔ باغبان پورے میں کچا گھر ہے۔ مگر بڑا سا چمڑا آگن ہے۔ بھین میں ہمارے ہاں بھینس بھی تھی۔ بے لے اس کا دودھ اور کنٹن مجھے دیا کرتی تھی۔ چوری چھپے ایک دفعہ کیا ہوا؟ اور وہ اتنا کہہ کے ٹیکہ لگا کے ہنس پڑی اور اس کے سفید اور مناسب راتوں کی لڑی لکڑی کی طرف کندہ

گئی۔ ایک دفعہ کیا ہوا۔ بے بے نے میرے لئے کھن ڈھیر سا رکھ دیا اور مصری کی ڈلی الگ رکھ دی۔ اور گھٹی میں تھے ہوئے نرم نرم چار پرانے کچی رکھوئے، اور ایک گلاس دودھ کا، اتنا گاڑھا دودھ ہوتا تھا کہ کیا بتاؤں تمہیں۔ خیر جی جب میں سکول سے واپس آئی :
 ”تو تم سکول میں پڑھتی تھیں ؟“

”ہاں میں اُن دنوں تیسری جماعت میں پڑھتی تھی۔ اُس وقت میری عمر کوئی آٹھ سال کی ہو گئی۔ خیر جی جب میں گھر آئی۔ اور بے بے قویہ سب سلمان چھکے میں ڈال کے چلی گئی تھیں۔ اپنے کسی ہم سائے کے یہاں میں نے گھرتے ہی ابستہ زمین پر پٹھا ادا پاک کر چھپکا نیچے آتا رہا۔ اور جلدی جلدی سے کھلنے لگی اتنے میں شعین کہیں سے آگیا میں نے اپنا کھانا اچھا تا چاہا۔ مگر اس نے دیکھ لیا۔ بولا : ”بے بے تمہاری طرف داری کرتی ہیں۔ تمہیں اچھا اچھا کھانے کو دیتی ہیں۔ اور اتنا زیادہ کھاتی ہیں۔ اور میں کوئی نہیں چھتا ہے۔ دیا کیوں ہوتا ہے۔ دوسروں کے گھر میں لڑکے دیکھتا ہوں۔ اُن کی خاطر سب سے زیادہ ہوتی ہے یہاں ہیں کوئی پوچھتا نہیں ہے۔ بس بڑی کو کھلانے جاؤ میں دستک میری اُس کی لڑائی ہوتی رہی۔ نہ جین جھپٹ کے میرا کھن بھی کھا گیا۔ اور پرانے بھی۔ اور وہ سب اس بھی پنی گیا۔ اور میں خود زور سے رونے لگی۔ اتنے میں بے بے باہر سے آگئیں۔ اور انہوں نے شفیع کو خوب دھڑا دھڑکوں، ڈانٹوں، لالچوں سے پٹا۔ رات کو جب وہ سوا قومی رات نچنے میں بیٹھ کر کے سویا۔ ہم اکٹھے سوئے تھے۔ میں آہستہ آہستہ اس کے جسم کو دباتی رہی۔ اس رات میں رات بھر اپنے بھائی کا ہم دباتی رہی۔ اور پھر آفراس کے جسم کے اوپر سر رکھ کر سو گئی۔ صبح ہم دونوں کو اس طرح سوئے دیکھ کے بے بے بہت ہنسیں : ”اور اتنا کہہ کے ولایت پھر کھن کھل کے خنس پڑی۔ پھر بچا یک افسردہ ہو کے بولی ”اُس وقت میری عمر آٹھ سال کی تھی اب پندرہ سال کی ہوں۔ مگر ایسے سلام بولتا ہے جیسے آٹھ سو سال گزر گئے :“

اس نے تیسرا پیگ انڈیل دیا۔ اگر م نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا وہ بولی ”آج مجھے

کہو نہ کہو۔ جی بھر کے پیئے دو۔ مدت کے بعد پی رہی ہوں :-

اس نے تیسرا بیگ بھی جلدی سے ختم کر دیا۔ اکرم ابھی پہلے ہی میں تھا۔ جب وہ آگے چلنے لگی تو اکرم نے کہا "مردانگی" وہ بولی "نہیں اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو لورہ کی قوتل پی جاؤں۔ اہ لکھے کچھ نہ ہو :-

اکرم نے حیرت سے دیکھ کر کہا "کب سے پی رہی ہو" وہ بولی "میں جب گیارہ سال کی تھی، جب میں بے سنی بار شراب پی تھی۔ اُن دنوں ہم لوگ ننھے ننھے کراچی آئے تھے :-

"تو کیا تم کراچی کی رہے ہو ابی ہو :-

"نہیں ہم تو لاہور کے ہیں۔ باغبان پورے کے۔ وہاں ہماری زمین ہے مکان ہیں۔ آبا کھیتی باڑی کرتے

تھے۔ اور ہم لوگ بڑے بڑے میں رہتے تھے۔ پھر آیا مقروض ہو گئے۔ اور ہمارے ہونے گھر سے سب

اُٹھا گیا۔ یہاں دنوں کی بات ہے۔ جب میں پیدا ہوئی تھی۔ بے بے ستا پی ہیں۔ کہ جب گھر میں کچھ

نہ رہا اور فوت فاقوں پر آگئی۔ تو بے بے نے پیشہ کر لیا۔ بے بے جڑی حسین تھی۔ سارے خاندان میں

بھی اُن کے برابر کوئی حسین عورت نہ تھی۔ جلال آبا ان کو برقعہ پہنا کر باہر لے جانے لگے۔ ایک دفعہ

کسی بڑوں میں بے بے اور آبا کھڑے تھے۔ بے بے توجہ لگیں۔ لیکن آبا کو تین ماہ کی قید ہوئی۔ جب

وہ تیسرے ماہ رہا جو کے آئے۔ تو بے بے کے لاہور چھوڑ دیا۔ اور کراچی چلی آئیں۔ وہیں پر شفیق اور

میں پیدا ہوئے۔ ہم لوگ جلال آبا کی اولاد نہیں ہیں۔ ویسے وہ ہمارے آبا ہیں۔ مگر ہم ان کی اولاد نہیں

ہیں :- اکرم نے کہا "ہاں میں بھی خود کر رہا تھا۔ کہ تم دونوں بہن بھائی کی صورت اُن سے بالکل

ملتی ہے :-

دایت نے سرگوشی سے اکرم سے کہا۔ حالانکہ اس وقت اُن کے کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ جملے سے اُن کے

"ہم دونوں شفیق اور میں چچا بھئی کی اولاد ہیں :-

"چچا بھئی بخش :-"

”ہاں چچائی بخش کا کرتی ہیں یہ بول کا چپ تھا، اور سینکڑوں کی آمدنی تھی وہ کچن ہی سے ہماری بے بے کو چاہتے تھے۔ مگر بے کی شادی ہاں باپ نے جلال آبا کے ساتھ کر دی۔ اور جلال آبا تو بڑے کامل اور محنتور ہیں جنہیں کام کرنا تو آتا نہیں۔ دن بھر حق پیتے رہتے ہیں۔ اسی کابی میں زمین بھی ہاتھ سے گئی۔ پھر سر پر چڑا بانڈھ کے اور لٹی لٹی دیکھیں رکھ کے اپنی بیوی سے پیشہ کرنے لگے۔ میرا جی چاہتا ہے مٹا لیں وہاں جلال آبا کا۔ مگر ڈر لگتا ہے۔“

”کابے کو ڈر لگتا ہے؟“

وہ بولی ”جب سے وہ قید سے رہا ہوئے ہیں۔ ان کا ڈھنگ بھی بدل گیا ہے۔ اب وہ ہمیشہ اپنے پاس ایک چاقو رکھتے ہیں۔ لہذا سا چاقو مگر میں ڈرا فدا سی بات پر چاقو نکال لیتے ہیں۔ ایک دفعہ تو شیخ کو جہاں سے مار دینے والے تھے کبے نے لے چایا۔ پھر کئی شیخ کی یاہوں پر کئی زخم آگئے۔ دو مہینے خیم پٹی ہوتی رہی۔ بُستی ہوں پہلے جلال آبا ایسے نہ تھے۔ جب اپنے ہاں زمین تھی۔ مکان تھے پر اب تو ————— خیر جی جالے دوان باتوں کو۔ تو تم دوسرا پیگ پیو۔ تم اتنے چپ چاپ جو رہتے ہو جگے اچھے لگتے ہو؟“ ولایت بچکے لے کہا۔

اکرم باصل فریفتہ ہو کے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ہر لمحہ حسین تر ہوتی جا رہی تھی۔ خراب کے ہر گھونٹ کے ساتھ میل گوں روشنی میں پلنگ پر تنی ہوئی پتھر والی کسی پتھر اسرار چار کا کین معلوم ہوتی تھی پلنگ کے اوپر چکھا تھا۔ جس کی تند سے پتھر والی لکی شفاف سطح پر لکی لکی مویں پیدا ہو رہی تھیں۔ اکرم نے ولایت بچک کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ اور اس سے کہا ”یہ پلنگ کتنا خوب صورت ہے۔ باصل کسی جہان کے کین کی طرح معلوم ہوتا ہے۔“

وہ اس کا بوسے کے بولی ”میں نے اس سے بھی خوب صورت پلنگ دیکھے ہیں۔ ڈوٹی کشر کے ہاں پلنگ کے پایوں پر چاندی کے پتھرے جڑے ہوئے تھے۔“

اکرم نے چنک کر کہا ”ڈپٹی کمشنر کو جانتی ہو؟“

وہ بولی ”ہاں۔ اس کے پاس امیر ڈرامہ لکھتا ہے۔“

”امیر کون ہے؟“

”امیر میرا خاوند ہے۔“

”تمہارا خاوند ہے؟“

”ہاں۔“ ولایت بیگم کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائیں۔ اس کی آواز لڑنے لگی۔ کانپتے ہوئے

لہجے میں بولی ”وہ خبیث مجھے کبھی نہیں بھولا۔ جب کبھی مشراب پیتی ہوں وہ کم بخت سامنے

آکر کھڑا ہوتا ہے۔ یوں آنکھوں کے سامنے جیسے تم اس وقت میرے سامنے ہو۔ تم مسلمان ہونا؟“

”ہاں۔“

”گیارہویں والے پیر کو ملتے ہو؟“

”ماتا ہوں۔“

”میں گیارہویں والے کی قسم کھا کے کہتی ہوں مجھے اگر کسی سے اس دنیا میں محبت ہوئی ہے۔ تو وہ

صرف امیر سے، باقی سب جھوٹے ہیں۔ اور ان سے میں بھی جھوٹی ہوں۔“

اکرم نے بڑے جانا زماشتوں کی طرح اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا ”پرچہ اب تمہیں کچھ عرصے

نہیں ہوتا۔“

”کچھ نہیں۔ رقی بھر نہیں۔ میری جڑی مر گئی ہے۔ کچھ محسوس نہیں ہوتا۔“

”حیرت ہے؟“ اکرم نے اپنے گلاس میں شراب کا آخری قطرہ پیتے ہوئے کہا۔

وہ بولی ”حیرت تو ہے، مگر امیر پر اب بھی میرا اتنا ایمان ہے کہ وہ اس وقت بھی میرے سامنے

آجائے تو میں تمہیں تو کیا ساری دنیا کو چھوڑ چھاڑ کے چلی جاؤں؟“

کہاں؟

”جہاں وہ کہے۔“

”ڈپٹی کمشنر کے ہنگ پر۔“

”وہ نہیں۔ وہ تو مجبوری کی بات تھی۔“

اکر نے غصے میں اُسکے کہا: ”کیا مجبوری تھی۔ دوسرا بیگ بناؤ۔“

وہ بولی: ”جب امیر مجھے اغوا کر کے لے گیا۔ اس وقت میری عمر نیکل سے چودہ سال کی تھی۔ چند ماہ کم ہی تھی۔ گویا کہ میں نابالغ تھی۔ لیکن میں گیا رعوں میں سال ہی سے امیر سے محبت کرنے لگی تھی وہ ہمارے رشتے تلطے والوں ہی میں تھا۔ ایک دن۔ یہ میرے گیا رعوں میں اس کی بات ہے۔ میں چھٹی جہالت میں پڑھتی تھی۔ اور سکول سے پڑھ کر واپس آ رہی تھی کہ ہمارے کھیتوں کے پاس سے امیر نکلا۔ اور مجھے اپنی ہانہوں میں اٹھا کر لے گیا۔ میں نے امیر سے پوچھا۔ کیا کرتے ہو۔ وہ بولا ابھی بتانا ہوں خیر جب میں گھر پہنچی تو ابامیری حالت دیکھ کر بہت پریشان ہوئے۔ بے بے بھی بھے دھڑا دھڑپٹنے لگیں۔ کوئی تھوڑا عرصہ رہا۔ میں نے کہا۔ اپنا چھیرا بھائی امیر میرے ساتھ تھا۔ پھر انہوں نے امیر کو وہ بے نقاد سنائی کہ کیا کہوں ہے بے سر پٹنے لگیں۔ آبا جلال گڑا سارے کرا میر کو جان سے مارنے کے لئے بھل پڑے۔ امیر چپ گیا۔ کہیں ملا نہیں۔ میں تین چار دن کے بعد جب سکول گئی۔ تو رستے میں بے امیر میں گیا۔ میں نے کہا۔ مجھے پھر اٹھا کے جاؤ گے تو ابامیں جان سے مار دیں گے۔ وہ مجھے پھر اٹھا کے لے گیا۔ میں جتنی چلاتی رہی۔ ہر اہل امیر پڑا خوب صورت جوان تھا، تمہ نے نہیں دیکھا۔ گول سا نواں چہرہ۔ چھوٹی چھوٹی مونچیں۔ گنگر لے بال جب وہ ان ہاتھوں کو تھک کے ہانگ نکالتا تو دل پر کیر سی کینج جاتی ہے۔ کرا اس کی کہی پتی ہے۔ اور چھاتی اتنی چوڑی ہے۔ اور اس نے اپنی چھاتی پر میرا نام کھرا رکھا ہے۔ وہ بچپن ہی سے مجھے چاہتا ہے۔ اور میں ابھی اُسے چاہتی ہوں، مگر ہمارے

گمراہ اس رشتے کے خلاف تھے ۔

”وہ کیوں؟“

”بے بے مجھ سے ہٹ کر اپنا چاہتی تھیں۔ مگر میں اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے کہ مجھ سے محبت تھی اور مجھ اس نے مجھ پر حق پائی تھی۔ اُسے دیکھ کر میرا دل یوں جھٹکا جیسا کہ جس طرح خشکی کو دیکھ کر بہنی چوڑیاں بھول جاتی ہے۔“

اکرم نے کہا ”سچی محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔“

وہ بولی ”تم مسلمان ہونا؟“

”ہاں۔“

”اچھا رھو میں واسے پر تعین کرتے ہونا؟“

”کرنا ہوں۔“

”اس گیارھویں واسے پاک پیر فیئر کی قسم کھا کے کہتی ہوں۔ میں گمراہوں کی مرضی کے خلاف گمراہوں سے چُپ کر۔ گمراہوں کی مار پیٹ سہہ کر بھی۔ اس سے ملتی رہی۔ پہلے میں گیارہ برس کی تھی۔ پھر میں بارہ برس پورے کر کے تیرھویں میں آگئی۔ تب میں آنکھوں میں پڑھتی تھی۔ اور اس سے براہِ ملتی تھی۔“

”وہ کیسے؟“

دلایت بولی ”دل ملنا چاہیے۔ تو کون روک سکتا ہے۔ دل تو کب سے لے ہوئے تھے۔ پھر میں ایک روز۔ اس سے ساتھ لائن پور۔ تم نے دیکھا ہے کہ نہیں۔ تم کہاں کے رہنے واسے ہو؟“

اکرم نے کہا ”میں یونی کا رہنے والا ہوں۔“

وہ بولی ”خیر لائن پور ڈرا آچھا شہر ہے۔ سڑکیں چوکر۔ سیدھی ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی اور شہر باہر گول ایک جگہ سے سیر کے لئے بکھو۔ گھوم کر پھر وہیں آجاؤ گے۔ لائن پور میں کوئی بچہ بھی کھو جائے تو

گم نہیں ہو سکتا۔

”خیر تم دونوں بچوں کا کیا ہوا؟“

”میں پچھلے وقت کچھ زبردے کے آئی تھی کچھ روپے بھی امیر کے پاس تھے۔ پہلے تو امیر نے روپے خرچ کئے۔ ہم لوگ دن رات ہنگ پر پڑے رہتے۔ اور ایک دوسرے کو جوتے رہتے۔ اور جب چوتے چھتے تھک جاتے، تو اٹھ کر سیر کرنے پلے جاتے۔ مجھے امیر نے دسٹے سوٹ سلوا دئے۔ اور خود بھی بوسکی کی قمیص سلوائیں۔ اور کاجوں میں سونے کے بٹن لگائے، اور زنجی تہر اور پپ شوہن کرجب وہ لوہے میں اپنے گھر سے نکلتے تو سارے بازار کی نگاہیں ہم دونوں پر ہوتی۔ بڑے اچھے دن تھے وہ۔ ایسے اچھے دن اب نہیں آئیں گے۔“

”کیوں؟“

”اب میری چڑی مر چکی ہے۔“ ملازم نے ایک سانس میں گلاس ختم کرتے ہوئے اور دوسرا اٹھاپتے ہوئے کہا۔ ”اور بھر پینے تم ہو گئے۔ پھر امیر نے مجھے پینا شروع کر دیا۔ پھر سیاہنڈی، تھوے، چولے میں لگ گئی۔ اور امیر میرا زبردین بیج کر شراب پینے لگا۔ پہلے وہ شراب نہیں پیتا تھا، مگر اب وہ بیوی والا تھا، اور بے کار تھا۔ اسے سائیکلوں کی مرمت کا کام آتا تھا۔ اور وہ فٹ بال بڑا اچھا کھیلتا تھا، مگر سائیکل مرمت کرنے والے خود سب کام کرتے تھے، انہیں اس کی ضرورت نہ تھی۔ فٹ بال تو ایک کھیل تھا۔ اب وہ بے چارہ کرے تو کیا کرے۔ جب زبردگی ختم ہو گئے اور ہم لوگ درون اور زبرد فالتے رہے تو امیر مجھے برقعہ اور حاکے ڈپٹی کشنر کی کوٹھی پر لے گیا۔ اس کا بیڑا امیر کا دوست بن گیا تھا، اور ڈپٹی کشنر کے ڈرائیور نے اسے ڈپٹی کشنر کی موٹر پر جھلکے موٹر مپلانا بھی تھوڑا تھوڑا سکھا دیا تھا اور ڈپٹی کشنر کا بیڑا اور ڈپٹی کشنر کا ڈرائیور دونوں کہتے تھے، کہ اگر امیر مان جائے تو اس کی ساری مشکلیں حل ہو سکتی ہیں۔ میں بہت روٹی دھوٹی، چلائی، بن کئے۔ اسے کھنے دئے۔ اسے ٹکی لگی

فٹش گھایاں دیں۔ اس کی ماں بہن کو اچھی طرح پٹنا۔ مگر جب دو رات اور دو دن قلعے کرنے گزر گئے
 اوروں میں اُنکے ایک کھیل بھی نہ گئی تو امیر بچے برقعہ اوڑھ لے کے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پرے گیا اوروں پر
 میں نے وہ پٹنگ دیکھا جس کے پاؤں پر چاندی کے تہرے چڑھے ہوئے تھے۔
 ”بھڑکنا ہوا“ اکرم نے پوچھا۔

”بھڑکنا ہوتا“ امیر موڑکا کلینر ہی گیا۔ میرے لئے بڑے اچھے اچھے کپڑے ہی کے آگئے۔ اور زیور بھی۔
 اور مگر کاچو لھا دیراں ہو گیا۔ اور آگ بج گئی اور یہ لڑل ہر وقت بجنا بھجا سا رہنے لگا۔ پھر میرے ماں باپ
 ایک روز بچے لینے کے لئے آگئے۔ ان کے ساتھ پولیس بھی تھی۔
 ”پولیس کیوں تھی؟“

”میں نابالغ جو تھی نا۔ لاہور کی پولیس آئی تھی۔ انہوں نے میرے اور میرے امیر کے تنگڑی لگا دی، اہ
 ہمیں باندھ کے بے چارے۔ لائل پور کے ڈپٹی کمشنر نے بچے پکڑا پکڑا۔ مگر وارنٹ لاہور کے جج نے
 نکال دیا۔ وہ دانت چس کے رہ گیا۔ چلنے چلتے میں نے سب اسیکڑ کر کے بچے گرفتار کر لئے یا تھا۔ گالیاں
 دیں وہ گالیاں دیں کہ بے چارہ اپنا سامنے لے کے رہ گیا۔ مٹس کے کہنے لگا اتنی خوب صورت لڑکی کے
 منہ سے اتنی بُری گالیاں میں نے آج تک نہیں سُنیں۔ مجھے پانچ بہت بُری بُری گالیاں یاد ہیں، ایک
 دن تیس سناؤں گی؟
 ”کب سناؤ گی؟“

”جس دن تم سے لڑائی ہو گی جس دن تم مجھے شادی کے لئے کہو گے۔ کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟“
 ”نہیں تو۔ مگر کیا تم شادی کے غلات ہو؟“

”ہاں یہ سارے مرد بڑے حرام زادے ہوتے ہیں۔ میرا بس چلے تو ان کی کمال کھیچ کر انہیں پھانسی
 پر لٹکا دوں؟“

اکرم نے کہا: تم نے تو ابھی گالیاں دینا شروع کر دیں۔ ابھی تو میں نے تم سے شادی نہیں کی ہے۔
وہ بولی: تم مجھ سے کیا کھانکے شادی کرو گے؟

اکرم نے میز پر گونہ مار کے کہا: میں تم سے ضرور شادی کروں گا۔ میں تمہاری زندگی سدھار دوں گا۔ تم میری نیک طبیعت بیوی بنو گی۔ میں تمہارا فراں بردار خاوند۔ اور ہمارے گھر کے آگے میں ہمارے پیارے پیارے بچے نکلیں گے۔ اور....

اور وہ آہستہ سے بولی: اور پھر تم مجھے کسی ڈپٹی کنسٹرکٹور کے پاس لے جاؤ گے؟

وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ اکرم بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔ پھر وہ چپ ہو گئی۔ پھر اکرم بھی چپ ہو گیا۔ پھر اکرم محو اوپنٹی کر کے اس پنک کی طرف دیکھنے لگا۔ جو سرور کے عالم میں اور بھی حسین دکھائی دے رہا تھا۔ اکرم نے ولایت کی کمریں ہاتھ ڈال کے کہا: یہ پنک کتنا حسین ہے؟
وہ بولی: میں نے اس سے بھی خوب صورت پنک دیکھے ہیں۔ چلو میری نواب میران شام کے پنک میں سوئے کے پائے لگے ہوئے ہیں اور اس کی گلابی رنگ کی تھروانی میں سوتی اور جواہر لگے ہوئے ہیں اور اس کے ارد گرد چاروں طرف قد آدم آئینے ہیں۔ اور آپارنگی عورتوں کی تصویریں ہیں۔ اور جب میں اس کے کمرے میں داخل ہوتی تو پہلی بار اپنے آپ کو چاروں طرف آئینوں میں دیکھ کر گھبرا گئی۔ اور شرمائی لیکن نواب نے چائے بڑے اچھے آدمی ہیں۔ ان کی عمر پچاس کے اوپر ہو گی۔ بال کچڑی ہیں۔ ہونٹ لڑخندہ کھلے ہوئے ہیں۔ اور سوتے وقت طاقت کی دوا کھاتے ہیں۔ ان کے پاس بے شمار دولت ہے بے شمار زمین ہے۔ بے شمار جائیداد ہے۔ سننے میں نواب میران شاد کی دولت کا کوئی حساب نہیں خود چھوڑنے لافٹ ان کے گھر کا اکھانے آتا ہے۔ اتنا بڑا آدمی محمد پر عاشق ہو گیا؟

”کیسے ہوا۔ کیا میں نے تمہیں دیکھا تھا کہیں پہلے؟“ اکرم نے پوچھا

”نہیں کہیں پہلے تو نہیں دیکھا تھا۔ بے کر تو مجھے میرے آباؤی وہاں گئے تھے۔ لافٹ پور سے جب میں

اور امیر گرفتار ہو کے آئے تو امیر مجھے درود کے سلام کرتا ہوا۔ اور میں اُسے درود کے وہائی دیتی تھی۔
 اللہ دنیا ہمارا تاشہ رکھتی تھی۔ پھر جو سب اسپیکٹر تھا وہ شفیع کا بڑا دوست بن گیا۔ اور شفیع اس کے
 ساتھ حالات میں مجھے ملنے آتا تھا۔ اور میں اس کے سامنے سب اسپیکٹر کو اور شفیع کو اللہ اپنے اہل باپ
 کو بے لفظ ساتی تھی۔ بے چارہ اسپیکٹر چپکے چپکے سب کو سُنا، میں نے اس سے کہا، میں امیر سے ملنا
 چاہتی ہوں۔ اس نے کہا میں تمہیں امیر سے ملا دوں گا۔ مگر اس کا تمہیں سوا دھڑ دینا ہوگا۔ میں نے
 دیا۔ کیوں کہ میں امیر سے مانا چاہتی تھی۔ اور جب ہم ملے۔ تو خوب دیک دوسرے سے گلے مل کر روئے
 اور میں نے امیر سے وعدہ کیا کہ اگر میرے ماں باپ نے اس کے خلاف مقدمہ چلایا تو میں صاف کہیں
 گی کہ میں اپنی مرضی سے امیر کے ساتھ گئی تھی۔ چنانچہ جب مقدمہ چلا تو میں نے صاف صاف ایسا ہی کہہ دیا
 اس پر جو جٹریٹ نے امیر کو نہانت پر رہا کر دیا اللہ مجھے اپنے ماں باپ کے حوالے کر دیا۔ اور صحن میں مگر
 آئی ہوں اور ابھی میں سے بھی نہ بچتی تھی کہ دوسرے روز آتا مجھے برقعہ اوڑھنے کے نواب میراں شاہ کے
 گھرے گئے۔ میں بہت روئی دھوئی۔ مگر بے بے کہا، گھر میں کہہ نہیں ہے۔ تیرے جانے کے بعد ہم
 لوگوں نے دس دس دن فلسفے کئے ہیں۔ تو کچھ تو گھر کا خیال کر۔ ہم بڑھے ہیں۔ شفیع نا لاق ہے۔ اس سے
 کچھ نہیں ہوتا۔ تو بھی اگر گھر بار نہیں ہنسلے گی تو روئی بھی نصیب نہ ہو سکے گی۔ اتنا کہہ کے بے روئے
 لگیں۔ اور میں بھی اُن کے ساتھ رونے لگی اور پھر آنسو پونچھ کر نواب میراں شاہ کے محل میں چلی گئی۔ وہ دیکھ
 تک چپ رہی۔ پھر رنگ رنگ کے کہنے لگی: نواب کے منہ سے بڑی بدبو آتی تھی۔ جیسے اُس نے مرفے
 کھائے ہوں۔ اور اب تو مجھے ہر روز کے منہ سے ایسی ہی بدبو آتی ہے گلی سڑی لاشوں کی بو؟
 اکرم نے کہا: میں بدبو فود کر دوں گا۔ میں تم سے بیاہ کر لوں گا۔ تم میری زندگی میں چاند کی کرن۔ ہمنوا
 کی نور۔ پھر وہی کی تھی میں کے آؤ گی اللہ کوئی تمہیں چھوڑ سکے گا۔ اور ایک چھڑا سا آٹھن ہوگا جس میں
 تم اللہ میں اللہ ہمارے بیچے آ

اُس کی آنکھیں پکڑنے لگیں اور وہ اکرم سے پٹ گئی۔ وہی پہنچتے ہوئے کئی بار اس زرب کوٹن پکڑی ہوں۔ پھر کبھی ہر بار پہنچ سکتی ہوتا ہے۔ وقتا کہہ کے پاس کیاں لے لے کے ہونے لگی۔ اس کے دل کی آگ بجھ گئی تھی۔ اور اس کی چڑی مر گئی تھی۔ اور اس کے پنوں کے پھل مڑ جائے تھے۔ اور زندگی کے سارے غم اوریشیائی موت کے سارے آسوش و شب کے قلوب میں تحلیل ہو چکے تھے۔ اکرم نے پنگ کی طرف دیکھا۔ اور اب اُسے وہ پنگ بیت بُرا نظر آیا۔ بُرا اور سیدہ پنگ تھا۔ پاش بگ بگ سے اکڑا ہوا تھا۔ پھر دانی کی کی کی دھنکی دے دی تھی۔ اور دل گوں قوتوں کے اور گرد و مکتیاں بھینٹا رہی تھیں۔

روایت دوتے دوتے دینے سوئے پر سو گئی اکرم جوت سے اس کے چہرے کی تلون دیکھنے لگا۔ خند میں اس کے اعلیٰ ضد و خل اُبھر آئے تھے۔ اس کا نہ تھکا سا اگلا تھا۔ سوتے ہوئے پچھلی طرح دھماکہ پر تانہ سب کی سی پکڑ تھی۔ اور پکس لکس سے نہ حال ہو کے گر پڑی۔ تھیں۔ اور اس کی انجلی ہوئی آستین سے اس کی منہ کی کلائی کی گندہ گرونی نظر آ رہی تھی۔ اور اس میں ایک چوڑا سا گلا پڑا تھا۔ ایک پچھلی کلائی کی طرح اور اس کی وہاں ٹھنی ہوئی بھڑکے بچے سے کڑوا مر رہی غم نمایاں ہو گیا تھا۔ اور ایک پچھلی سوئے پر اور دوسرا سوئے سے نیچے کل رہا۔ تھا۔ اور گوں ٹخنے کے پاس ایک گڑا تھا۔ ایک پچھلی طرح۔ اور اس پچھلی کی طرف رخ سے پندرہ برس کی ہو گئی۔ اور پھر جیسے یہ تپتی تاب ہو گئی۔ اور دولت کے غم و غم میں بے بے کا خضر خضر اور اس کی ناک کی تلاش میں حال بالکی خنوت اُبھرتی نظر آئی۔ اور جڑے کی سانت میں شیفین کا شہدا میں ایک ہی چہرے میں دھماکتا جھج ہو گئے تھے۔ سورہے تھے۔ گڈنڈہ ہو کر ایک دھڑکے سے غراحت کر رہے تھے۔ سوتے دقت بھی جیسے غم کی چہرے پر جنگ ہو رہی ہو۔ سوچتے سوچتے اکرم بھی اٹھ گئے۔ اور پھر اپنا کچنک کر باطل بیدار ہو گیا۔ اکرم نے دولت کو ایک

ٹھوکا دے کر کہا: اٹھو آج کی رات سونے کے لئے نہیں ہے۔ جاگنے کے لئے ہے۔ اور ان متا
 چنگوں کی کہانی سنانے کے لئے ہے جنہیں تم نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں دیکھا ہے۔ اچھا تو بلا سونے
 چاندی اور جواہرات کے علاوہ کیا تم نے کبھی کسی لوہے کے چنگ کو بھی دیکھا ہے ؟
 وہ آنگیں ملتے ملتے ہوتی ؟ اس حوالہ میں : ” اور پھر سو گئی اور بلکے بلکے خراٹے لینے لگی “ اس میں نے
 بہت فانی تھی۔ اکرم نے بتل خانی کر کے اس میں دیا سوائی سلٹک کے پھینک دی اور توں میں ایک نیلگن
 شعلہ پیدا ہوا اور شعلے سے ایک لگی سی گونج پیدا ہوئی۔ اور پھر اکرم نے توں کے منہ پر اپنی ہتھیں رکھ
 دی۔ اور نیلگوں شعلہ بجھ گیا۔ اور گونج غائب ہو گئی۔ اور اکرم نے سوچا۔ ولایت بھی شراب کی غالی بوتل ہے
 اس کے اندر نیلگوں شعلہ بھی ہے۔ دھماکے کی گونج بھی ہے۔ مگر یہ شعلہ اور گونج شیشے کی چار دیواری اور
 ظالم تھیلی کے باہر نہیں جاسکتے۔ کیوں نہیں جاسکتے۔ بھلا کیوں نہیں جاسکتے۔ یہ کیا ہے۔ سوال اکرم کے
 غلی کے گوشوں میں چکرانے لگا جس طرح رات کی سیاہی میں تاریک کمرے میں کوئی مچھولی کی چمکاڑ
 بالکبا بچکر لگاتی ہے۔ اس طرح یہ سوال اس کے ذہن کے نبض خانے میں پکڑ لگنے لگا۔ آخر سوپ سوچ کر کہیں
 نے فیصلہ کیا۔ باہر جا کر شفیق کی رائے طلب کی جائے۔ چنانچہ اکرم لڑا کھڑے قدموں سے باہر نکل کر شفیق
 کے پاس گیا۔

شفیق ہوش کے تہے کھلے آگن میں موڑ میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

اکرم نے شفیق سے پوچھا: کیوں شفیق۔ یہ شعلہ کیوں بجتا ہے۔ یہ گونج کیوں دہاتی ہے۔ شفیق میرے لئے
 شفیق بچکر لگتی ہے۔ ” زبانی بادشاہ تیری شرب دے صدقہ۔ ایک کونٹا فقیروں کو بھی
 چھلکا دے “

گلاڑی میں بیٹر کر اکرم نے شفیق سے کہا: ”اندر جاؤ۔ ولایت بیگ کو باہرے آؤ۔“

”کیوں؟“

”مجھے غم معلوم نہیں۔ کیوں۔ ہم واپس چلیں گے۔“

واپسی میں اکرم گلاڑی چلا رہا تھا۔ پیچھے کی سیٹ پر شفیق اور ولایت بیگ تھے۔ ولایت بیگ بار بار اُٹھ کے فے کرتی۔ بار بار اکرم کو اپنی گلاڑی موکنی پڑتی۔ اک عجیب بے گلی، بے مہنی سی اُس کے دل و دماغ میں بڑھتی ہی جا رہی تھی، وہ الفاظ، اسٹیمپا، اجنام کی کھلی خوب صورتی پر تعلق کیوں نہیں ہو سکتا؟ جوشی جی نی طرح، اُسے کیا ضرورت ہے کہ وہ بریل کو گریہ اور جھیل کے دیکھے کہ اس کے اندر کیلے۔ ہر کاہش اُسے بے قرار کیوں رکھتی ہے؟ وہ چیزوں اور رشتوں کو جیسی وہ ہیں کیوں منظور نہیں کرتا۔ بھڑکی کتنا خوش رہ سکتا ہے۔ ہر عزت کو آرام سے ایک قبرستان کی طرح سو سکتا ہے۔ اکرم نے سوچا۔ آخر وہ کیا چاہتا ہے۔ زندگی سے۔ اپنے کام سے۔ لوگوں سے۔ ہمدرد کے ماحول سے۔ وہ کیا چاہتا ہے اُن سے۔ کیوں وہ انہیں منظور نہیں کرتا۔ جیسا جوشی جی نے منظور کر لیا ہے۔ راج تانے منظور کر لیا ہے۔ اور باغرائے منظور کر لیا ہے۔ کیوں نہیں اکیوں نہیں وہ بھی منظور کر لیتا۔

ولایت بیگ شفیق کو اُن کے بٹول میں چھوڑ کے۔ جب اکرم واپس پرل پہنچا تو رات کے دو بج رہے تھے۔ رشیدہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اس نے میٹر میں ہر اکرم کے لاٹھڑی لٹے ہوئے قدموں کی چاپ سُنی۔ اور چپ چاپ جہانہ کھول دیا۔ اکرم اندر آ کے ایک ٹرنک پر بیٹھ گیا۔ اور اپنے اُچھے ہوئے گنگر لائے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ دھیرے دھیرے

رشیدہ کچھ بولی نہیں۔ چُپ چاپ اُس کے پاس کھڑی تھی، بیک ایک اکرم نے کہا۔

”میں غم غم نہیں بناؤں گا۔“

”کیوں؟“ رشیدہ نے چونک کر پوچھا۔

”بس! میں منظر نہیں کر سکتا = اکرم کبھی مجھے میں ایک نئی سخی تھی۔

”کیا منظر نہیں کر سکتے؟“

”وہ سب کچھ جو وہ کہتے ہیں اور کرتے ہیں؟“

”وہ تو کون ہیں؟“

”وہ بہت ہیں۔ سیکڑوں ہیں۔ ہزاروں ہیں۔ اور انہوں نے فلم انڈسٹری کو اپنی سخی میں لے رکھا ہے۔“

”پر تم ان کا مقابلہ کیسے کر گئے؟“

”کیوں کر وہ سیکڑوں ہیں۔ ہزاروں ہیں۔ مگر لاکھوں نہیں ہیں۔“

”اور وہ لاکھوں تمہارے ساتھ ہیں؟“

”میرے ساتھ تو نہیں ہیں۔ لیکن میں ان کے ساتھ ہوں۔ کیا؟“

”میرے خیال میں تمہیں ٹھنڈے پانی کی ضرورت ہے۔“ رشید نے اکرم کو گروں سے بچڑا دیا۔

”کاسٹل کے نیچے رکھ دیا۔ اور اوپر سے تل چھوڑ دیا۔“

اکرم باخڑا کی کمزوری تھا۔ اس لئے جب اکرم نے باخڑا سے کہا کہ وہ اس کی بچہ نذر عرش

کی کدایت کامی نہیں سرانجام دے گا۔ تو باخڑا نے اسے بہت بھایا۔ بہت اونچی نیچ لگائی منڈی

کی بُری حالت۔ قانون کی تصویریں۔ بستیل کا لالچ۔ اگر وہ۔ تصویر کا سیلاب کر سکا تو آگے اپنی مرضی

کی تین چار تصویریں بنائے گا۔

”تم جانتے ہو؟“ باخڑا بولا۔ ”میرے ہاں تو ڈائریکٹر ہی بھی کچھ جانتا ہے۔ ایک طرح سے وہی پکیر کا

پہاڑیو سر جڑا ہے۔ یہ یہ بھی اسی کے کہنے سے خراب ہوتا ہے۔ بس ایک دفتر میں کہانی پسند کروں،

اور وہ اداکاروں کا انتخاب ہو جائے۔ آگے میں کبھی دخل نہیں دیتا۔ میں تمہیں ابھی تمہاری مرضی کی تصویر دیتا

”گڑیا کروں۔ زمانہ خراب ہے۔ لوگ اچھا سبیکٹ (موضوع) چاہتے ہیں۔“

”اچھا سبیکٹ — کون سا ہوتا ہے؟“ اکرم نے پوچھا۔

”جو پلے؟“ باخولہ نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”اچھا اداکار کون سا ہوتا ہے؟“

”جو پلے۔“

”اچھا سنگیت کون سا ہوتا ہے؟“

”جو پلے۔“

”بیرانی بڑود کر اور نا سنگیت کون کون اچھا آرٹسٹ ہے؟“

”نا سنگیت کون۔“

”حلق محمود اور بیڑے غلام علی خاں میں سے کون اچھا ہے؟“

”حلق محمود۔“

”بال گنگا دھرتی کے بہت اور میڈی لاما میں سے کون اچھا ہے۔۔۔۔۔“

”کیا اسماعیل بات کرتے ہو؟“ باخولہ نے ذرا غصے سے کہا۔

اکرم بولا: ”میں تم کو بتاتا ہوں۔ میڈی لاما راہی ہے۔ کیوں کروڑ چلتی ہے۔ اور بال گنگا دھرتی کا بہت

چروائی پر کھڑا رہتا ہے۔ تم بالکل ٹھیک کہتے ہو، اس دن تلک کی بری تھی، اور اتفاق سے اُسی دن

میڈی لاما بھی کے ہوائی اڈے سے گزر رہی تھی۔ اس دن بھی کے ہوئی اڈے پر ہزاروں آدمی جیسے تھے

اور چروائی پر فصل سے چندہ میں آدمی ہوں گے۔ کیونکہ میڈی لاما راہی ہے۔ بلکہ اُرتی ہے۔ اور تلک

اپنی جگہ کھڑا ہے۔ اس لئے میں غیر خوش نہیں بناؤں گا۔“

”کیوں؟“

”کیوں کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ تم چلتے ہو۔ اور میں بیٹھا ہوں۔ ایک دن نہوٹی بھی اسی طرح بیٹھا تھا۔ اور پھر ایک سب اس کی جھولی میں گرا اور زمین کی کشش ثقل و ریالت ہو گئی۔ ایک دن تہا را سینا نہ تھا ایک دن آپ کی تصویریں حرکت نہ کرتی تھیں۔ وہ ہلتی نہ چلتی تھیں۔ وہ بیٹھی تھی۔ اس بیٹھے اور چلنے کے بیچ میں ایک رابع صدی کے سائنسدانوں اور محنتی آدمیوں کی ان تھک کا دشوں، ناکامیوں اور محو میں کی داستان ہے۔ ان لوگوں کا شکرا ادا کرو سیٹھ جن کی وجہ سے آج یہ سینا پلتا ہے۔ اور تم لاکھوں کلماتے ہو۔“

”میں سوچ نہیں ہوں۔ جنس میں ہوں۔“ بانکرا یلے اسے یاد دلایا۔

اکرم نے کہا۔ ”سیٹھ ہر چیز جو کچھ چلتی ہے۔ کبھی نہیں چلتی تھی؟“

”اس دن میں اسے خرید لوں گا۔“ سیٹھ بولا۔

”تو جب تک مجھے خون نہ کھنکے دو۔“ اکرم نے اپنی منگنی بھیج کر کہا۔

”تم خون کیوں تم کو۔ تم کیلٹی ایک میں آرام سے کیوں نہ گھومو۔“ بانکرا یلے مسکرا کے کہا۔

”اپنا اپنا وصل ہے سیٹھ۔“ اکرم نے کہا۔ کسی نہ کسی کو تو یہ کام کرنا ہے۔ مگر میں تم سے یہ بات کیوں کر رہا ہوں۔“

اکرم اٹھ گیا، اور سیٹھ کی کہیں کا مددازہ کھول کے میڈم کے کہیں میں داخل ہو گیا۔ میڈم کے کہیں کا مددازہ کھول کے جوشی کے کہیں میں داخل ہو گیا۔ جوشی کے کہیں کا مددازہ کھول کے باہر ہال میں پلا گیا۔ ہال سے باہر نو بہارت پرودش کے دفتر کے باہر چلا گیا۔

سیڈم اور جوشی دونوں اُس کے چلے جانے کے بعد بانکرا یلے کے کمرے میں آئے۔ میڈم نے پوچھا۔ ”نہیں ماما۔“

”نہیں۔“

”تو بچہ تم۔ یہ کچھ بھی خوشی ہی کو دے دو۔“
 ”مگر ان کے پاس پہلے ہی سے دو کچھ ہی موجود ہیں۔“
 ”کوئی بات نہیں سیٹو۔ میں اسے بھی غسل کروں گا۔“ خوشی ہی نے کہا۔
 ”اچھا۔“

خوشی کی آنکھیں خوشی سے پھٹنے لگیں۔ اُسے اکرم خدا بھی پسند نہ تھا۔ سالاس طرح میری طرف دیکھتا تھا۔ جیسے میں کوئی مودی کا کیڑا ہوں۔ آج حساب برابر ہو گیا۔

بابر اکرم دادہ میں روڈ سے گزر رہا تھا۔ غلام ایگٹر ایفین کے دفتر کے باہر بہت سے عیطل
 بمائیوں کے ہاتھ اسے سلام نہتے کھٹکے تھے۔ اکرم ہاتھ ہلاتا ہوا آگے کے ایرانی رستوران پہ
 چلا گیا۔ رگ آج بکے سلام کہتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ اس غیر عوامی شخص کا ڈائریکٹر ہوں۔ کل
 ان کا رویہ مختلف ہو گا۔ چلنے کی پیالی منگوانے کے اکرم سوچنے لگا۔ مگر کل تم کیا کرو گے۔ اکرم آج تم
 بڑے بہادر تھے۔ بڑے جری۔ نہایت صاف گواہ تم نے خداؤں اور پیغمبروں کی طرح بات کی
 لیکن کل تم کیا کرو گے اکرم؟

چلنے بڑی کڑوی تھی۔ اکرم کا دم رستوران کی گلی کی اور دھوئیں سے گھٹنے لگا۔ وہ جلدی سے چائے
 پانی کے شواہی پارک کی طرف پیدل چل کر آیا۔ آج وہ سمندر سے باتیں کرے گا۔ یہ لوگ اُسے بھر
 نہیں سکتے۔

بہت دیر تک وہ شواہی پارک کے ساحل پر گھومتا رہا۔ اس کی بھری تھی ہوائی تھیں اور
 ہونٹ بچنے ہوئے اور اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی اس کے دل کی بحث ختم نہیں ہوئی۔ پھر کیا

اکرم ساحل کی ریت پر چڑھ گیا وہ ٹھیکوں کی ریت بحرِ بحر کے گرانے لگا اور سوچنے لگا۔

زندگی بے بار نہیں آتی ہے۔ موت ایک بدلتی ہے۔ اہد وقت سمجھ کے گذرے ساحل پر پہلی ہوئی
اس بے کار ریت کی طرح ہے۔ تم۔ اکرم۔ اس میں سے ایک ہڈی کتنی مٹیاں بھر سکتے ہو
ایک۔ اور اکرم نے ریت سے ایک ٹھنڈی بھر لی۔ یاد۔ اہد اکرم نے ریت سے دوسری
ٹھنڈی بھی بھر لی۔ بس ایک ٹھنڈی یاد ٹھنڈی وقت۔ پچاس برس یا سو برس۔ مگر اس سے زیادہ نہیں۔۔۔۔
پھر۔۔۔ سوچو تم اس ریت کو کھا نہیں سکتے زیادہ سے زیادہ تم اس ریت کو دھروں کی آنکھوں میں
جھونک سکتے ہو۔ سینو یا کڑا ایک طرح۔ اہد بہت سے لوگ اپنی زندگی میں یہی کرتے ہیں اور وہ لوگ
عالم جوتے ہیں۔ پھر کچھ لوگ جوتے ہیں جو اس ریت کو دھروں کی آنکھوں میں ڈالنے کے بجائے اپنی
آنکھوں میں ڈال لیتے ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے اہد عزت پسند جوتے ہیں۔ کچھ لوگ اس ریت سے نعل بناتے
لگتے ہیں۔ اہد وہ لوگ احمق ہیں۔ کچھ لوگ ہدایت اختیار سے ریت کے ایک ایک ذرے گئے گئے
ہیں۔ اہد وہ اس دنیا کے کچھ ہیں۔ کچھ لوگ اس ریت کو اپنے سر پر اٹھا کر ڈال لیتے ہیں اور جتنے
لگتے ہیں۔ اہد وہ لوگ اس دنیا کے بچے ہیں یہ اہد اس دنیا کی ساری خوب سہتی اہد مصروفیت انہیں
کے دم سے قائم ہے کچھ بھی جو جلتے۔ اکرم نے سوچا۔ میں تجھ ہی جنوں کا۔
اور وہ ساحل کی ریت سے اٹھ کر گھر کی طرف چل کر اٹھا۔

رفیعہ بہت اُداس تھی۔ اس ماہ اسے کام بہت کم ملا تھا۔ وہ بھی دو چار بار رضیہ کی
 سفارش سے۔ اور دو ایک بار فوری مہرجت کے تحت ٹائر کیڑوں نے اسے سیٹ پر بلوایا تھا۔ منتظر
 سنا تھا۔ وجہ وہی پڑتی تھی۔ اور وہ جانتی تھی۔ مگر اپنی عادت سے مجبور تھی۔ اپنی بہن کے ایک بچے کی
 بھٹی بکری سے بیٹے اس کے منہ سے بچا تھا۔ آگ آہٹ لگی۔ کیوں کہ وہ بڑی بڑی اُمیدیں لے کر بیوی
 آئی تھی۔ کیا برا اگر اس کا رنگ سلاوا تھا۔ میک اپ کے بعد ظم میں سلاوا پس تو رکائی نہیں دیتا۔
 پھر اس کے چہرے کے نقوش اتنے بُرے تو نہ تھے۔ رضیہ نے وہ ٹیکر جو وہ اس وقت سی رہی تھی یہ
 خیال کرتے ہی میں نریش پر چھوڑ دی۔ اس آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اور خود سے اپنا چہرہ دیکھنے لگی
 وہ دل میں کہتی بار جب بھی اُسے موقع ملتا تھا ایسا ہی کرتی تھی۔ وہ اس مضمون پر تھا جیسے اس کے دل کے
 اندر کوئی مشہد ہے۔ بیسے وہ بار بار ملانے کی کوشش کیا کرتی ہے۔ اس وقت بھی اس نے ایسا
 ہی کیا۔ بُرے غمزے اپنے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ دل ہی دل میں تجزیہ کرتے ہوئے اس نے اپنے چہرے
 ہلکے کان آٹھیں، ابرو، ہونٹ، دانت، وصال، ٹھوڑی اپنے چہرے کے ایک ایک عضو کو اپنے
 دھن کے پچ کش سے کھول کر مٹی شین کے پرزوں کی طرح آئینے کی سٹا پر رکھ لیا۔ اور انہیں بُرے

ہتھیلیا سے ٹکٹ پٹٹ کر ٹٹل ٹٹول کر پرکھنے لگی کہ کہاں نقص ہے۔

عورت جب اپنا چہرہ دیکھتی ہے۔ تو سب بھول جاتی ہے۔ وہ دقت بھول جاتی ہے۔ ماحول بھول جاتی ہے۔ اور بھول جاتی ہے۔ کہ وہ کہاں کھڑی ہے۔ اس سے پہلے وہ کیا کر رہی تھی۔ اس کے بعد بولے کیا کرتا ہے۔ مہر اپنا چہرہ اپنے دل کے اندر چھپا کر رکھتا ہے۔ لیکن عورت اپنے چہرے کو آئینہ۔ رخسار اور جوتھوں کی سطح پر باہر لے آتی ہے۔ اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے رعبہ کہ یہ احساس نہ ہوا کہ کب اس کی کھولی کا دروازہ کھلا۔ کون اندر داخل ہوا۔ اور وہ بے پاؤں آہستہ آہستہ آگے آتے ہوئے اس کے پیچھے کھڑا ہوا اس تسلسلہ پہنچا کہ وہ اپنا چہرہ دیکھنے میں مصروف تھی۔

پھر کسی نے نہیں کر کہا۔ کیوں آئینے میں اپنی صورت دیکھتی ہو۔ تم تو ذرا بھی خوب صورت نہیں ہو۔
اک جلی سی خیرت کی چٹخ لہ کے پیچھے کوٹھری۔ یہ عشرت تھا۔ اور ایک سبز دھاریوں والی ٹی شرٹ اور نئی پتلون پہنے ہوئے۔ جوتے چمکائے ہوئے۔ اس کی لڑت دیکھ دیکھ کر شکر ا رہا تھا۔ بھل میں اُس نے ایک بٹنل ڈبا رکھا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ رعبہ نے پوچھا۔ اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔

عشرت نے مسکرا کر بٹنل کھوا۔ اس میں سے پانچ سو فی ٹیکریں نکالیں۔ یہ رعبہ کی ہمیں کے بچوں کے لئے تھیں۔ پھر اس نے ایک قمیص اور چوڑی دار پانچ لہ کے کا کپڑا نکالا۔ یہ رعبہ کی اماں کے لئے تھے۔ پھر اس نے بٹنل کا خالی کاغذ اٹھا کے کوٹھری سے باہر پھینک دیا۔ رعبہ خوش بھی ہوئی لیکن کچھ اُداس بھی۔ عشرت اس کے لئے کچھ نہیں لایا تھا۔ اور یہ باتیں وہ بے مشرت نے اُسے دس دس کے تین نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

”یہ کا بجے کے لئے؟“ رعبہ کے دل میں ایک جلی سی امید کی کرن آہستہ سے جاگ۔

عشرت نے کہا ”تمہارے گھر میں رہتا ہوں۔ بولی کھاتا ہوں۔ سوتا ہوں۔ تم کوئی سی سورت کی چارانی

ہو کہ تک خیرات بانٹے جاؤ گی ؟

رضیہ کو اس بد بولوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس نے روپے لے لئے۔ ایک بار بھی اٹھا کر نہیں کیا۔ لیکن اس کا دل اندر سے جیسے میوہ گیا ہو۔ عشرت ایک ماوے یہاں رہ رہا تھا۔ ان کے تعلقات بے تحاشہ دوستوں کے سے تھے۔ وہ اسے بہت پسند کرتا تھا۔ لیکن اس کی عزت بھی کرتا تھا۔ اس کی قربت بھی ایک دھڑکی تھی۔ اور اس کے نزدیک آنے میں بھی ایک فاصلہ تھا۔ ایک خوش گواری جھجک و کجی بھی قرضہ کو بیت اپنی معلوم ہوتی۔ کبھی کبھی کھل جاتی۔ کبھی بار باتوں اور بحثوں کے دوران میں رضیہ نے عموماً کیا۔ جیسے عشرت اسے عجیب سی محاکا ہوں سے دیکھ رہا ہے۔ جیسے اس کا دھیان اس کی باتوں میں نہیں ہے۔ اس کی محاکا رضیہ کے جسم پر چھپاتی ہوئی جا رہی ہے۔ رضیہ کو اپنے چہرے پر شبہ تھا۔ اپنے جسم پر شبہ نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ایک بہت ٹہنی دل کش موتی۔ انہوں میں والے مناسب جسم کی مالک ہے۔ جو چلتے چلتے اکثر لوگوں کو لپٹ کر اس کی طرف دیکھنے کے لئے مجبور کر دیتا تھا مگر کیا ایک بار بھی تو ایک ماہ میں عشرت نے کوئی چھوٹی حرکت نہیں کی۔ اور وہ بگاہ قزاقی مصوم ایسی چھپتی ہوئی تھی کہ اس کا کچھ بھی مطلب نے کتنی تھی۔ اچھا بھی بُرا بھی۔ شاید عشرت مجھے پسند نہیں کرتا ہے۔ مگر وہ چاہتی کیوں تھی کہ عشرت اسے پسند کرے۔ بلنے کیوں چاہتی تھی۔ اسے تو ان باتوں سے شدید نفرت تھی۔ پھر وہ کیوں چاہتی تھی کہ عشرت ہر کوئی نہیں۔ لیکن عشرت ضرور چاہے۔ ایک بار ان محاکا ہوں سے اس کی طرف دیکھ لے۔ نہیں۔ نہیں۔ وہ کہاں دیر پا چاہتی ہے۔ منت بھیجی۔ اُجاڑا۔ اسی مردوں پر۔ بڑے سختے ہوئے ہوتے ہیں۔ عشرت نے کہا : اب تم یہ آئیے چھوڑو۔ اند جلدی سے ساڑھی بدل کے میرے ساتھ باہر چلی جاؤ۔

”کہاں ؟“

”کہیں بھی نہیں گے۔“ عشرت نے بڑی فراخ دلی سے اس طرح بانو پھیلا کے کہا جیسے آج سنا دی

زمین اور آسمان اس کا ہو۔

”بھی ساڑی ٹیک ہے۔“ رضیہ نے ذرا شکوک لہجے میں اپنی ساڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اوں ہوں! نہیں چلے گی مادام!“

عشرت کمر کی پر جگہ کے کھڑا ہو کے باہر دیکھنے لگا۔ رضیہ ساڑی بدلنے لگی۔

عشرت نے کمر کی سے ٹپے بغیر کہا: ”اب گوم کے دیکھ لوں۔“

”نہیں! نہیں۔“ رضیہ ایک کونے میں سے بلائی: ”ابھی نہیں۔ میں ساڑی تبدیل کر رہی ہوں۔“

”اؤ کے! عشرت ہنسنے لگا۔

بائی کھلے شینڈ پر عشرت نے زور سے مٹی بکائی اور ایک خالی ٹیکسی پکڑ لگے کے بڑے زلفے

سے ان کے قریب آ کے فٹ پاتھ کے قریب کھڑی ہو گئی۔ رضیہ نے حیرت سے کہا: ”ٹیکسی میں؟“

عشرت نے ٹیکسی کا دروازہ اس کے لئے کھول کر اور بڑے احترام سے جھک کر کہا: ”مکے عالم کے لئے۔“

رضیہ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ اس کے قریب عشرت آ کے بیٹھ گیا۔ ٹیکسی کا دروازہ زور سے بند ہو گیا۔

”کہاں چلیں گے؟“ عشرت نے پوچھا۔

”تم۔ تم کو۔“ رضیہ کو اپنی آواز بڑی اجنبی معلوم ہوئی۔ عشرت نے چند لمحوں کے لئے سوچا۔ پھر اس نے

شکوک کے عجیبی ڈراما سے کہا: ”سینٹر کو لا پے چلو۔“

ٹیکسی ڈراما سے مسکرا کے اپنی ٹوپی ڈھکی، اور ٹیکسی کی رفتار کا ایک تیز کر دی۔ اور رضیہ ایک دھچکے

سے عشرت کی گود میں جا پڑی اور عشرت کے ترے ہوئے منتھوں میں کسی پراسرار خوشبو کی تھک تیر گئی۔

رضیہ نے جلدی سے اپنے آپ کو عشرت سے الگ کیا۔ اور اپنی سیٹ پر احتیاط سے بیٹھ گئی۔ مگر وہ چاہ

لوں کا لمس بہت دیر تک کسی سار کے دم پہٹے سروں کی طرح اس کے دل و دماغ میں لڑتا رہا۔
 کولہے میں سوزین ایڈریڈز شوکی دکان پر عشرت نے جھکی کور کا اور رضیہ کو بے کر ہلا چلا گیا۔
 ہی ایک باگی چھری ایچوانڈین لڑکی سے کہنے لگا: "وہ شوکیں ہیں جو ہنرنگ کی اونچی اڑتی کی
 سینڈل ہے۔ وہ لے آؤ۔"

وہ لے آئی۔

عشرت نے رضیہ سے کہا: "ٹرائی کرو۔"
 سینڈل فدا بڑی تھی۔

سوزین بولی: "میں آپ کے ساتھ کا سینڈل لاتی ہوں۔"
 رضیہ نے وہ سینڈل پہن لی۔

"اب چلو" عشرت نے رضیہ سے کہا۔

رضیہ اپنی ہنر سازی کو نبھاتے ہوئے دکان کے اندر بچے ہوئے ٹاپے پر چلنے لگی جتنے
 پلٹے خود خود اس کی کر کا خم واضح ہوتا گیا۔ سینہ اُبھرا آیا۔ چال میں ایک ٹگنت ادا داسپا ہو گئی عشرت
 نے تالی بجا کے کہا: "فرسٹ کلاس!"

سوزین بولی: "اسے باندھ دوں؟"

عشرت نے کہا: "اسے نہیں، اسے نہیں۔" عشرت نے رضیہ کے گبے ہوئے پُرنے چپلوں کی طرف
 اشارہ کیا۔

سوزین نے مسکرا کر انہیں ایک قہقہے میں مکہ دیا۔ عشرت نے وہ قہقہہ اُٹھالیا۔ بلی ادا کر دیا اور رضیہ
 کے ساتھ آ کے باہر بھیجی میں بیٹھ گیا۔ جیسی دالے سے کہنے لگا: "سیٹھ انڈیا گیٹ چلو۔"

انڈیا گیٹ بچا کہ عشرت اور رضیہ دلوں ٹھیکسی سے اترے۔ عشرت کی بیل میں پُرانی چپلوں کا

اُدب تھا۔ سمندر کے کنارے کنارے ایک اونچی دیوار تھی۔ عشرت نے بازو گھما کے زور سے وہ ڈبہ سمندر میں بھینک دیا۔ رُفیع چلائی رہ گئی۔

”کیا کرتے ہو کیا کرتے ہو۔ میری چیل؟“

عشرت نے کہا: ”مام۔ یہ پُراے پنڈت ہیں اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ اب خدا اس اونچی ایڑی والے بزرگ کے سینڈل میں اپنی سبز ساڑی کو جھلاتے ہوئے چلو۔ دیکھو تمہاری خوب صورتی کا ہر غم کیسے جھلکتا ہے تمہارے جسم کا جزا یہ اس ساڑی کے باوجود کیسے چمک چمک کر باہر آیا ہے۔ ماما تم عورت نہیں ہو خوبصورت کی اٹلیکس ہو!“

رُفیع کی آنکھیں یکایک سترت سے پکپکنے لگیں۔ حیرت۔ سترت اک نامعلوم سی حیرت تھی۔ بولی ”یہ آج تمہیں کیا ہوا ہے؟“

عشرت نے کہا: ”کو نہیں آج ہوا جی ہے۔ گل ہر کے پھول جھولتے ہیں۔ سمندر قہقہے لگاتا ہے بلوب کہاں چلوی؟“

رُفیع نے کہا: ”میں تو کتنی مٹھی پاٹ کھاؤں گی۔“

ہو پانی پر انہوں نے کتنی مٹھی پاٹ کھائی۔ وہاں سے کولا بے واپس جا کے انہوں نے سالز برگ میں آئس کریم کھائی۔ سالز برگ سے وہ لبرٹی کے سامنے گئے۔ جہاں رُفیع اور عشرت نے سگتے کے پھلوں کا رس پیا۔ یہاں لگی لگی بارش شروع ہو گئی۔ رس والے کے سینڈل کے نیچے کھڑے کھڑے عشرت لبرٹی کی بوتلوں میں رُفیع کی جھلکیاں رُفیع کے چہرے پر گزرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ارغوانی۔ شہابی۔ گلابی۔ نیلم۔ یاقوت۔ فیروزہ۔ پھراج کتنے ہی خوب صورت جواہرات کے رنگ رُفیع کے چہرے پر سے گزرتے جا رہے تھے۔ اور وہ اس وقت کتنی خوش تھی۔ اپنے آپ میں کہتی ہوئی سانس تیز چلتی رہی۔ بچوں کی طرح خوش معصوم اور پُر اعتماد....

دھیرے دھیرے بارشیں جو رہی تھیں۔

بارش روشتیاں، دھند، لوگوں کی گفتگو میں دوسری دنیا سے آئی ہوئی رقص کا ہم تنہا سبب، جوں جوں کسی پرانی، جہنی پر اسرار خوشبو میں، کا ہوا ہشت نے اپنی آنکھیں بند کر کے اس کا گھٹ پٹا پیدا آہستہ آہستہ ایسے دھندلے صفائے طہاس کے ایک ایک قطرے سے حظ اٹھا رہا تھا۔

یہ ایک بارش تیز ہو گئی۔ اور دونوں ٹکسی میں جا پہنچے ٹکسی چلنے لگی بارش کے تیز چڑھنے سے نذر و در کوئی سے کاٹنے کی کھڑکیوں سے ٹھکرا کر بچنے لگے۔ باہر طعناں بڑھ رہا تھا۔ لیکن اندر کتنی خاموشی تھی۔ کتنا سکون تھا۔ وہ اور رضیہ کل پھر غریبی ہو گئی۔ اُور اسی، وہ جانکاہ محنت، لہو کا کیل، احساس کا دھوکا اور وہ غریب جو یہ سماج محنت کو ہمیشہ پس ہے، مگر آج، یہ اس وقت کا تو کس قدر قطرہ کشیدگی ہوئی خوب صورتی اور مسرت کا ہے۔

رضیہ نے سوچا۔ ہائے یہ کتنی صدیوں کے بعد آتا ہے۔ ہائے میں کیسے اس کا دامن بھر کے اس کے پاؤں سے پٹ پٹاؤں۔ تاکہ یہ ٹھک کہیں بھاگ نہ جائے۔ میرے لمبے، میرے اپنے لمبے میرے اپنے پیارے لمبے آ میرے سینے سے لگ جا۔ میں تجھے اپنی چھاتی سے لھکے لوری سنائیں گی اور تو میری گود میں۔ میرے سارے اوصاف سنوں، میرے سارے سیرے خوابوں کو دیکھنا ہوا۔ سو جائے گا۔ میرے فتنے لمبے.... سو جا.... سو جا.... !

معلوم نہیں وقت سو گیا، کر رضیہ کے احساس ہو گئے، اس کے سارے شہجہ سو گئے، وہ جھکی ہوئی راہیں اور عتیں، وہ خوف اور ڈر اور بے گناہی کے سوچوں سے ملنے سمٹ کر سو گئے اور اس نے ایک ایسی تازہ بھری، ایسی اطمینان کی، اٹکا اور بھروسے، مسرت اور خوشی سے لبریز آہ، جو اپنی اس جلد کے اندر سارے جہاں کی طرف ناگ فرمیں چیلے ہوئے تھی، کوئی مرد اس طرح سے آہ نہیں بھر سکتا عورت بھی کبھی نہیں، ایک بار زندگی میں یا دو بار یا تین بار، لیکن بار بار نہیں، یہ آہ جو آہ نہیں ہوتی زندگی

کی گہری گھبراہ ہوئی ہے۔

رفیہ اب جیسی سے اُتری تو ایسے لاکھڑا رہی تھی جیسے اس نے غشی کی شراب پی ہو، عشرت نے جیسی چھوڑ دی۔ اب وہ میرن ڈھائیو کے آخری سرے پر کھڑے تھے۔ اور بند کے اُس کنارے کی طوت جا رہے تھے جو سمندر کے بیچ میں چلا جا رہا ہے۔ اب باش رنگ گئی تھی اور چاند کی طوت دُسمند چھا گئی تھی۔ اور وہ دونوں خاموشی سے چھروں کے چنے پر بیٹھ کر سمندر کی بے قرار لہروں کو چھروں سے ٹکرا کر واپس جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔

بڑی دیر تک خاموشی رہی۔ رفیہ اور سے خاموش تھی۔ لیکن اس کا دل ایک عیب تلپ اور بے قواری سے بھر گیا۔ بے قواری جو بولتی نہیں ہے۔ لیکن دل میں ایک خبر کی طرح چھپی رہتی ہے۔ عشرت رفیہ کو ایک بڑائی منزل سناتے لگا۔

غزل تُوں کر بھی رفیہ خاموش رہی۔ سمندر کی لہروں کی طوت سمجھتی رہی۔
 لکھو سے کے بعد رفیہ نے کہا۔

”عشرت!“

عشرت رفیہ کی طوت دیکھنے لگا۔

رفیہ نے کہا: مجھے بھوک لگی ہے۔

عشرت نے کہا: یہاں جنوں کے سوا کچھ نہیں ہے گا۔

”چنے ہی لے آؤ۔“

بلی بلی سردی میں گرم ٹنگٹنے۔ ٹبر ٹبر بے ٹھننے ہوئے جنوں کی خستہ روی۔ وہ ہونٹوں کے اندر سے کڑک کڑک کی دھیمی دھیمی آواز۔

رفیہ کا پی جنوں کے لئے چھا اٹھا، عشرت چنے لینے چلا گیا اور دیر تک عشرت کو دھند میں غائب ہونے

ہوئے کھنٹی رہی۔ اے خدا! یہ منظر کس قدر حسین ہے۔ وہ تو اس لمحے کا بل کہی نہ تھی وہ تو اس لائق نہ تھی کہ کہی ایسی خوب صورتی کے نازک نقوش چھو سکتی۔ یہ گہری پراسرار دھند جو دنیا کی بد صورتیوں کو اک ہر ایک اس کی طرح ڈھک دیتی ہے۔ اور خوب صورتیوں کو ابھار دیتی ہے۔ برہنہ ہوتی چیزوں کو اپنے ہاوس میں آراہم سے سلا دیتی ہے۔ اور ساکت چیزوں کو چلنے کی قوت عطا کرتی ہے۔ رخصیہ نے گھوم کر اندر دیکھا بدو عشرت غائب ہوا تھا۔ میرین ڈائری کی بندھنیں سلج سے اوپر اٹھ گئی تھیں۔ اور دھند میں پٹے ہوئے جہانوں کی طرح اپنے روشن کالج کی کھڑکیاں کھولے ہوئے تیر رہی تھیں۔ اور ان بلا لگوں سے پرے ایسی حیرت کی آخری گر جانا منزل کسی بار بانی جہان کے لاجبے ستوں کی طرح دھند میں ڈھنپتی ہوئی سلو ہوتی تھی۔ اور بیک ذریعے غمی سے مگر چھوٹے چھوٹے ڈھنگوں کی طرح اپنے فکر سے اکڑ کر دھند میں بچے جا رہے تھے!

پھر رخصیہ نے دھند میں آتے ہوئے عشرت کا چہرہ دیکھا۔ اور وہ لمحہ اور وہ چہرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی روح پر ترسم ہو گیا۔ وہ چہرہ وہ کہی بھول نہیں سکتی۔ دھند میں پٹا ہوا۔ خاموش خوب صورت۔ آنکے ڈھلتا ہوا چہرہ۔ وہ چہرہ جیسے اُس کی طرف مٹتا ہوا آ رہا تھا یا اُس سے بھی پہلے کسی پہلی ہوئی لائق ہی دنیا کی طرف تک رہا تھا۔ کیسا خاموش مٹا ہوا۔ اپنے آپ میں کھو رہا ہوا۔ کھد کسی دنیا کی گواہ نہ تھا۔ وہ چہرہ آ رہا تھا۔ اور کیا ایک رخصیہ کا دل خوف سے لرز گیا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے دل میں خیال آیا کہ یہ چہرہ کہیں دھند میں غائب ہو جائے گا۔ اس کی آنکھوں کے اوپر سے تیرا ہوا۔ ان بلا لگوں، دھند لگوں، روشنیوں پر تیرتا ہوا دھند کے اجنبی پراسرار سیاہ و سفید راستوں پر چلا جائے گا۔ جو زندگی اھ موت کے بلا سے ہیں۔

مگر نہیں وہ چہرہ قریب آ گیا۔ قریب آ گیا۔ بالکل اس کے قریب آ کے جھک گیا اور اس وقت رخصیہ کے سامنے اس کی آنکھوں میں بھٹ آئے تھے اور نہ وہ کچھ سن سکتی تھی، نہ دیکھ سکتی

تھی، نہ محسوس کر سکتی تھی۔ سرت یہ ایک چہرہ تھا۔ ایک وہ تھی اور کچھ نہ تھا۔ تاریک سمندر تھا۔ تاریک زمین تھی۔ تاریک وحشت تھی۔ اور وہ چہرہ تھا۔ روشنی کے کنار کی طرح طوفان میں بلند اور مضبوط اور جامد۔ رضی نے بے قرار ہر عشرت کی بانہہ پکڑ لی۔ عشرت نے جنوں کی پٹریاں سے دیتے ہوئے کہا "بڑی بھوک ہو!"

بھوک تو وہ ہے۔ مگر عشرت کیا تم میری اس بھوک کو سمجھ سکتے ہو۔

عشرت نے سمندر کی لہروں میں چنے کا ایک دانہ پھینکتے ہوئے کہا "رضی! میں بہت خوش ہوں۔ آج مجھے خوشی جی کی کچھ سیل ایک چھوٹا سا دول ملا ہے۔ بہت چھوٹا سا ہے۔ اگر دول ہے۔ اور یہ وہی خوشی جی ہیں جنہوں نے مجھے فلم ٹسٹ میں خیل کر دیا تھا۔ آج انہوں نے مجھے ایک سو روپے ایڈوانس میں دئے۔ اب ہم۔۔۔ اب ہماری حالت وہ نہیں رہے گی؟ یہ ہم۔۔۔ ہائے لوگ کن ہیں۔ رضی کا دل کانپنے لگا۔ وہ کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر چپ رہی۔

عشرت ہونے ہوئے کہنے لگا۔ جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو "اس ماہ میں نے تین سو کئے ہیں۔ اگلے ماہ چار پانسو کما لوں گا۔ پھر ہم یہاں بمبئی بازار کی اس گندری کھولی میں تھوڑی دھن کے، کوئی عمدہ چھوٹا سا ٹیکسٹ ایس کے۔ ایک کروڑ تیار ہو گا۔ ایک میرا۔ ایک آٹاں اور گڑوں کے لئے۔ ایک سو روپے ہر ماہ اپنی آئی کو بھیجا کروں گا۔ پھر ہم...."

پھر وہی تم۔۔۔ رضی نے گویا اندر سے اپنے کان بند کرتے جھوٹے اپنے آپ سے کہا۔ ہیں ہم کو مت سنو۔ اس ہم کے قریب مت جاؤ۔ جس ہم کو اندر مت لئے دو۔ دیکھو تم کیسے کانپ رہی ہو۔ یہ ہم کوئی نہیں ہے۔ یہ کہیں نہیں ہے۔ یہ ہم تو بالکل اجنبی ہے۔ یہ ہم جراثیم کی ہوائوں میں آیا ہے اور محبت کی مٹی کی آواز میں کے آیا ہے۔ اس ہم سے نکلی بھوک۔ رضی۔ اپنی روح کی مادی کھرکیاں روشن دان بند کر لو۔ اور اس ہم کو کبھی بھی مت آئے دو۔

مجموع ہر روز یہاں میرے لئے آئیں گے۔ اور کیسے خوش خوش گوارا کریں گے ہم۔ عشرت نے
 رفیعہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سنو رفیعہ تم اور ہم۔۔۔ پھر وہی ہم؟ یا ایک رفیعہ نے کان ہی نہیں
 آنکھیں بھی بند کر لیں۔ اور اپنی صبح کا سارا نند اس ہم کو تھننے میں لگا دیا۔ پھر اُسے معلوم بھی نہ ہوا،
 کہ وہ کیا شے رہی ہے۔ عشرت کیا کہہ رہی ہے۔ اُسے صرف اتنا معلوم ہوا کہ آنکھیں بند نہ کرنے کے بلکہ دیکھنا
 باطل ہے اختیار ہر کس کی آنکھوں سے بہہ رہے ہیں۔ وہ سبک رہی ہے۔ اور وہی ہے۔ اور
 ہم اس کی ساری کوششوں کے باوجود روشنی کی ایک لکیر کی طرح سارے بندہ بانوں اور کمر پہن
 اور دشتہ والوں سے گزرتا ہوا اس کی صبح کے کولے کولے کو متور کر رہا ہے!

رفیعہ بے قرار ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

دور کہیں کسی بلڈنگ میں کاپرچ کی کوئی روشنی کھڑکی کھلی اور موسیقی دھند کے بیابان پر بجتی ہوئی
 اس کتاب سے آگئی، جہاں عشرت اور رفیعہ کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف خاموشی سے دیکھتے ہوئے
 دھند سے عشرت نے رفیعہ کو کھینچ کر اُسے اپنے باندھوں میں لے کر اپنے گلے سے لگا لیا۔ رفیعہ کا سارا
 جسم کانپا۔ اور پھر کانپ کر یک بارگی عشرت کی باہوں میں گھس گیا۔

اس خاموشی کے باہر غریب تھی اور بے کاری۔ اور زندگی کے سارے تلخ مسائل۔ رفیعہ نے سوچا لیکن
 اندہ اس خاموشی کے اندر چند لوگوں کی ممانعت ہے۔ اور موسیقی کا شکوہ اس کی غفلت اور غفلت غیب سے
 کاہلوں میں کا کوئی کتابہ نہ تھا۔ چند لوگوں کے بعد وہ اس خاموشی سے باہر ملے گی۔ پھر اسی گھنٹی جس
 کا انصافی اور ناپاسی کا مقابلہ کرے گی۔ مگر ان چند لوگوں کے لئے۔ تو وہ اس لازوال موسیقی سے
 اپنی صبح کو قوت اور طاقت سے سمجھ کر سکتی ہے!

موسیقی یا شہابی نغمات کے پھولوں کی طرح ہلکتی ہوئی۔ موسیقی پُر مسرود و صندک لڑیں ہر ڈھولتی
 ہوئی۔ موسیقی کسی دیوانی گشتی کے مغرور بادبان کی طرح اپنا سینہ پھیلانے دھند میں بہتی جا رہی تھی۔

دعوت پہنچی گئی۔ بہتی گئی۔ بھائی کہ: فیہ نے محسوس کیا۔ وہ اور عشرت دونوں اکیلے کھڑے ہیں۔ محبت کے ایک جزیے میں۔ اور چاروں طرف وقت بہہ رہا ہے !!!

روحانی سٹوڈیو انڈیری میں جوشی جی کے سیٹ پر بڑے نعل کی بحث چل رہی تھی بحث کہنے والے تھے۔ جوشی اور اکرم اور سٹیفن والے تھے۔ جوشی جی کے اسسٹنٹ، کیمروین، راج لا اور شتاؤ۔ چند لپٹنے والی لڑکیاں جن میں دفعہ کی شامل تھی۔ سیٹ بہت بڑا تھا۔ قصر گو سماجی تھی۔ لیکن سیٹ فینٹسی مینی میٹا ہی تھا۔ راج لا ہیرو کے فراق میں مدد کے لئے سو جاتی ہے۔ اور خوب میں ایک منظر دیکھتی ہے۔ جو اس سیٹ میں دکھایا گیا تھا۔

لیکن جوشی اور اکرم کی بحث اس سیٹ یا اس سیٹ میں تھے جلتے والے شاطی سے متعلق تھی۔ جب سے اکرم نے غیر خوش کی ہدایت کاری پر لات ماری تھی۔ اس کی بے ہودھ کاری بڑھتی جا رہی تھی۔ اور اب تو اس کے خوب صورت چہرے پر بھی نمایاں ہو چکی تھی۔ اکرم نے پریشانی کچھ کھانے کھنے شروع کر دیے تھے۔ جوشی جی نے اکرم پر ترس کھا کے (اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ترس احتیاط کا دھڑا چہرہ ہے) اُسے نایک کا ایک منظر گیت میں بانٹنے کے لئے دیا تھا۔ آج اکرم وہ گیت لے کے آیا تھا۔ وہ اصل اکرم کوئی اور ہی گیت اور نایک کا کوئی دوسرا ہی منظر لے کے آیا تھا۔ اور اس نے بھی جوشی جی نے اس کا گیت ناٹھ کر دیا تھا۔ ویسے اگر وہ گیت انہیں دل سے پسند ہی ہوتا۔ پھر بھی وہ اُسے ناٹھو

کہتے۔ انہیں وسائلِ کرم سے کوئی گت لکھوانا نہیں تھا۔ موت اُسے ذلیل کرنا مقصود تھا۔ اس وقت بحث کا رخ تیزی کی طرف تھا۔

جوشی جی نے سامنے پڑی ہوئی تپائی پر اتنے زور کاٹا مارا کہ تپائی الٹ گئی۔ اہل بیجو کا جو کہ بڑے۔ وہ نہیں اکرم بھائی۔ نہیں چلے گا۔ یہ گیت مجھے اپنے ڈانس میں نہیں چاہئے۔ کچھ اس طرح کا گیت لکھو۔ رات جوں ہے۔ آسان پر چاند ہے۔ میرے پاس آ جاؤ۔

اکرم نے کہا: مگر ہر ڈانس کے بول تقریباً یہی ہوتے ہیں۔ رات جوں ہے۔ آسان پر چاند ہے۔ میرے پاس آ جاؤ۔ تمہارے اسی سیٹ کے ناچ کے بول بھی تقریباً یہی ہیں۔ کیا ناچ اس کے سوا اور کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ تمہارا ناچ یہ بھی تو کر سکتا ہے۔

دھوپ ٹپکی ہے۔ گیموں کی باتیں سرسراتی ہیں۔ آؤ کام کرو۔

یا

دل بکارتی ہے۔ چینی سے دھواں نکل رہا ہے۔ سوت کے گولے انسان کے ہاتھوں کے منتظر ہیں۔

یا

بروت نے سارے راتے بند کر دیے ہیں۔ مگروں سے کوئی باہر نکل نہیں سکتا آؤ برٹ پٹائیں۔

تمہ نے (RED SHOES) میں جوتوں کا ڈانس دیکھا تھا؟ اور اخبار کا ڈانس کنٹا دلکش انداز میں تھا۔ ہم لوگ کتابوں کا ناچ شال کے طور پر کیوں نہیں دے سکتے؟

جوشی جی نے اکرم سے کہا: اے بھائی میرے۔ تم اپنا فلسفہ یہاں مت لاؤ۔ اپنے کو کچھ اور نہیں چاہئے۔ اپنی کوئی تجربہ کرنا نہیں اگتا۔ کوئی خطرہ مل لینا نہیں اگتا۔ اپنی تو یہ ڈانس ہی گم پر کر

ہیں یہی دے گا۔ رات جوں ہے۔ آسمان پر چاند ہے۔ میرے پاس آ جاؤ۔ ہم تمہاری طرح ناکام ڈرا کیڑے
 ہون نہیں بٹھکا۔ اپنے کو کوئی اور ناپ نہیں چاہئے۔ کوئی اندگیت نہیں چاہئے۔ کوئی اور خیال نہیں چاہئے
 تم کو یہ ملتا ہو تو اسی خیال کو گما کر دوسرے بل میں بانجھ کے لاؤ۔ بھوکا مڑا ملتا تو اندھ سی ہے
 باہر جاؤ ۛ

”مگر ملک اور قوم ...“

”ایسی کی تھی ملک اور قوم کی۔ سب سے پہلے اپنی جیب گرم کرو۔ دیکھو بھائی۔ ہمارا ناسر پوڈیو سر
 باہر دیا سیٹھ یہی کرتا ہے۔ اس کا ڈسٹری بیوٹر لالہ بگت لال بھی کرتا ہے۔ اس کا انٹرچور ٹھکانہ یہی
 کرتا ہے۔ اور پھر آگیا (مدا) آڈینس (ماضی) یہی منگلتا ہے“

”تم لوگوں کی یہ بات میں نہیں مانتا کہ لوگ ہمیشہ اسی طرح کی شاعری کو پسند کرتے ہیں بے شک محبت کی
 شاعری کو بہت پسند کرتے ہیں“ اکرم نے کہا: ”اور یہ ایک بُری خوب صورت چیز ہے۔ انسانی
 محبت، سماج کی بہترین قدوں میں سے ہے۔ لیکن آپ محبت کے ساتھ ساتھ سماجی ماضی کی پاشنی
 بھی دے سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر فیض کی شاعری“

”کوئی بچہ؟ راج تاکے کان کھڑے ہوئے۔ کیوں کہ بیرونیوں میں وہی آمل کوٹیل بھی جاتی تھی۔
 ششاد بھلا کہاں بچے رہنے والی تھی۔ اس نے بھی غم دیا۔ ”ہیں تو کم ذات کی خیریں بہت پسندیں۔
 اس وہی تو لے سائی تھی نا؟“ ششاد راج لاکا طوط دیکھنے لگی۔

راج لے لے اُسے ٹوک کے کہا: ”اکی کم ذات نہیں ہم زاد۔ تجھے دس بار بتایا ہے“

”ہاں ہم زاد، ہم زاد“ ششاد نے دیہاتیوں کی طرح اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے خدا سا مٹلاتے
 ہوئے کہا۔ وہ نہایت ہی خفیت سا، بالکل بچوں کی طرح کبھی کبھی خدا سا مٹلاتی تھی۔ اور لوگوں کو اس کا
 یہ مٹلانا اس قدر پسند تھا کہ اُس کی ہر تصویر کے مکالموں میں اس کا جگہ جگہ خیال رکھا جاتا تھا۔

ادب اور آرٹ پر جب انٹرنی کی دو مہذب ہیر و تیس۔ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں تو
اکرم خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اُسے کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس نے فائل بٹن میں دبایا اور چپکے
سے سیٹ سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد جوشی جی نے نوک کا ایک تہقبہ نکالیا اور بولے "آج
میں جی گلو سے انٹرنی کی حالت ٹھیک کرنے۔ اپنی پتلون کی حالت کو ٹھیک کر نہیں سکتے۔"
اس پر ایک زور کا تہقبہ چڑا۔

"ایکسٹراڈائنس گرلز آن دی سیٹ آ جوشی نوڈ سے انٹرنی میں چٹایا۔ اور رفیعہ رضیہ اور ولایت بیگم
اور دوسری لڑکیاں جلدی سے سیٹ کی طرف بھاگیں۔ بابو لال انہیں ہدایات دینے لگا۔
جوشی جی نے بابو لال سے کہا "لڑکیاں اس شاٹ میں نوڈ سے کولے سکا سکتی ہیں۔ لاگ
شاٹ ہے۔ سنسرونگ شاٹ پر اعتراض نہیں کرے گا۔"

پھر جوشی جی نے فکر کشاد اور راج تاسے کہا "ولبرو، جم بھی میک آپ کر لو۔ اگلا شاٹ آپ کا ہے۔
راج لا اور کشاد میک آپ روم میں جا بیٹھیں۔ کشاد نے راج تاسے کہا "مجھے بے چارے انکم
پر براترس آتا ہے۔ راج لا بولی "تو جانی۔ بلالانا اُسے اپنے پاس۔ ویسے دیکھنے میں خاصا
خوب صورت ہے۔"

کشاد دھنس کر میک آپ کرنے لگی۔

اُن کے میک آپ روم سے دھکے پرے ایکسٹراڈائنس کا میک آپ روم تھا۔ وہاں ایک
ٹکل خیاوہ برپا تھا۔ جیسے ان لوگوں کے میک آپ روم میں ہمیشہ جڑا ہے۔ کشاد نے یہ خود کشی کے راج
سے کہا "جانی یہ ٹکلا ہوا دروازہ تو بند کر دے۔ یہ لو فریوگ اس تدریس پھلتے ہی۔"

راج تاسے کی جانب ٹری۔ یکا یک سانسے سے اُس نے عشرت کو ایکسٹرا میک آپ روم
کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ بنزنگ کی دھادی دارٹی خرٹ اور بھوری ہولی پتلون میں وہ بہت

جج رہا تھا۔ راج تیار کیا ایک دروازے پر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ پھر سانس اندر کھینچ کے برلی : ہائے شمشاد
بالکل ایلین لاڈ ہے :

”کہاں؟“ شمشاد ڈسینگ ٹیبل سے بھاکی بھاکی دروازے پر آئی۔ عشرت ان دونوں کی طرف پیٹ کے
ایکسٹر ایک آپ دم کی طرف جارہا تھا۔ دروازے پر جل کے وہ نکلا۔ اسی اسی گھوم کے اُس نے راج تیار
کی طرف دیکھا۔ راج تیار شمشاد دونوں جلدی سے دروازے کی اوٹ میں ہو گئیں۔ راج تلے شمشاد کا
ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کے کہا : دیکھ! کیسے دل دھک دھک کر رہا ہے ؟
شمشاد نے کہا : جج جج۔ بالکل ایلین لاڈ ہے :

راج تلے کہا : اور بے چارہ ایکسٹر میں کام کرتا ہے۔ ہائے کی کم نچی :
شمشاد نے سنی خیر صحیح ہوں سے راج تیار کی طرف دیکھ کر پوچھا : کس کی کم نچی آئی ہے ؟
مگر راج نے کوئی جواب نہ دیا پھلے کر اپنے ابرو دھرت کرے گئی۔

شام کے پانچ بجے کے قریب رہیہ کا آخری شاٹ ختم ہو گیا۔ عشرت کمرن ایک شاٹ
باقی تھا۔ رومیہ نے عشرت سے کہا : میں کہیں میں ہل کے منتی ہوں و
عشرت نے کہا : اہ تم ہلو۔ میں ابھی آتا ہوں :
اس کے کئی مین منٹ کے بعد عشرت کا شاٹ بھی ختم ہو گیا۔ اسی جوشی جی نے تمام ایکسٹر لوگوں کو منی دیکھا
اب منٹ دو کلزا پ باقی تھے۔ ایک شمشاد کا۔ ایک راج لاکا
راج تلے کہا : میرے سر میں حد دھرتا ہے :
جوشی جی نے کہا : میں ایک ہی تو شاٹ ہے :

راج لا جلدی سے بولی : کل ے لینا۔ اس وقت مجھے جانے دو، سر پٹا جا رہا ہے ؟
 یہ کہہ کر بعد عروشی بی کی مزید گفتگو نے بغیر راج لا جلدی سے سیٹ سے باہر نکل آئی کیٹشیں رات
 میں پڑنا تھا۔ لیکن کیٹشیں سے پہلے شیخ سے باہر ایک کھلی جگہ میں راج کی گاڑی پارک کی ہوئی تھی۔ راج
 جلدی سے میک آپ اپنا آٹا بے بغیر گاڑی کا دروازہ کھول کے اگے بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد عشرت میک آپ دم سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے باہر نکلا اور کیمپن کی طرف چلا۔
 راستے میں اس کے کانوں میں گھونبائی "کہاں جاؤ گے ؟"

عشرت نے پلٹ کے دیکھا۔ راج لا جلدی میں تھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"جی ہاں ؟ عشرت نے پوچھا۔ اس کے کانوں کا اعتبار نہ رہا تھا۔

"آپ — آپ کہاں جا رہے ہیں ؟" راج قلقلے پوچھا "میں آپ کو چھوڑ دوں ؟"

عشرت کے منہ سے بے اختیار نکلا "میں بھڑی بازار میں رہتا ہوں ؟"

"آئیے بیٹھے۔ میں آپ کو وہاں چھوڑ دوں گی ؟" راج نے اپنی گاڑی کو سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

گر بس ایک۔ صرف ایک لمحے کے لئے۔ عشرت بچکھایا۔ پھر وہ گاڑی کے اندر بیٹھ گیا۔ راج نے گاڑی

سٹارٹ کر دی۔ گاڑی دھیرے دھیرے بڑھتی ہوئی کیمپن کے سائے سے گزرتی تھی وہ دیکھتے ہوئے عشرت

رضیہ نے رضیہ کو زندہ سے ٹھوکا دیا۔ دونوں ایک بچی پر مبنی پلے پٹی رہی تھیں۔ رضیہ کے ہاتھ سے پیالی

گئی۔ بعد فریض پر صبر سے ٹوٹ گئی۔ مگر رضیہ کو کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ وہ بہاگ کر دھڑلے میں بہاگتی

ہوئی۔ اب کار اگے جا چکی تھی۔ راج اور عشرت کا رخ بھی وہ دیکھ سکتی تھی۔ وہ دھڑلے سے ہونے لگا

۔ دھڑکاری تلوار کی طرح اس کے سینے میں پھیل گئی۔

آہستہ آہستہ راج کی گاڑی سٹوڈیو کے دفتر کے سائے سے پلٹ کر آگے بڑھ گئی کی طرف

ٹری اور پھر لنگروں سے اوجھل ہو گئی۔ رضیہ نے رضیہ کا ہاتھ زندہ سے پکڑ رکھا تھا۔

رضیہ جلائی "اری کیا کرتی ہے۔ بھتیجی! ناخن کاٹ دے میری کلائی میں"۔

گھاڑی اندھیری سے محلی۔ سٹیشن کے گیٹ سے گزری۔ بچی کی جانب مڑی۔ بولے پارے گیا ساٹا کر دیا۔ کھا گیا۔ لیکن گاڑی بھنڈی بازار جانے کے لئے پاندرہ کی طرف نہ مڑی۔ پالی ہسپتال کی جانب گھوم گئی۔ جہاں راج لٹا کا بچہ تھا۔

رضیہ رضیہ کو کچھ پس لے گئی۔ لیکن کبھی کبھی انسان آنکھیں جوتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتا کان جوتے ہوئے بھی نہیں سن سکتا۔ تصویریں رضیہ کی تپلیوں بے پھسل کر بتی ملی جا رہی تھیں۔ اس کے دماغ کی تہوں میں نہیں پہنچ رہی تھیں۔ اداکار گفتگو کر رہے تھے۔ مگر ان کا ایک فنکار بھی رضیہ کے کان میں نہ پہنچا تھا۔ اس کے کانوں میں تو کوئی سمند کی طرح گرج رہا تھا۔ اور اس کی آنکھیں ایک گاڑی کو دیکھ رہی تھیں۔ جو دیرے دیرے چلتے ہوئے اس قدر اس کے قریب آ جاتی کہ اسے محسوس ہونے لگتا جیسے وہ اس گاڑی کے نیچے آ کے دب جائے گی۔

رضیہ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"تصور نہیں دیکھ گی؟" رضیہ ہمدردی سے بولی۔

رضیہ نے کہا "میں ابھی ہمدردی سے آئی"۔

لیکن وہ واپس نہیں آئی۔ رضیہ جانتی تھی کہ وہ واپس نہیں آ سکے گی۔ تو بھی اس نے اسے جانے دیا۔ کبھی ایسا لگا تھا کہ ہمدردی کا ہر لحاظ ناکارہ ہے۔ کار ہر لحاظ رضیہ نے سوچا۔ جانے دو

خود ہی ٹیک ہو جائے گی۔

”کرتے جا کر رضیہ سیدھی گھر گئی۔ گزشتہ ابھی تک نہ آیا تھا۔ رضیہ کھانا تیار کرنے لگی کھانا تیار ہو گیا مگر حضرت پوچھ گیا۔ آیا۔ رضیہ نے تجوں اصرار ہی کو کھانا کھلا دیا۔
 اسی نے پوچھا ”اور تو۔۔۔۔۔؟“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”مغشرت کہاں ہے؟“ اتنی نے پوچھا۔

”اس کی شوٹنگ ہے“ رضیہ نے جھوٹ کہا دیا۔

”اتن غور سے رضیہ کا چہرہ دیکھنے لگی۔

نونی گئے۔ عشرت نہیں آیا۔

”ایکایک رضیہ بے قرار ہو کے اپنی جگہ سے اٹھی۔ اتنی نے اس کا ہاتھ پھڑپھڑایا ”کہاں جاتی ہے؟“ اس نے لڑتی ہوئی صداک اٹاڑیں پوچھا۔ ”جہنم میں!“ رضیہ اپنی اتان کا ہاتھ پھڑپھڑا کرے سے باہر نکل گئی۔

کتنی ہی پُر تپ گلیاں تھیں کتنے ہی اندھیرے راستے تھے۔ کتنے ہی روشن باز تھے، کتنی ہی بسیں، فرا میں۔ وہ کہاں گئی۔ کدھر گئی۔ کہاں فرا میں بیٹھی۔ کہاں بس میں۔ اسے اس کا کچھ پتہ نہ تھا۔ وہ کسے تلاش کر رہی تھی۔ کہاں گم رہی تھی۔ کس سے بھاگ کے کہاں جا رہی تھی۔ تمام ظلمت، تمام مجرور بار۔۔۔ فی ساری صدی اس کے لئے مرگئی تھیں۔ موت اس کے دل کے دروازے پر کوئی نہ نہ نہ سے ہتھوڑے ادا ہوا تھا۔ جھٹ! جھٹ! جھٹ! کیا جہنم میں شیطان انسان کے دل کو اسی طرح کھجکھتا ہے؟

راج لاٹا عشرت کو ساتھ لے کر اندر سے ایوان فرزندیں گئی۔ اہانے وہ دونوں خانز
 میں گئے۔ خانز سے مٹھری تاج کے پیچھے ڈایاں اینڈ سنز کی پورج میں جاتگی۔ وہاں سے گاڑی بورس
 ہوئی۔ گاڑی کی پہلی سیٹ پر تیار شدہ سوٹ۔ نائی لان کی روانہ جڑا میں۔ جیک کارڈنزی ٹائیاں پک
 میں کی ہیٹ برادگ کے جوتے۔ کیمیری سو مال اور پیرس کارڈن پڑے تھے۔ گاڑی پھر وہاں سے ہٹو
 کی طرف ہوئی۔ اور پالی ہیل پر چلی گئی۔

جب عشرت غسل خانے میں نہانے کے لئے گیا تو ابھینو نے اپنی بہن سے پوچھا۔
 ”کیا کیا؟“

”شٹ اپ! راج لاٹا گرج کے ہوئی۔“

ابھینو نے جیرا بل کے فوراً فوٹی یوٹ جلتے ہوئے کہا: ”اکل رائٹ لام!“ گراہک چل اس
 خاکسار کے لئے بھی نے آئی ہوتی۔ رشتے میں بھائی ہوتا ہوں۔
 ”یوٹ اپ! راج لاٹا پھر ملے کے ہوئی۔“

”بہت اچھا لام! ابھینو نے کہا: میں اپنے کمرے میں چلا ہوں۔ مگر اس وقت کی بنگ کے لئے
 — لٹکی فوٹ ہو رہی ہے“ راج نے اُسے بڑے سے دس روپے نکال کے دئے۔ ابھینو
 فوٹ کو انگلیوں میں حقارت سے گھماتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر تک راج وہیں اپنے کمرے
 باہر کھڑی سوچتی رہی۔ پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

بڑی صاف شستری ہلکی ہوئی رات تھی۔ آسمان تاروں سے خراب۔ زمین روشنیوں سے
 منور۔ راج پورج کی میز میں سے اتر کر مصلاتی ہوئی بچے کے باہر آگئی، جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی

آج وہ مات کے وقت شکر کو اپنے شوہر ڈرائیور کو نہیں لے جا رہی تھی۔ اس وقت اس نے گولڈرے ویکہ کا فریک پین دکھا تھا۔ بالوں میں پھروں کے بجائے سفید کوہر تھکے جواہرات کی دینی گاہ تھی۔ اور وہ اس وقت گاڑی کے مٹھا روٹے لگی ہوئی گیت گنگنا رہی تھی۔ اور عشرت کا انتظار کر رہی تھی جو ابھی اندر اپنے کمرے سے باہر نہ آیا تھا۔ اس وقت راج تلنے ان پہلی ہوئی حیران چلیوں کو مڑ کے دیکھا۔ جربنگلے کے باہر گاڑی کے قریب گل ہیر کے ایک پڑے نیچے سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔

”غوب صورت ہے بے درغوب صورت ہے رخصی نے رخت کے نیچے سے راج لتا کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے دل سے کہا۔ پھر یہ ایک وہ نذر ہے ایک سانس اندر کینچ کے رو گئی۔ عشرت پورج سے گزرتا ہوا لیے لیے مردانہ ڈگ بھرتا ہوا بنگلے سے باہر آ رہا تھا۔ مگر وہ عشرت د تھا۔ ایک سبلی غیر سبلی شہ پٹلا اور ٹی شرٹ میں بلوس۔ اس وقت اس نے ڈریس سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور اس کی سفید تھیں پر سیاہ جلیب بہاروے رہی تھی۔ عشرت کی آنکھوں میں ایک مفرد چمک تھی۔ اور جب وہ راج کے سامنے لگے مکا۔ تو اس کا مسکراتا ہوا، اور کھلتا ہوا گرد رنگ سرک کی بچی کی روشنی میں جگمگ جگمگ کرنے لگا۔ باطل بے اختیار ہو کر رخصی نے نذر سے سانس اندر کینچ لیا۔ جیسے کہیں بہت دھاس کے دل کی گہری تہوں تک کوئی خنجر اُتر گیا ہو۔

راج نے مڑ کر دیکھا۔ لیکن گل ہیر کے درخت کے آس پاس اندر میرا تھا۔ اندر وہ کچھ نہ دیکھ سکی۔ شاید یہ بات کی سہ کی تھی۔ یہ رات بھی شاید عشرت کے حُسن سے مسحور ہو گئی تھی۔

”واؤ؟ راج تلنے ٹپے پیار سے عشرت کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور پھر وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گاڑی کا دروازہ کھولنے کے لئے مڑی۔ اور اس کی گھیرے دار گولڈرے ویکہ کی نراک نراک دائروں کی شکل میں گھوم گئی۔ راج حلقے موسیقی۔ بہاد۔ قرنم۔ راج کے جسم کا ہر روج اور ہر خم عشرت کے دل میں جا رہا تھا۔

مہاج میں چلیں گے ۛ راج بہت دیر سے آہستہ سے ہلے۔ جیسے وہ نہیں کوئی بوسہ ہل رہا ہو۔
رات اور رقص۔ سمندر اور ساحل۔

رضیہ اور گل ہیر۔

مگر گل ہیر کے پھول بہت دیر تھے۔ اوپر شاخوں میں تاروں کی طرح اپنی آنکھیں جھپک رہے تھے۔ اور اُن سے بہت دیر پہلے گل ہیر کے تنے سے لگی رضیہ سوسکیاں لے رہی تھی۔ مگر سخت کاٹھ سخت ہوتا ہے۔ اس کی چھال بھی بڑی سخت اور کڑھئی ہوتی ہے۔ اس میں کہیں خزی اھلچ، اوروہ درد کو بھنے کی قوت نہیں ہوتی۔ جو رگوں میں لہو کے دھڑکنے سے آتی ہے۔ تنے کی رگوں میں تو پانی چلتا ہے۔ اور پانی لہو کا درد کیسے بھجھ سکتا ہے۔

کھولی میں بہت اندھیرا تھا۔ اماں جاگ رہی تھیں۔ بڑھی اماں ہوئے ہوئے کانپتے ہوئے
 ہاتھوں سے بستر ٹٹول رہی تھیں۔ مگر بستر خالی تھا۔ اماں کو معلوم تھا۔ صرت چند فٹ پرے۔ رضیہ
 سو رہی تھی۔ سو نہیں رہی تھی۔ جاگ رہی تھی۔ اماں کو معلوم تھا۔ اس کی بچی بچے میں سر دے رو رہی ہے
 مگر وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ رضیہ کے پاس چلی جائے۔ اس کے سر پر اپنا جھڑیوں والا
 ہاتھ پیرے۔ مگر وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ کتنے ہی سالوں سے اماں نے محسوس کر لیا تھا۔ کہ وہ کچھ نہیں کر سکتی
 اس کا خاوند مر گیا اور وہ کچھ نہیں کر سکی۔ اس کی بڑی بیٹی کا خاوند مر گیا۔ اور وہ کچھ نہ کر سکی۔ اس کی بیٹی گئی
 اور وہ کچھ نہ کر سکی۔ مجھ نے مجھ لے پانچ بچے رہ گئے اور وہ کچھ نہ کر سکی۔ کیوں کہ اسے کچھ کرنا سکھا یا ہی نہ
 گیا تھا۔ وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ عورتیں یہاں بننے کے لئے بستر پر لیٹ جانے کے لئے اوب بچہ پیدا
 کر کے اُن کی پرورش کرنے کے لئے بنائی گئی ہیں۔ اُن کے خاندان میں ہمیشہ ایسا ہوتا آیا تھا اور ان
 کے اس پاس کے خاندانوں میں ہزاروں سالوں سے ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ اور ایسا ہی ہوتا رہے
 گا۔ اس نے سبب بھی کوئی مصیبت اتنی تو عورت دُعا کے لئے دونوں ہاتھ اُٹھا دینے کے سوا اور کیا کر سکتی
 ہے۔ اور اماں کی تو زندگی کا اب ہر ایک لمحہ محترم دُعا تھا۔ دونوں ہاتھ اُٹھا کر اُنھے ہرے جس باقا ملے سے

وہ نازہا کتنی نہیں کس مشغور و مشغور سے ہر روز دعا مانگتی تھیں: میری رخصتی کا نے سے لگ جائے۔
یہ چھوڑا سا کنبہ کس طرح سنو رہا۔ اے خدا! اے خدا! اے خدا...

لیکن آج اندھیرا بہت تھا۔ اور اس اندھیرے میں رخصتی آہستہ آہستہ بہت ہی آہستہ جیسے اپنے سینے کا سارا سوز اپنی مٹھی میں دبائے ہوئے ہوئے سسک رہی تھی۔ اور اناں کا دل اپنے لیستر پر لیٹے لیٹے حشرے ہو رہا تھا۔ مگر یہ دل حشرے کیوں نہیں ہو جاتا۔ یہ غم کا سوتا رگوں میں ٹنک کیوں نہیں ہو جاتا۔ یہ دھبے دھبے چلنے والا سانس ایک بارگی آنکھیں نہیں ہو جاتا۔ کب تک اپنی بچی کی برصیت دیکھتی رہے گی۔ اے خدا... تم اس قدر دُور کیوں ہو۔ اتنے دُور کہ میں کیوں ہوں آسمانوں میں رہنے والے آؤں گا۔ اس کھوٹی میں اُتر آؤں گا۔ اس کا اندھیرا دیکھو۔ اس کی غریب دیکھو۔ اس کی آہوں میں سانس لو۔ میرے رب۔ میرے مولا۔ میری بچی اس طرح سسک رہی ہے۔ اور تم سے کچھ نہیں ہوتا۔ کچھ نہیں ہو سکتا اے خدا کیا؟

بھائی اناں نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ توبہ۔ توبہ۔ میں کس کی شان میں یہ گستاخی کر رہا ہوں۔ میرے مولا۔ بے معاف کر دے۔ میرے گناہ بخش دے۔ یہ میں کیا بک رہی ہوں۔ چچاچا ان مصیبتوں نے میری عقل مار دی ہے۔...

مگر رخصتی کا اس بحث سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ وہ خدا اور گناہ۔ دُعا اور جزا کے سہانوں کا الگ ایک کونے میں مٹھی سسکیوں اور جھپکیوں کے درمیان روتی پاتی تھی۔ آج چاروں طرف بختل اندھیرا تھا۔ اور کہیں روشنی نہ تھی۔ انسان کے دل میں ایک شہر ہوتا ہے۔ اس کی گلیاں اللہ بازار چلتی ہیں۔ جہاں یا دلوں اور دُرواہوں کا ایک جہم رہتا ہے۔ اس کی دوکانوں میں ہزاروں طرح کی نشانیں بختی ہیں۔ خریدی اور بیچی جاتی ہیں۔ اس کے کارخانوں میں محنت سانس لیتی ہے۔ اور اس کے باغوں میں کبھی کسی چاند چمکتا ہے۔ اور یہاں پہلے ہیں اور آہستہ خرام جڑے ایک دوسرے کی کمرس ہاتھ ڈالے

خاعوش نکاحوں سے محبت کا پیام دیتے ہیں۔

دل کا شہر بھی انسان کے شہر کی طرح بستہ ہے۔ محنت کرتا ہے، کام کرتا ہے، ہنستا ہے، افسوس لہے۔ کبھی کبھی ایسے دن آتے ہیں۔ جب ہر لمحہ عید ہوتا ہے۔ ہر یاد اک نیا جڑ بھین کر نکلتی ہے۔ ہر قضا، بنی سنوری پھیلیوں میں چٹاکی نقشِ تصویر میں بھلتے۔ ہر آنگ نئے نئے پتوں کی طرح خوشی سے ہنستی ہوئی، نکھاریاں مارتی ہوئی ہر آفسود جہان اور بلند مستقبل کی خوشبو سے مکتی ہوئی دل کی گھیسوں اور بازاروں میں بھل آتی ہے۔ اور خوشیوں کے میلے میں اور سڑکوں کے آروام میں گھوم جاتی ہے۔

مگر آج اس شہر میں کیسا تاشا ہے؟ آج دل کی پڑتی گھیسوں اور بازاروں اور سڑکوں پر اندھیرا ہے۔ آج کہیں پردوشی نہیں ہے۔ آج کوئی عراو نہیں ملتی۔ کوئی آندو نہیں بکھی، کوئی آنگ نہیں ہنستی، آج سائے دیکھے بند ہیں، اور سائے دودانے مقل ہیں، اور سائے بازار غالی ہیں مرن کہیں کہیں بھٹو پر چند روٹی یا دیں گھرے ہوئے آیام کا سیاہ لبادہ اوڑھے ہوئے ہوئے ایک دوسرے سے سرگوشی کر رہی ہیں۔

آج سارا شہر غالی ہے۔ آج سڑکوں پر پردوشی نہیں۔ باغوں میں چاند نہیں، پیڑوں میں پھول نہیں۔ آج وہ بچی بھی غالی ہے جہاں رخصت اور عشرت جٹھا کرتے تھے۔ یکایک رخصت کو ایب محسوس ہوا جیسے آج کے بعد یہ بچی ہمیشہ غالی رہے گا۔

انسان کا دل بھی ایک عجیب شے ہے۔ وہ کسی یاد کو تو ایک خوشبو میں بدل دیتا ہے۔ جو زندگی بھر بھکتی رہتی ہے۔ کبھی ایک کھٹے میں جو زندگی بھر جیتا رہتا ہے۔ اور کبھی ایک تصویر میں جو زندگی بھر ایک ہی چوکھٹے میں جڑی، ایک ہی دیوار پر لگی ایک ہی زاویے سے دکھائی دیتی چلی جاتی ہے۔ یکایک رخصت کو محسوس ہوا جیسے آج کے بعد وہ اُس باغ میں کبھی نہیں جائے گی۔ جہاں وہ عشرت کے ساتھ گھومنے جا یا کرتی تھی اس بچی پر نہیں بیٹھ سکے گی۔ جہاں عشرت کے ہاتھ خود بخود اس کی کمر کے

گرد آجایا کرتے تھے۔

نہیں بچے آج کے بعد ہمیشہ خالی رہے گا۔

پتہ نہیں ایسے کیوں ہوا۔ لیکن جب اس نے اس تصویر کو جو کٹے میں جڑ کے وہاں سامنے کی دیوار میں گویا لگا دیا۔ تو اُسے اطمینان سامحوس ہوا۔ اس کی سبکیاں اور پچکیاں بند ہو گئیں۔ اس کی پکلیں ہماری ہوتی گئیں۔ اور آخر وہ دم دم سامنوں کے درمیان خند کے ٹھوڑے میں بہتی ہوئی کھڑی۔ اور ہر کندہ رات بھر کی جاگ ہوتی تھی۔ اس نے مج بہت دیر تک سوتی رہی۔

مج ہو گئی۔ سورج نکل آیا۔ باناٹوں میں ٹرامیں اور بسیں اور راہ چلنے لوگوں کا شور مچا گیا مگر رفیعہ بڑے آرام سے سوتی رہی۔ اس کی آنکھوں نے ابھی اُسے نہیں جھگایا۔ اس نے اپنی ٹی کے خماروں پر رات کے آنسوؤں کے خشک نشان دیکھے۔ اور اُسے سوئے رہنے دیا۔ اور غریبی کا پتہ ہونے باوجود اس سے مگر کاسا کا کام کاج کتنی رہی۔ برتن صاف کر کے۔ گھرے میں پانی بھر کے ٹوں کو ہٹا کے کھانا پکاکے انہاں جب فارغ ہوئیں تو انہوں نے دیکھا رفیعہ ابھی تک بے سُدہ فرش پر سو رہی تھی۔ کمر کی سے عیب روشنی رفیعہ کے چہرے تک آنے لگی تو انہاں نے آہستہ سے کمر کی کے قریب جا کے اس کے پٹ بند کر دیے۔ اور واپس آکر کپڑوں کے لئے کھانا نکالنے لگیں۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی، انہاں نے اٹھ کے دروازہ کھولا اور حیرت سے اُن کی نگاہیں سی بندھ گئی۔ اور وہ کھلی کھلی ہنسی لگا ہوں سے عشرت کی طرت دیکھتی رہ گئیں۔ یہ عشرت تھا۔ مگر شاید کوئی اور ہی عشرت تھا۔ اتنے چمے لباس پہنے ہوئے کسی طرح وہ صاف ستمرا خوشبوؤں میں پٹا ہوا نظر آتا تھا کہ انہاں تو دروازے میں کمر کی کی کمری رہ گئیں۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد عشرت نے مسکرا کے کہا "انہاں مجھے اندر نہیں آئے دو گی؟"

انہاں دروازہ چھوڑ کر ایک طرت کمری ہو گئیں۔ لیکن اب بھی ایک لفظ اُن کے منہ سے نہیں نکل سکا۔ عشرت اندر آگیا۔ اس نے ایک بچنے کے سر پر ہاتھ پھیرا پھر آگے بڑھ کر سوتی ہوئی رفیعہ

عشرت پھر خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک پھر اس کے دل بچے کے کنارے سے کھینا رہا۔ پھر کہنے لگا
 ”میں بے وفا نہیں ہوں۔“

”میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔“ رضیہ بولی۔

عشرت نے کہا ”مان لو۔ رضیہ میں بے وفا نہیں ہوں۔ یہ جو کچھ میں کر رہا ہوں۔ اپنی اور تمہاری
 بہتری کے لئے کر رہا ہوں۔ یہ صرف ایک طریقہ ہے اپنے دونوں کو لانے کے لئے۔ تمہیں تو مسلم ہے یہ
 فلم انڈسٹری کیسی ہے۔ یہاں جب تک کوئی گس کی سفارش نہ کرے کام نہیں چلتا۔ تم خود ہی اپنے
 آپ کو دیکھ لو۔ راج کو دیکھو۔ شمشاد کو دیکھو۔ رنجنا کو دیکھو۔ اوشا کو دیکھو۔ کسی بھی میرو یا میروئن کو لے لو
 کسی کسی کے کندھے پر سوار ہو کے آگے بڑھے گی۔“

”تم کس کا کندھا چھو رہے ہو؟“ رضیہ نے پوچھا۔

عشرت نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بولا ”دنیا اسی طرح کی ہے۔ میرا مطلب ہے ایک نیسے
 کی طرح۔ جب آوی ایک نرینہ چڑھتا ہے تو کچھلا نرینہ چھوڑ دیتا ہے۔ میرے لئے راج ایک نیسے سے
 زیادہ نہیں ہے۔ اس نے مجھے ہیرو کا چانس دلائے گا وعدہ کیا ہے۔ جوں ہی میں ہیرو بننا۔ اور تم
 جانتی ہو۔ راج اس انڈسٹری کی مشہور ترین ہیروئنوں میں سے ہے۔ وہ مجھے چانس دلا سکتی ہے
 جوں ہی میں ہیرو بننا میں اسے چھوڑ دوں گا۔“

”ایک نیسے کی طرح؟“ رضیہ نے پوچھا۔

عشرت نے رضیہ کا دوسرا ہاتھ بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔
 ”میں صرف تم سے پیار کرتا ہوں۔ صرف تمہیں چاہتا ہوں۔ کیا تم سمجھتی ہو مجھے تمہارے دکھ کا علم نہیں
 ہے۔ وہ دکھ تو مجھے بھی ہے۔ تم سے جدائی۔ یہ عارضی جدائی ہی ہوگی۔ تم سے جدا ہو کر مجھے بحیف نہ
 ہوگی! مگر ڈارنگ اپنے مستقبل کے لئے۔ اسی نکلنے کے مستقبل کے لئے مجھے ایسا کرنا ہوگا۔ میں جب ہیرو

بن جائیں گا تو ایک ساندرا بچہ خریدوں گا۔ دوسرے گاڑیاں ہوں گی۔ ایک میرے لئے۔ ایک تمہارے لئے۔ پھر میں اپنی اتی اور اپنے چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں کو بھی یہاں بلاؤں گا۔ پھر تمہارے لئے فلم میں کام کرنا ضروری نہ ہوگا۔ بلکہ میں تمہیں کام کرنے بھی نہ دوں گا۔ یہ ذلیل محنت !

”محنت کبھی ذلیل نہیں ہوتی۔ اگر عزت سے کی جائے“ رضیہ غصے میں کہنے لگی۔ ”تمہارا کیا خیال ہے۔ میں اگر چاہوں، تو یہ کھولی تبدیلی نہیں کر سکتی؟ ایک بچہ نہ سہی، ایک غلیظ توڑے سکتی ہوں۔ نئی گاڑی نہ سہی۔ سینکڑے سیڑھی گاڑی تو خرید سکتی ہوں۔ کیا تم کہتے ہو۔ ہارنجی سوڈر رام سلاچی کے کالج کے صیگوں میں سلور بروکیڈ کے فرک دیکر کریری اور جے قرار نہیں ہو جاتی؟ کیا تم کہتے ہو، میں صورت نہیں ہوں۔ میرا جی خوب صورت ساڈیوں، خوش نما بلاؤنڈوں اور نئے نئے لڑکوں کے پہننے کے لئے نہیں لپاؤں گا۔ کیا میں نہیں چاہتی کہ میرا بھی اچھا گھر ہو۔ خوب صورت پردے ہوں۔ رات کی دم دم روشنی میں ریڈیو گرام ایک کونے میں بچھا ہو۔ میری بہن کے بچے اچھے خوب صورت کپڑے پہنے اس کے گرد بٹا ہو کے تھون کا پردہ گرام سنتے ہوں۔ کیا تم کہتے ہو میرے دل میں یہ تصویریں نہیں۔ سب ٹھیکو میں یہ سب نہیں کر سکتی۔ اُن تصویروں کو خریدنے میں مجھے جو کچھ بچا پڑے گا۔ اس سے بھی بہتر ہے کہیں اُن تصویروں کو بھاڑ ڈالوں۔ میں خالی دیواروں میں رہوں گی۔ ایک ادھیڑی کھولی میں۔ فلم والے گھر مجھے کام نہیں دیں گے تو میں کسی گھر میں جھانڈوں گی، برتن صاف کر دوں گی۔ کسی کے بچے کی کیا بن جائوں گی، ختم مرگ پر کوٹنے لگوں گی! کبے؟ کل تک تمہارا بھی یہی خیال تھا۔ آج تم کیسے بدل گئے۔“

”غریب رضیہ! عشرت نے کہا: غریبیت کچھ کر دیتی ہے۔“

”میں نہیں مانتی کہ غریب میں آدمی اپنی عزت بھی کھو دیتا ہے۔ یہ ہمارے اس پڑوس کی سیکڑوں جیوتی کام کرتی ہیں، چاول کو گھتی ہیں، بازار میں سبزی بچتی ہیں، کارخانوں میں کام کرنے جاتی ہیں۔ غریب ہی

پر ہر کاری کا لازم نہ لگاؤ اپنی کمزوری دوسروں سے منسوب نہ کرو۔ میں ہر روز ان غریب عورتوں کو دیکھتی ہوں۔ اسی میں سے کئی ایک بے مدد ہیں۔ تمہاری کئی بیرونیوں سے کبھی زیادہ محسن ہیں۔ ان کے پاس نہ ریڈیو گرام ہے، نہ کار ہے، نہ فلیٹ ہے۔ نہ سونے کے زیورات ہیں۔ مگر ان کا دل تو فاش بننے کو نہیں چاہتا۔ میں کیوں انہیں بازار میں بیٹھے ہوئے نہیں دیکھتی کبھی کبھی ان کے ہاں غلطی بھی ہوتے ہیں۔ کبھی کسی کا بچہ دوا نہ ملنے سے مر گیا جاتا ہے۔ پھر وہ موتی ہیں۔ دودھ پائے دوائے کرتی ہیں۔ پھر جی مضبوط کر کے کارخانے میں کام کرنے پٹی جاتی ہیں کیوں انہوں نے اپنے آپ کو نہیں بچا۔ جیسے تم نے آج اپنے آپ کو بچ دیا ہے۔ تمہارا خیال ہے۔ اس گیسٹروین کے سوٹ میں ریشمی ٹائی اور چمکتے ہوئے بوتلوں میں تم بہت حسین معلوم ہو رہے ہو، میں تمہیں بتاؤں تم طوائف معلوم ہوتے ہو۔ ایک مرد طوائف !!!

عشرت ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ جیسے کسی نے اُسے گولی ماری ہو۔ پھر بحال ایک اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹتا ہوا وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے رضیہ سے منہ پھیر کے کہا "تم دیوانی ہو گئی ہو۔ تم دیوانی ہو گئی ہو۔"

پھر وہ آٹاں کی طرٹ مڑا۔ اور انہیں ایک سوکانوٹ دیتے ہوئے بولا "آٹاں یہ تو بھلی ہے۔ آپ تو بچے جانتی ہیں۔ میں — میں — یہ سوکانوٹ تو رکھئے۔ میں ہر ماہ کبھی نہ کبھی ادھر آیا کروں گا۔ پوچھ لیا کروں گا۔ اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو آپ رضیہ سے نہیں مجھ سے کہہ دیا کیجئے۔ میں خود خیال رکھوں گا۔ میں ہر ماہ آپ کے لئے — میرا مطلب ہے — آپ کا خرچہ یہاں پہنچا دیا کروں گا۔"

رضیہ نے گج کر آٹاں کے ہاتھوں سے وہ سوکانوٹ چھین لیا۔ اور اس کے سامنے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے بولی "یہ تم میری محبت کی قیمت چکانے آئے ہو۔"

رضیہ کی آنکھوں سے قطرے نکل رہے تھے۔

عشرت نے کھیانہ ہو کے کہا: ”تم ————— تم ————— کھتی نہیں ہو؟“

”جاؤ۔ چلے جاؤ۔ عشرت آج کے بعد کبھی اپنی صورت نہ دکھانا!“

اور جب عشرت چلا گیا تو بچا ایک رضیہ کے دل کی ساری دیواریں ڈھے گئیں۔ اور وہ منہ پھر کے ایک کونے میں موڑ کے اپنے ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا کے کہنے لگی: ”نہ جاؤ عشرت، کہیں نہ جاؤ یہ کھوٹی تمہاری ہے، میں تمہاری ہوں۔ میری ساری زندگی تمہاری ہے۔ آ جاؤ عشرت۔ میری زندگی کے جوتے بنائے اپنے پاؤں میں پہن لو۔ مگر یہاں سے نہ جاؤ۔ اُس گندی قلیظ بدبو دار دنیا میں —“ رضیہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

پہلے پندرہ روز راج لٹا باطل دیوانوں کی طرح رہی۔ یہ دن کچھ اس طرح کے تھے جیسے
 جذبات کی جڑھی ہوئی آندھی ہو، یا سون سون کی موسلا دھار بارش ہو، یا سمندر میں لہریں تھپڑے
 لیتی ہوں۔ اور اپنی اچھال میں کشش کو کبھی بہت اور کبھی بہت نیچے ڈولاتی ہوئی لے جائیں۔ اُن
 پہلے پندرہ دنوں میں راج لٹا۔ کیوں۔ کب۔ کہاں اور کیسے کے تمام سوالوں کو جو ہر فرد کی زندگی
 میں آتے ہیں۔ باطل بھول چکی تھی وہ ایک لمحے کے لئے بھی عشرت کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں
 ہونے دیتی تھی۔ ان پندرہ دنوں میں وہ اپنے بچے سے باہر نہیں نکلی۔ اور اگر کہا جائے کہ اپنے کمرے
 سے باہر نہیں نکلی تو زیادہ صحیح ہوگا۔ کبھی کبھی قودہ کی چلنے والی ناشتہ، دوپہر کا کھانا شام کی چلنے والی
 رات کا کھانا بھی وہیں جگا لیتی تھی۔ کبھی کبھی خود سٹوڈنٹوں کے عشرت کے لئے مرغ بھونتی تھی راج لٹا
 بہت اچھا کھانا بنا سکتی تھی۔ کیوں کہ جس گھر سے وہ آئی تھی۔ وہاں اُسے خود کھانا تیار کرنا پڑتا تھا۔ سرورین تو
 وہ جلد میں ہوئی۔ پہلے تو وہ مشنر کی بیوی تھی۔ مشنر جو اب اس کے گرج میں رہتا تھا۔ مگر اب راج
 کیسے کسی کی پرہیزگار تھی اس سے پہلے اس نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ یہ نہیں کہ اس سے پہلے ساٹھ
 نہ ہوئے ہوں۔ راج کو تو اب اُن کی تعداد بھی یاد نہ تھی۔ مگر چیز الگ تھی۔ یہ جذبہ ہی کچھ اور تھا۔

ہیں۔ شے اہل ہے۔ راج نے سوچا۔ عشرت کے بغیر قزوہ زندہ کیسے رہ سکے گی۔ سٹوڈیو شوٹنگ کرنے کیسے ہلے گی۔ شروع کے پندرہ دنوں میں اس نے ایسا ہی کیا۔ نہ صوفیہ کہ وہ کہے سے باہر نہیں گئی بلکہ شوٹنگ پر بھی نہیں گئی۔ بہت سے پروڈیوسر آئے اور وہاں چلے گئے۔ کسی کی ملاقات نہ ہو سکی۔ ان دنوں میں وہ عشرت کے سوا کسی کی صورت بھی دیکھنا نہ چاہتی تھی۔ ایسی مرضی تھی اس پر۔

مگر میں سب لوگ پریشان تھے یوں تو راج کی بے راہ روی سے سب اکاؤتھے۔ بلکہ ایک طرح سے اس بے راہ روی کی ترغیب دینے والے بھی دیے تھے۔ راج کے ماں باپ بہت غریب تھے، راج بہت حسین تھی۔ شکر اُن دنوں دولت مند تھا۔ کیا ہوا اگر وہ اور میٹر سے اہر کا تھا۔ انہوں نے پانچ ہزار روپے لے کر راج کو شکر سے بیاہ دیا۔ لیکن جب شکر غریب ہو گیا اور منافع والے سماج میں یہ کہنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ کون امیر کب غریب ہو جائے گا اور کون غریب کب امیر ہو جائے گا۔ زندگی کی دوڑ ایک مسلسل غیر قطعی دوڑ ہوتی ہے۔ راج اپنے بڑے خاوند سے جھگڑ کے اپنے ماں باپ کے پاس چلی آئی۔ اس کے بھائی اجمین کو بچپن ہی سے بُری عادتیں پڑ چکی تھیں۔ وہ راج کو گھیر گھاس کے پھسلا کے سبز باغ دکھانے لگے آیا۔ راج کی شوخیاں۔ اس کی شریر ادائیں۔ اس کا بے مثل عُن پروڈیوسروں کو بہت پسند آیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ قرقی کے منازل طے کرتی ہوئی۔ اہلی درجے کی بیوی بن گئی۔ اب کوئی دشواری نہ تھی۔ راج نے اپنے شوہر شکر کو اپنے پاس بلا دیا۔ خاوند چاہے بڑا ہی ہودھو کے کی ایک عمدہ مٹی ہوتا ہے۔ اور بھڑکا ریشور تھے۔ ان کی بیوی گنیشی تھی۔ یہی ڈلاری تھیں۔ ان کی بیٹی رام پیاری تھی۔ رام پیاری کا شوہر اجمیت سکو تھا۔ یہ سب لوگ راج کے معزوں پر پل رہے تھے۔ اور اس طرح پلنے کے سوا۔ اور کسی دوسرے طریقے سے پلنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ کام کرنا تو ایک غیر شریفانہ فعل ہے جسے آدمی اس سماج میں انتہائی بھوری کے تحت سرانجام دیتا ہے۔ اُن میں سے ہر شخص مگر میں ایک چھوٹا سا فرعون تھا۔ ہر شخص خوری کا ایک بوعل

پشتہ راہ بانڈے اپنے گھونٹے کو چھپانے کی کوشش میں غلط تھا۔ برتنوں کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ کسی طرح سے راج کا منظور نظر بن جائے۔ اس چھوٹے سے نظام کشی کا مرکز راج تھی، اور یہ سب مٹا دے اس کے گرد گھوما کرتے تھے۔ اس لئے یہاں عزت نفس کا سوال نہ تھا۔ تو کبھی پیدا ہی نہ ہوا تھا۔ سوال تھا کہ کہیں اگر یہ معاملہ بڑھ گیا تو پھر کیا ہوگا۔ اگر کہیں عشرت اور راج نے شادی کر لی تو ہمارا کیا بے محکا۔ گو سوال پاس طریقے سے کہی؟ نہ ہوئی تھی۔ یہ سوال تو دل میں اندر ہی اندر رہتا تھا مگر تھا بھی۔ بنیادی مرکزی سوال میرا ملوہ مانڈ کیسے سلامت رہے؟ اگر راج ان چندہ دنوں میں کسی طرح سے اُنہیں اس بات کا یقین دلا دیتی تو وہ کاہے کو اتنے پریشان ہوتے۔ مگر راج کو اتنا سوچنے کی فرصت کہاں تھی۔

ایک پرانی سپورٹس کار پورچ میں آکے ٹکی۔ اور مرزا راحت حسین فلم "جوڑ توڑ" کھانا کھاتے اُس میں سے اُتر کے برآمدے کے جانب بڑھتے ہوئے دکان دئے۔ ابھینو نے بھاگ کے انہیں اسے ہی میں لینا چاہا۔ مگر جب تک وہ اندر ڈھانگ رام میں چلے آئے تھے۔ مرزا راحت حسین بڑے عجیبے اور خورج مزاج ڈائریکٹر تھے۔ منہ میں ہر وقت پان رکھتے تھے اور ہیک گولتے رہتے تھے۔ اس لئے جب کبھی گفتگو کرتے تھے۔ تو دو زبان گفتگو میں ہمیشہ چلے چھوڑتے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کدو کہیں پانی کی کسی چلی سٹل سے بول رہے ہیں۔

بورے؟ آج اُنہیں ہے؟" (راج کہاں ہے؟)

ابھینو نے۔ دست بستہ عرض کی؟ حضور کیا بتاؤں۔ بہن کو ایک سو جن بھار ہے؟

"میں اُنہیں کچھ شیتاؤں؟" (میں اسے دیکھ سکتا ہوں)

یہ کہہ کر مرزا آگے بڑھے۔ بیڑوم اُن کا۔ دیکھا بھالا ہوا تھا۔ ابھینو نے آگے بڑھ کے

راستہ ٹوک لیا۔ ڈری ساجت سے بولا کہ اس وقت سو رہی ہیں۔ ابھی ابھی آٹھ گئی ہے۔ ٹاکر نے

حالات سے متنبہ بھی کیا ہے۔ مرزا بہت چکرائے۔ بولے: ”آج اُس کی شوٹنگ ہے۔ شٹ اُکھا ہوا ہے۔“ (سیٹ لگا ہوا ہے)

ابھینو میرے پر اپنی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے بولا: ”کیا کیا جائے مرزا جی مگر تو شوٹنگ کینسل کرنا پڑے گی۔“

مرزا جی نے گہرا کراہو اور ہر دیکھا۔ کہیں اکال دان نظر نہ آیا اور پیک اب منٹ کے اندر بابا بھرجی تھی جنفریب تھا کہ وہ پیک کو کہیں بھی پھینک دیتے۔ ابھینو نے اگال دان فوراً سامنے لاکے رکھ دیا۔ مرزا جی پیک تھوک کے دو مال سے منہ کو پیک سے اور ماتھے کو پیسنے سے صاف کرتے ہوئے بلبلے ”ایک ہزار کا نقصان ہو جائے گا۔ مگر ابھینو تم تو جانتے ہو۔ احمد بھائی بوزیر میرا بڈو کیسر کس قدر کبڑا ہے۔ اس کا تو بارش فیل ہو جائے گا۔ بڑے جوڑ توڑ سے میں نے ظم جوڑ توڑ کی ہار ت کساری حاصل کی تھی۔ وہ سب چورپٹ ہو رہی ہے۔ ابھینو بھائی کسی طریقے سے راج کو سیٹ پر لے آؤ۔“

”یہ تو ناممکن ہے۔“

”دبیل کی ایک بوتل دوں گا۔“

”میں تو آدمی بوتل میں ہی راضی ہو جاتا۔“ ابھینو بولا۔ ”مگر وہ اس بیماری میں کیسے آسکتی ہے۔“

مرزا جی نے دوسرا پان کھنکھاکھا اور پٹنے کے لئے تار ہو گئے۔ ابھینو نے مسکرا کے کہا۔ ”مرزا جی! کوئی ہزل نہیں سنائیے گا۔“

مرزا جی گندی اور عسراں فرمیں کہنے میں یہ طو نے رکھتے تھے۔ اس بات میں ان کا کوئی

ثبانی نہ تھا۔ کتنی ہی شکل سے شکل زمین نکال کے لائے وہ اس میں حریاں غزل کہہ دین گے۔ کئی غلی پر انکوٹ پارٹی ان کی شمولیت کے بغیر ممکن نہ ہوتی تھی۔ شوقین مزاج لوگ جو جنسیات کے ماہر کہے جاتے تھے وہ اساک کی گولیاں، ملا، عریاں پوسٹ کارڈ اور کوک شاستر کے ملا وہ ایک دو

مرزا جی کے تبرکات بھی اُن کی بیاض سے نقل کر کے اپنے پاس رکھتے تھے۔

مرزا جی مسکراتے ہوئے بولے : ”بھرتوں کا۔ یہ سچ نہیں ہے۔ احمد بائی، میرا استاد کر رہا تھا۔“
مرزا جی نے اپنی کُمّلی آستینوں پر آہستہ سے ہاتھ پیرا۔ اپنے شقائق پانچاے پر سے ایک خیالی کُمّی اُڑائی
اور بڑی اداسے جھوٹے ہونے باہر نکل گئے۔ اُن کے جلنے کے بعد ابھینوں نے سائنس دیا۔ انھیں
ٹیلیفون کی گھنٹی زور سے بجی۔ ابھینوں نے ہالک کے ٹیلیفون کا رسیور اُٹھایا۔

”راج لہ ہے ؟“

”آپ کوں بول رہے ہیں ؟“

”میں سیٹھ بھیدی لال ہوں۔“

”نئے سیٹھ جی۔ نئے۔ کہئے۔“

”لہتے تم رہنے دو۔ یہ بتاؤ اب ملج لاک کی طبیعت کیسی ہے۔“

”پرستور بیمار ہیں۔“

”تو ابھی کیوں نہیں ہوئیں۔ پانچ دن سے میرا سیٹ لگا ہڑا ہے۔ بھیدی جھگے کا کیا بات ہے۔“

”میں اپنا ڈاکٹر کیج دوں۔“

”نہیں سیٹھ جی۔ آپ کیوں محکف کریں گے۔ ڈاکٹر تو یہاں موجود ہے۔ اس کا علاج بھی ہو رہا ہے۔“

”محبوب مصیبت ہے۔ راج لاک اس سیٹ میں کام ہے۔ اور پانچ دن سے سیٹ لگا ہوا ہے۔ کل

تک انتظار کروں۔“

”کیا بتاؤں سیٹھ جی۔ اچھا ہونے کو تو وہ کل بھی ابھی ہو گئی تھی۔ اور نہ ہوں تو ایک ماٹک ٹیک نہ ہوں۔“

”ڈیم ! سیٹھ بھیدی لال نے ٹیلیفون بند کر دیا۔“

”ابھینوں نے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھنے ہوئے کہا : ”یہ آج میرا ٹیلیفون ہے چچا“ اور ان کی

ہوئی گشتی اس کے قریب کھڑے ہوئے غامشی سے سنتے رہے۔ آخر چچا دامودر ہلے "اس طرف سے
 تو ہم بدنام ہو جائیں گے"

"اس میں کیا شک ہے؟" ابھینو اُن کی تائید کرتے ہوئے بولا۔

"سب پروڈیوسر ناراض ہو جائیں گے"

"بے شک!"

"پھر کوئی راج کو کام نہیں دے گا"

"بہت ممکن ہے"

"ہم سب کو بھوکا مرنا پڑے گا"

"یہ بھی ہو سکتا ہے"

چچا نے چلنے کہا "تم دروازہ کیوں نہیں توڑ دیتے۔ سالی دن بھر اندر ٹھپی ہوئی کیا کرنی رہتی ہے؟"

ابھینو نے بڑے اطمینان سے کہا "دروازہ سامنے موجود ہے۔ توڑ دیجئے"

چچا دامودر غصے میں آگے بڑھے۔ ابھینو نے انہیں نہیں روکا۔ چچا کو بہت غصہ آیا۔ راج پر

نہیں۔ بلکہ ابھینو پر۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ دروازہ نہیں توڑے گا، اور وہ جانتے تھے کہ

ابھینو بدانتہا ہے کہ چچا دامودر دروازہ توڑنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ پھر بھی اس نے انہیں نہیں روکا۔

"کیونکہ؟" چچا دامودر نے پرکھو دیر کھڑے سوچتے رہے۔ پھر ہلٹ گئے۔ اور چپکے سے ایک صوفے میں گھس

گئے۔ چچا گشتی اُن کے قریب گئیں اور بڑی محبت سے ان کے سر پر ہاتھ پیر کر واپس اٹھو نہایت پریشان

نہ ہو۔ تنہا ہی انیم کا وقت ہو رہا ہے۔ چلو۔ چل کے چکی لگا لو؟

چچا اپنی بیوی کے کہنے سننے پر انیم گولنے کے لئے چلے گئے اور ان کے جانے کا انداز بھی

تھا کہ اگر میری انیم کا وقت نہ ہو گیا ہوتا تو میں یقیناً دروازہ توڑ دیتا۔

کئی کے جانے کے بعد ابھینو نے کمرے کے دروازے کی جانب ٹلا۔ وہاں باکر اس نے دوبارہنگی سی
 دستک دی۔ اندر سے دلچ بولی "کون ہے؟"
 ابھینو نے کہا: "میں ہوں۔ وہ مرزا جی آئے تھے۔"
 "آئے وہ؟"

"سیٹر جمیدی دل کا بھی ٹیلیفون آیا تھا۔"
 "سب کو دے گا؟"

"نہر دیا: ابھینو خدا فرستے ہوا۔"

تھوڑی دیر غاموش رہی اور ابھینو نے کہا: "بہن ٹوٹ گئی ہے۔ میں نے پہلے دیکھا۔"
 "بھروسہ مت کرو: دلچ اندر سے چلائی۔"

ابھینو غاموشی سے ٹسکرا تا ہوا دروازے کے باہر کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد کسی نے دروازے
 کے نیچے سے دس دس کے دو نوٹ سرکاتے ابھینو نے نوٹ اٹھائے۔ اور اپنے کمرے کی طرف جانے ہی
 والا تھا کہ پہلے میں ایک گاڑی کے ٹکرنے کی آواز آئی، اور میڈم تیزی سے اپنی اونچی ایڑی کے جوتوں سے ٹپ ٹپ
 کرتی ہوئی اندر آگئیں۔ ابھینو نے لپک کے انہیں دیکھیں کہ میں جا رہا۔

ابھینو نے کہا: "اے آپ بھی خوب دقت پر آئیں۔ ایک نئی غزل لکھی ہے۔"
 "غزل سنئے گا یہ دقت نہیں ہے: میڈم قرائیں۔"

"تو پٹنے ایک دو بازی تلاش کی ہو جائے؟"

"پتھر کی تو صورت بھی میں اس وقت دیکھنا نہیں چاہتی۔ مجھے تم کسی طرح سے راج کی صورت دکھا دو۔"
 "بس یہی نامکن ہے۔"

"اے: کیسے نامکن ہے۔ کل میرا سیٹھ ہے، اور وہ اس میں کام کر رہی ہے۔"

”کہ تو بیماری پیار ہیں“

”کیا پیاری ہے اُسے!“ میڈم نے ڈپٹ کے پرچھا۔

”بھینو نے سکر کے اصرار اور دیکھا۔ جیسے کوئی راز کی بات کہنے والا ہو۔ میڈم اس کے قریب آئی۔ ”بھینو خاموش کھڑا رہ گیا۔ اس کے چہرے سے سلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ میڈم نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اُسے اپنے قریب کھینچ لیا۔ ”میں نے دیکھا توٹ نکالا۔ ہلی“ اب بتاؤ۔ راج کو کیا بیماری ہے“

”عشرت!“

”میڈم نے کہا: ”آہ! مجھے تشاؤ دے بتایا تھا لیکن میں نے یقین نہیں کیا تھا۔ اسے اقل درجے کی ہیروئن اور ایک ایکسٹرا لائٹ ہے۔ کیا انڈسٹری کے سارے ہیرو مر گئے تھے۔ آؤ! تم کام کرے تو کم از کم کھیلنے سے ڈر کرے“

”جی ہاں! بھینو نے سر ہل کے کہا“ ”یہی تو میں بھی کہتا ہوں۔ اعتراض بڑے کام پر نہیں ہے۔ پہلے ہو۔ اور طریقہ بڑی چیز ہے۔ میڈم ایک فلم میں نے لکھی ہے۔ سلیقہ!“

”ہاں بھائی۔ اس وقت فلم جو سے نہیں شنی جاسکتی۔ تم کسی طرح سے علاج لا کر کل میرے سیٹ پر لے آؤ“

”یہ ناممکن ہے“ بھینو نے آہ بھر کے کہا۔

”میڈم نے سوکا نوٹ جیب سے نکال کے اُسے دیا۔

”اب ممکن ہے“

”بھینو کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے سوکا نوٹ جلدی سے جیب میں رکھ کے کہا: ”دیکھئے کوشش کرتا ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے تم بہت کچھ کر سکتے ہو۔ میڈم نے اس کی بیٹی تھپتھپاتے ہوئے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے کہا۔ انداز میں اُس کی طرف دیکھا کہ بھینو اپنی ساری پالا کی کباہ جو ساری مٹی جلی تھیں گیلے میڈم جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُسے معلوم تھا۔ اُس کی آنکھیں کس حد تک کس کی طرف بے خطر ہو کر کب تک دیکھ سکتی ہیں۔ اب وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں رات کو پھر نئی فن کروں گی۔“

میڈم کے چلے جانے کے بعد ابھینو پھر راج کے کمرے کے دروازے پر جا کے دستک دینے لگا۔ اندر سے رات پھر چلائی۔

”کون ہے؟“

”میڈم کئی تھیں۔“

”بھال دیا ہوتا؟“

”کمال دیا۔“

”کیا کہتی تھی؟“

”کل شوٹنگ ہے۔“

”منت بھو۔“

”مزد بھو۔“ ابھینو نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر مجھے میں پہلے لے گئی تھی جو تم نے دئے تھے کہنا۔ میں اتفاق سے ہرں بھول گئی تھی میں پڑھ لڈو لڈو ہے۔“

تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے کسے کسے کسی نے دس دس کے دو نوٹ بھر کر کاٹے۔ ابھینو نے میں وہ پچھلے جیب میں دھک کر اپنی بھری ہوئی جیب کو اطمینان سے تھپتھپایا۔ پھر اُس نے ہچی گینٹی کے پاس جاکے اُسے میں کے نوٹ دینے اور بولا۔

”یہ اور کھر کا خرچ پلاؤ۔“

”اور میرے لئے“ چلنے بیتاب ہو کے پوچھا۔ وہ دور دراز سے اپنی رنڈی کے ہاں نہیں گیا تھا۔
”تسیر کرو۔ یہ نصیبت ٹل جانے دو۔“ ابھینوں نے بڑی سرد مہری سے کہا۔

اور پھر وہاں سے اٹھ کر موسیٰ دھاری کی جٹی رام پیادی کے شوہر اجیت سنگھ کے پاس گیا۔ اسکا
سے سرگوشی میں کہنے لگا: آج وہ کی کا بندوبست کرو دو لڑکیاں بھی بلاؤ۔ جو ہر مجلس کے
فرماست سے اجیت سنگھ نے اُسے گلے سے لگالیا۔

دن گزرتے چلے گئے۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ دوسرا ہفتہ گزر گیا۔ تیسرا ہفتہ گزر گیا۔ ایک مہینہ
گزر گیا۔

اندکے میں عشرت نے ایک جاہی بے کر کہا: ”ڈارنگ۔ اب تو اس کرے میں دم گھٹنے لگا۔“
”کھڑکی کھول دوں؟“ راق نے بڑے پیار سے اُس سے پوچھا۔

عشرت بولا: ”سر میں شدید درد ہے۔“

راق بولی: ”سرو پاؤں پاسے؟“

عشرت نے کہا: ”نہیں پاری۔ یہ بات ہے کہ اب باہر گھومنے کوئی پابند ہے۔“

”آگے گئے؟“

عشرت نے کہا: ”تم تو میری جان میں مگر تازی ہوا، کھلا آسمان.... کیا خیال ہے۔ میں اس کرے میں

انے ہوئے کھتے دن ہوئے ہوں گے ۛ

س ایک لمحہ ۛ راج نے اس کے رخسار سے اپنے رخسار لگاتے ہوئے کہا۔

عشرت اٹھ کھڑا ہوا بولا ۛ باہر جائیں گے ۛ

راج اس کی طوط شکایت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

عشرت نے کہا ۛ آج میں بہت اُاس ہوں۔ اتنی یاد آ رہی ہیں اور میرے چھوٹے بھائی بہن ۛ

جتے رہ پے کہو انہیں بچے ہوں؟ ۛ

وہ تو میں جانتا ہوں۔ ڈار لنگ۔ مگر یہ بھی تو سوچو۔ مجھے بھی تو کچھ کرنا چاہئے۔ میں خود کدے تھیں کہلاؤ۔

چاہتا ہوں۔ اپنی راج کو۔۔۔ ۛ

راج بولی ۛ میں تمہیں اک دم ہیرو کا پانس دلوادوں گی ۛ

ۛ یہ پانس جب تک ہم اس کمرے سے باہر نہیں نکلیں گے۔ کیسے ہاتھ آئے گا ۛ

راج اوجاب ہو گئی۔ کچھ سوچ کے بولی ۛ اچھا۔ میں کل ہی تمہارے لئے ایک شاندار پارٹی کا

بندوبست کرتی ہوں۔ انڈسٹری کے تمام بڑے بڑے ہدایت کاروں اور پروڈیوسروں اور دوسرے

لوگوں کو بلاتی ہوں۔ سب کا تم سے تعارف کراؤں گی۔ وہیں ہاتھوں ہی باتوں میں تم دیکھو یہاں تمہیں کسی نہ

کسی کچر کا پانس دلوادوں گی۔ یہ کیا خصل ہے ۛ

ۛ تو اٹھو دروازہ کھولو ۛ

ۛ دل ہوں۔ جی نہیں چاہتا ۛ راج کہ مولا سے بولی۔

ۛ تمہاریاں ۛ عشرت نے اس کی چٹیر چٹپٹاتے ہوئے کہا۔

ان نے اٹھ کے ٹہکی بہ ہل سے دروازہ کھولا۔ عشرت اٹھ کھڑا ہوا باہر نکلا۔ ایک ماہ کی تید باشتت سے

و آں باہر آیا تھا۔ دنیا اسے نئی ہی معلوم ہو رہی تھی۔

راج کے بچے کیویں ہمدردوں کی شاخوں میں نہ ٹھانگ بھی سرفراز آگے چلا گئیں
 رہے تھے سداغ کے آواز کی رات پدائی کی خوشی میں اپنے غمناکوں کے ہم فرو چلا دیا سداغ کے
 نام پدائی کے شوہر بیت شوہر کے گراں ہوا گراں ہے حق و گراں نے یہ دھکیل دیا تھا۔ ادب پورا
 محو غم کی ہمدردی میں کز سب سے گنج رہا تھا۔

دلخشا شوہر شوہر کی گشتی ہر غمناکوں کے دوسرے افراد ایک ایک جیت سے بچے میں
 آتے جاتے لوگوں کی طرح دیکھ رہے تھے لشکر کے چہرے پکائی سولہ تھا ہر کوئی جواب نہ تھا کہ
 خواب سے جواب پاتے تھے ہاں کی انگلیں بدلے ہو کر نکلی تھیں جس کے آگے کوئی
 رستہ نہیں تھا۔

اس کا بچہ تھے۔ ہمدردی بے شباب پر آئی تھی۔

ہر پورے کے ایک حوت بیڑی پر دیکھ کے ہر گلاس کے لیے موت سیرک ٹاڑ کر کڑوا دیت تھی
 میں ہاتھ ڈالے کہ رہا تھا۔ یہ سارے پنجابی ہمدرد تھے اور کوئی ہمدردی ہمدردی کی گراں ہوا ہوئی
 جاتے ہیں۔ سنو، سنو، سنو سے شہر دش کی آواز سنائی دیتی ہے کچھ بد ہنسی یہ یہ لوگ لہر

یہ پارٹی ہلے نکلنے میں ہوتی، ہمارے بحال میں ہوتی، تم سمجھتی ہو۔۔۔“
 ”جی فرمائیے؟ ولایت عجم نے کہا۔

”نہیں۔ نہیں۔ مگر یہ سمجھنے کی بات ہے۔ چنے چم بھی ہیں، پتے یہ لوگ بھی ہیں۔ کمرانے پنے میں فرق ہے۔ ہمارے کلوس جوا ایک خاص طرح کی تہذیب۔ ایک خاص طرح کا رنگ دکاؤ۔ ایک خاص طرح کا گرز۔ ایک خاص طرح کی نفاست۔۔۔۔۔ ایس! ایس! کیا کہہ رہا تھا؟“ بجن دت نے ولایت عجم سے پوچھا۔
 ”نفاست! ولایت عجم نے جاتی لے کے ڈھرا دیا۔

بجن دت کی آنکھیں خواہ بہہ ہو گئیں۔ بولا: ”میں دنیا کا سب سے بڑا موسیقار ہو سکتا تھا۔ مرسیری محبت نے مجھے تباہ کر دیا۔“

”آپ کو کسی سے محبت ہے؟ ولایت نے پوچھا۔

بجن دت نے ولایت کی کمر کو زور سے چڑا لیا غصے میں بولا ”محبت کے بغیر موسیقی ناممکن رہتی ہے جب زندگی کا فخر ہے، ہا کوی ٹیگور نے کہا ہے ولایت ہیں لڑکی سے میں محبت کرتا ہوں۔ اس کی آنکھیں اگر تھوڑی تھوڑی۔۔۔ کوئی اور بات کرو۔ بجن دت نے ایسی سے سر ہٹ کے کہا۔
 ”وہ کس کی ولایت لے گیا۔“

”ایس! ایس! لڑکی۔ میرے ہاتھ سے پیر! بجن دت ولایت کو دھکی پلانے لگا۔

ایک گھونٹ پی کر بجن دت نے کہا ”میں بے مد تاوش ہوں، لڑکی ہوں، مصیبت میں ہوں۔ ولایت تم کسی طرح سے میری مدد کرو، میں اس لڑکی کو بھولنا چاہتا ہوں؟“
 ولایت مشکو کے ہلے ”میں بھی کسی کو بھولنا چاہتی ہوں؟“

”آہ! بجن دت نے ولایت کی کمر کو زور سے کس کر کہا ”میں بھی تاوش، تم بھی تاوش تو چلو ہم دونوں جو ہو طیس۔ میں تم سے کندھے پر سر رکھ کر دوڑوں گا۔ تم سیرے کندھے پر سر رکھ کر

رونا۔ فائن :-

بجین دت دسکی چنے لگا۔ اتنے میں ایک عظیم فن کار قسم کا پیر جس کا نام بھندہ کار تھا۔ منہ بسورے رکھتا تھا۔ بجین دت سے آگے پوچھنے لگا :- ”بجین دت آرٹ کے کچے ہیں، برنج سے رینا شراٹلگ چکی ہے :- ”بجین دت نے بھندہ کار کے ساتھ کھڑی ہوئی۔ مشہور ہندی رینا کو دیکھ کے کہا ”آرٹ آرٹ ایک سانپ ہے :-
”سانپ !“ برنجنا زور سے چئی۔

برآمدے میں بہت سی کھڑی ہوئی لوکیاں چلائیں ”سانپ ! سانپ !“ بہت سے لوگ ادھر ادھر بھاگے۔ اک بھگدڑ سی مچ گئی۔ شراب کے بہت سے جام ٹوٹ گئے۔ بہت سی لوکیاں ڈر کے مارے مردوں کے سینے سے لگ گئیں۔ سانپ نے واقعی پدائی میں جان ڈال دی تھی۔ بڑی مشکل سے بھندہ کار نے سلاٹے کو ٹنڈا کیا۔ اس نے کہا ”ابھی یہاں تو آرٹ کے بارے میں گفتگو ہورہی تھی :-

”آرٹ ؟“ ششاد چمک کے بولی :- ”سب سے اچھا آرٹ سلک جیناں سنگھی کی دکان میں ملتا ہے، جواب نہیں ہے وہاں کے آرٹ کا :-

بھندہ کار نے موڑ کر اکرم سے باتیں کرنے لگا :- ”آپ آج کل کون سی تصویر پرکھا ہے؟“

صورت ہیں :-

”نی امال تو کوئی نہیں :-

”تو پھر کسی تصویر کی کہانی گیت مکالمے :-“

”ابھی تک تو خالی ہیں :-

”اوہ :-“ بھندہ کار نے چونک کر کہا۔ پھر کسی گہری سوچ میں لکھو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہوش میں

آکے کہنے لگا۔

”آپ شغل کے سنے مل کرتے ہیں؟“

”نہیں؟“

”آپ کے پاس موٹر ہے؟“

”نہیں؟“

”پ کوٹھارک سکن کا سوٹ پسند ہے؟“

”ہاں۔ مگر۔۔۔۔۔“

مگر بعد کما روڑ چلتا جا رہا تھا۔

”آپ سینکے باہر اپنا نام دیکھنا پسند کرتے ہیں؟“

”ہاں۔ مگر۔۔۔۔۔“

”آپ ایک گھر چاہتے ہیں ایک خوب صورت باغ۔ مگر میں پیاری بیوی۔ بیوی کے پیارے بچے؟“

”ہاں۔ مگر۔ دیکھئے؟“ اکرم کو کہنا چاہتا تھا۔

بعد کما رے کہا۔ میں کیا دیکھوں۔ آپ دیکھئے۔ مٹر اکرم آپ دیکھئے۔ اگر آپ اس سلاخ میں کاریا؟

ہونا چاہتے ہیں تو آپ اپنے آپ کو بیچ ڈالئے۔ بنگلہ عمارت پر بیچ ڈالئے۔ اپنے لئے کچھ نہ رکئے۔ کہیں پھر

کا کوئی حق؟۔ روح کا کوئی اللہ۔ خیال کا کوئی حق؟ باقی نہ رہنے پائے؟

اکرم نے کہا۔ ”میں نے تھوڑی سی مدت پر مری ہے بیچ ڈالنے والوں کا انجام بھی جانتا ہوں؟“

”دلوں کے جسے انجام سے ڈر کر آپ اتنی لمبی چوڑی زندگی کو تباہ کر رہے ہیں؟“

اکرم نے کہا۔ ”میں کچھ چیزوں اور رشتوں کو بدلنا چاہتا ہوں؟“

بعد کما رے کہا۔ ”بڑی عادت ہے؟“

بھندہ کار اکرم کو جھوٹا کر رخصت کی طوف چلا گیا۔ جس سے بے کار میں پٹنے کی کوشش ایک عرصے سے جوشی جی کر رہے تھے۔ بھندہ کار کے سامنے کس ڈائریکٹر کی پہل تھی۔ بھندہ کار کھلتے دیکھ کر جوشی جگ ہو گیا۔ بھندہ کار نے اُسی طوف شکر کے کہا: ”سودا“

”جی سرکار“ جوشی مسرت سے چلایا۔ اور بلج ڈاکٹر ڈھونڈنے لگا۔

راج تاعشرت کا تعلق بیٹھ باہن اے کر رہی تھی۔ شروع شروع میں سلامان نہ تھا۔ لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ یہ پارٹی کس تقریب میں دی جا رہی ہے۔ لیکن جب راج نے مختلف پروڈر سوں کی ٹولہوں میں جا جا کے اپنے محبوب کا تعارف کرانا اور ان سے رول اٹھانا شروع کیا۔ باتوں کی باتوں میں شہس کر گئی اور اسے کبھی شوخ آراء شہسے۔ کبھی اک عجیب پائیت سے جھپٹتے کے باوجود نہایت غلیظ معلوم ہوتی تھی۔ تو سب سے راز ٹھل گیا کہ یہ وہی کے جام کیوں مٹا دے جا رہے ہیں۔

”جی ہاں۔ مزے کوئی کرے۔ رول ہم دیں۔“ بیٹھ بھیدی لال بولے ”ایسے اونچے ہم نہیں ہیں؟“

مرزا جی کا ہنسان کے منہ میں پیک گھول رہا تھا۔

”مگر اس لڑکھے میں ہے کیا؟“ رجنال نے ڈی غرت سے بھندہ کار سے پوچھا؟ بالکل رنجا معلوم ہوتا ہے

پعشرت؟“

بھندہ کار نے کہا: ”نہتے ہیں، امین لاڈ سے اس کی صورت ملتی ہے“

”جی؟“ رجنال بولی۔ ”لنے میں اُسے راج لٹا آئے ہوئے دکائی دی۔ فوراً پٹ کے اس سے پٹ گئی۔ بولی“ ہائے دی کتنی خوش قسمت ہے تو۔ میری تو حضرت کو دیکھتے ہی جان میں گئی، ہوشیار ہونا کسی دی جیت کے لے جلتی گی“

راج قلبے حد خوش ہوئی اس نے رجنال کو جوم لیا۔ دونوں سبلیاں ایک دوسرے سے پٹ گئیں۔

پھر راج نے ہمتدھار سے پرچھا۔

”پارٹی پسند آئی؟“

”سیڈم؟“ ہمتدھار اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کے مغربی انداز میں ٹھکارتا یہ مگر ٹیسٹ شاندار ست عظیم اشانت پارتی ہے جو میں نے اپنی زندگی میں دیکھی ہے۔“

جوشی جی ابھینو کر لے ایک کمرے میں بیٹھے بی رہے تھے۔ رشتے داروں میں مومن بھینوی، پارٹوں میں شریک ہو سکتا تھا۔

جوشی جی کہہ رہے تھے ”گنگا جلی کی قسم کھا کے کہتا ہوں۔ مریاؤں کا۔ مگر اس عشرت کو کبھی پارٹ نہیں دوں گا۔“

ابھینو نے کہا ”جی ہاں۔ کبھی مت دیکھے گا۔ مگر بے دہائی تو دیکھے۔“ ابھینو نے بام خالی کر دیا جوشی جی کہہ رہے تھے ”اور وہ بھی پھر ایک مسلمان لڑکے سے! اری تنہا ہی غیبت کو کیا ہو ہے ابھینو۔“

”ایک شریف ہندو مگر لڑنے کی لڑکی۔۔۔۔۔ اور وہ ایک مسلمان سے عشق کرے۔ میں پوچھا ہوں کوئی ہندو نہیں ملا تھا۔ کیا انڈیٹری کے سب ہندو بیروں گئے تھے؟“

”بڑا بڑا“ ابھینو نے سے تالی بھلے کے چونکا۔ جوشی جی نے کہا ”کیا بات ہوئی؟“

ابھینو بولا ”جلدی سے دہلی دو۔ یہ میری ہندو شرافت کا تقاضا ہے۔“

”تنہا ہی شرافت کہاں ہے؟ جوشی جی نے فستے سے پرچھا۔

”میری جیب میں“ ابھینو نے جیب سے چھ سات دس دس کے نوٹ نکالے۔ اور انہیں پھر پڑے پڑے

سے چوم کر جیب میں واپس ڈال دیا۔ بولا ”آج میں بہت شریف ہوں۔ میری۔۔۔۔۔“

اکرم اصرے گند رہا تھا۔ ابھینو کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اس نے جلدی سے اکرم کو کمرے میں بلا لیا۔

جوشی بھی کرتا رہا۔

ابھینو نے کہا - اکرم بتایا ایک شعل آن پڑی ہے۔ مل کر دیکھئے :-
”فرمائیے !“

جوشی نے اکرم کے آنکھ مار کے کہا - ”یہ پئے ہوئے ہے“

ابھینو نے شعلہ بارھکا ہوں سے جوشی کی طرف دیکھا اور کہا - ”جی ہاں۔ میں ہر روز جنگ پتا ہوں۔ آج
دسکی پی رہا ہوں“۔ ”فرمائیے بات کیا ہے مجھے جلدی مکر رہا ہے؟“ اکرم نے کہا

”اتنی جلدی؟“ ابھینو نے پوچھا۔ ”ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں پولیس
آئے گی۔ پھر تھوڑا سا ہنگامہ ہوگا۔ اس کے بعد ہم سب لوگ یہاں سے نکالے جانے کے بعد چور ہو
پرطیں گے۔ راج نے جو ہر کا ایک ہورا ہوٹل آج کی رات کے لئے مجھ کو لیا ہے۔ آپ نہیں جائیں گے۔“
”نہیں؟“

”کم از کم پولیس کو تو آنے دیجئے۔ ہم میں سے ایک تو ایسا ہونا چاہئے جو پولیس سے لگنت کے بغیر
بات کر سکے؟“

اکرم نے پریشان ہو کر کہا - ”آپ بات بتائیے۔ نہیں تو میں ...“ ابھینو نے اُسے آستیں سے
بچھڑ کر اپنے پاس بٹھایا۔

”بڑا سادہ سوال ہے۔ یہ جوشی جی کہتے ہیں کہ راج ایک ہندو لڑکی ہے۔ اُسے مشرت سے محبت
نہیں کرنا چاہئے۔ اگر مشرت ایک ہندو لڑکا ہوتا۔ تو انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ یہاں تک نہیں ہے
کہ جوشی جی ہندو مسلمانوں کی آپس کی شادیوں کے خلاف ہیں۔ مثال کے طور پر اگر بھی مشرت ہندو
ہوتا اور راج مسلمان ہوتی تو انہیں اس شادی پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ انہیں نہ محبت پر اعتراض
ہے۔ نہ مذہب پر۔ بھر کس بات پر اعتراض ہے۔ یہ میری جگہ میں نہیں آتا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں؟“

کر جوشی جی کا سنہ دیکھنے لگا۔

جوشی جی کسیانی جیسی نہیں کر رہے ” میں تو اکرم تم جانتے ہو، اس قسم کی فرقہ واریت سے کتنا درد
ہوگا۔ یہ کج بخت ابھینو اس وقت پی کر بیگ گیا ہے ؟

اکرم نے ابھینو سے پوچھا : ” کیا تمہیں نہیں ہے کہ بخت ہے ؟ حضرت ادراد کے درمیان بخت
ہے ؟ “

ابھینو نے کہا : ” کیا تمہیں جیسی ہے کہ اگر حضرت نہ ہوتا تو یہ بخت ہوتی۔ حضرت نہ ہوتا جوشی جی چوتے
تو یہ بخت ہوتی، ادراد نہ ہوتی، ششاد ہوتی تو یہ بخت ہوتی ؟ “

ابھینو نے کہا : ” مگر اکرم بھیا، میں اس سوال کو حل کر کے چھوڑوں گا تا ابھینو کی بھوسیں ٹھوگئیں
اس نے بڑی سیرنگی سے ایک گلاس دہکی کا اپنے سامنے رکھ کے کہا ” یہ ایک ہندو لڑکا ہے ؟
پھر اس نے ایک دوسرا گلاس اٹھایا۔ اور کہا ” یہ ایک ہندو لڑکی ہے۔ کیا یہ دونوں مل سکتے
ہیں ؟ “ کے دیکھیں ؟ ” ابھینو نے ایک گلاس کی دہکی دوسرے میں ڈال دی۔ مل گئی۔ ” ابھینو نے کہا
بھلا کے برو ” اچھا اب یہ گلاس اٹھاؤ یہ مسلمان لڑکا ہے۔ ” برا اٹھاؤ۔ یہ مسلمان لڑکی ہے۔
کر لڑو۔ آبا۔ پھر مل گئے “

ابھینو نے پھر دو گلاسوں کی دہکی اپنے گلاس میں اڑیل لی۔ چار چھوٹے ٹکڑے ایک بڑا
پیگس کے سامنے تھا۔ ایک پیگ۔ پھر اس نے ایک گلاس میں دہکی ڈالی۔ یہ ہندو لڑکا
ہے۔ یہ مسلمان لڑکی ہے۔ آبا۔ دونوں مل گئے۔ ” دونوں چھوٹے بھی اس نے اپنے پیگس پر
ڈال دیے۔ اب اس نے ایک اور گلاس اٹھایا : ” یہ مسلمان لڑکا ہے۔ یہ ہندو لڑکی ہے جوشی جی
کہتے ہیں۔ یہ نہیں ملیں گے۔ آئیے دیکھیں، ایں۔ یہ تو مل گئے۔ ایک ہی رنگ، ایک ہی خالہ دی
ہو اس دہکی خالہ کی گئی، وہی اس کا خالہ “

جوشی جی نے کھیلنے ہر کے کہا۔ ارے بُدھو۔ اب سب گلاسوں میں توڑ دی ہے۔
 اہمینو بولا۔ یہی تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ ہم سب میں دسکی ہے۔ ہم سب اسی آگ اور پانی سے
 بنے ہیں۔ نام عشرت ہوا تو کیا، اور جوشی ہوا تو کیا؟
 اس کے بعد اہمینو بہت بڑا پیک ٹکناٹ پیٹے لگا۔
 جوشی جی نے کرم سے کہا۔ آج مرے گا یہ۔
 کرم کوئی جواب دے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔

بڑے ہل میں سے تالیوں کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ غلی ریکھاؤں کی دھن پر
 رضیہ، رضیہ اور ولایت بگم تاج رہی تھیں۔ راج تلے خاص طور پر ان لوگوں کو پیسے دے کر کچے
 کئے جوا بامست۔ رضیہ نہ آتی مگر آتاں سخت پارتھیں اور اُسے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔
 اُسے معلوم تھا۔ وہاں پر عشرت ہوگا۔ مگر آتاں کی جان کے لئے پڑے ہوئے تھے۔ دھکر کے قتلے
 تھے بہن کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی خوب مصوت بٹھاہوں کی اداسی رضیہ سے دیکھی نہ جاتی تھی۔
 چندہ دی سے کہیں کام نہ ملا تھا جب راج تلے تیس روپے ایذا داس کے بچے دئے تو رضیہ سے
 انکار نہ ہو سکا۔

تاج سے پہلے رضیہ پاٹلی میں باصل شریک نہیں ہوئی۔ رضیہ اور ولایت بگم دونوں
 شریک تھیں۔ مگر رضیہ فاسوشی سے ایک آپ کے کمرے میں بھی رہی۔ کسی کو اس کی آٹکا پڑ نہ تھا۔
 کسی کو پر دا بھی نہ تھی۔ عشرت کو بھی معلوم نہ تھا۔ راج نے بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک
 ایکٹر اڑکی!

رضیہ نے سوچ لیا تھا کہ وہ بٹھاہیں اٹھا کے کسی طرف نہیں دیکھے گی۔ وہ دو آدمی کو
 دیکھے گی۔ چہت کر دیکھے گی۔ اور فرس کر دیکھے گی۔ اور ہوا کر دیکھے گی، مگر کسی کے چہرے کو

اور کسی کی آنکھوں کو اور کسی کے ہونٹوں کو اور کسی کے بالوں کو اور کسی کی مسکراہٹ کو کبھی نہیں دیکھے گی اگر کسی طرح سے وہ نہ دیکھ سکے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے کہا تم صرف اس جگہ انگلی ہوجانا جہاں وہ متناہو مجھے روپوں کی شدید ضرورت ہے۔ میں اپنے پاؤں سے ناچوں گی اور اپنی کمر سے۔ کڑے سے۔ بازوؤں۔ گردن اور شانے سے اور ہونٹوں کی چربش سے ناچوں گی، مگر آنکھوں سے آج نہیں ناچ سکوں گی۔ کیوں کہ آنکھیں روح میں جھانک کر دیکھ سکتی ہیں۔ اور اگر اس نے کہیں دیکھ لیا تو یہاں ہی اسے میری شکل دیکھ لی۔ تو وہ کہہ مسکرائے گا۔ آنکھوں! کیا تم اندھی نہیں ہو سکتیں چند لمحوں کے لئے، لوگ کہتے ہیں۔ محبت اندھی ہوتی ہے۔ وہ اپنے محبوب کے سوا اور سب کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ یہاں تک محبت ایسی بھی تر ہوتی ہے جس میں انسان اپنے محبوب کے سوا اور سب کچھ دیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ یہی ہی آنکھیں چاہتی ہوں۔ رضیہ نے اُسے ٹھوکار دیا۔ "پل کم محبت۔ کیا سوچ رہی ہے وہ لوگ! میں روشنی گل کئے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ناچ شروع ہونے والا ہے۔"

ہال میں اندھیرا تھا جب رضیہ، رضیہ اور ولایت بیچ اندرائیں روشن ہو گئے۔ جیسے جیسے صبح کی سائنس کسی کو دیکھ کر تیز ہو جائے۔ پھر کہیں سے پائل کی جھلک سنائی دی۔ جیسے کوئی تار توڑ کر رہ گیا۔ پھر روشنی کا ایک چھوٹا سا دائرہ گھومتا ہوا ولایت بیچ سے رضیہ، رضیہ، رضیہ پر رکا۔ ایک لمحے کے لئے۔ ایک لمحے کے لئے رضیہ کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ ایک لمحے کے لئے کسی نے زور سے سانس اندھ کینی۔ پھر اس کے کر رضیہ کچھ سکتی کہ کون ہے۔ ہال میں لاٹ ہو گئی اور تپانہ زور سے شروع ہو گیا۔ رضیہ کی نگاہ سب سے پہلے میں پر پڑی وہ عشرت نما مسکراہٹ جیل کی طرح اس کے ہونٹوں پر چمکی ہوئی تھی۔ رات نے اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا تھا: جب رضیہ ناچتی رہی عشرت چمکی طرح بک بنا ہوا میٹھا سا۔ وہ بل نہیں سکتا تھا۔ رضیہ ۲ کے قریب سے ناچتی ہوئی گزری اور قریب سے گزری اور قریب سے گزری۔

یہ ایک عشرت بڑے نور سے چلوا : روشنی مل کر دو :
یہ ایک ہال کی روشنیاں مل ہو گئیں ۔

لاٹ ہیں نے جس کے ہاتھ میں روشنی کا انتظام تھا ۔ عشرت کی جھلکا : آواز سے گھبرا کر ہال کی روشنی مل گئی تھی ۔ چند لمحوں کے لئے ہال میں ہنگامہ سا ہو گیا ۔
” روشنی کھول دو ۔ کیا ہوا ۔ روشنی : ” روشنی :
راج : ” تا چلائی : ” روشنی کر دو : ”

ہال کی روشنیاں پھر بجنے لگیں ۔ راج نے پوچھا : کیا ہوا تھا ڈارنگ ؟
عشرت نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھ کر کہا : ” کون نہیں ۔ پکڑا گیا تھا ۔ روشنی چھینے لگی تھی : ”
” اب ؟ ”

” اب ٹھیک ہوں : ” عشرت نے مسکولے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ۔
میک اپ کے کمرے میں اندھیرا تھا ۔ رضیہ دھیرے دھیرے رو رہی تھی ۔ ولایت بیگم اس کے پاس
بٹھی تھی ۔ خاموش ۔

رضیہ روتے روتے بولی : ” عجیب اندھیرا سا ہے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے ۔ جیسے میں اس کے
گہرے ہوئے خوب صورت بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر رہی ہوں : ”
ولایت بیگم نے کہا : ” اس خاموشی میں کبھی کبھی اُس بچے کی چیخ سنتی ہوں : ”
” کس بچے کی ؟ ” رضیہ نے سکتے ہوئے پوچھا ۔

ولایت بیگم رضیہ کے باطل قریب آگئی ۔ اس کے گلے سے لگ کر بولی : ” جانتی ہو رضیہ میں کیا ارسال
کی تھی جب انہوں نے مجھ پر یہ ظلم توڑا ۔ ڈاکٹر کہتے ہیں ۔ میرے رحم میں کوئی نقص پیدا ہو گیا ہے میرے
اب کبھی کوئی بچہ نہ ہوگا ۔ پھر بھی ۔ ”

دلایت ہی سختی سے دغیرے پرٹ گئی۔ بولی: ”پھر کبھی — کبھی کبھی مجھے اس بچے کو سچ بتائی
 دیتی ہے۔ کبھی کبھی وہ میری کوکھ میں کسانے لگتا ہے۔ کبھی کبھی میرے بازوؤں میں بچنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی
 اس کے ننھے ننھے ہاتھ میری چھاتیوں پر بیٹھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ میرے خدا! یہ ایسا کیوں ہوتا ہے
 ایسا کیوں ہوتا ہے؟“

دغیر نے دلایت کو چوم کے کہا: ”تو بڑی اچھی لڑکی ہے۔ تو نہ جایا کر۔ ان مردوں کے ساتھ کبھی نہ
 جایا کر۔ تو کیوں جاتی ہے۔ آج اس کے ساتھ، کل اس کے ساتھ۔ عورت کو یہاں نہیں لگنا چاہئے۔“
 دلایت خدا کی ہنسی۔ بولی: ”بھلی۔ میں کوئی عورت تھوڑی ہوں۔ میں قراب طوائف ہوں!“

کوئی ہانچے کے قریب سج کر پادشاہ پر ختم ہوئی۔ وہ اہمیتوں کا کہنا ٹھیک تھا۔ کوئی دھبے کے قریب جہازوں کی شکایت پر پولیس آئی۔ تو سب کا غل غلط بند ہوا۔ اور سب لوگ گاڑیوں میں بیٹھ کر جھوپٹے گئے۔ اور وہاں سے کوئی ہانچے بچے کے قریب بھٹل برخواست ہوئی۔ بہت سے لوگ جن کی اس دوز شوٹنگ نہیں تھی۔ وہاں کرہاں میں پڑ کے سو گئے۔ دوسرے لوگ جنہیں ہم تھا گاڑیوں میں بیٹھ کر گھر لوں کو بھاگے۔ راج لاکا شوٹنگ تھی۔ لیکن شوٹنگ سے پہلے اُسے صبح سنا کالج میں ہارن بنی سڈ پرایک ادبی سوسائٹی کا افتتاح کرنے کے لئے جانا تھا۔ اس نے وہ عشرت کو در کر گمراہی غفلت کرنے کے لئے۔ کچھ تبدیل کرنے کے لئے۔ ایک آپ کرنے کے لئے تین گھنٹے تو چاہئیں۔

ڈریسنگ ٹیبل پر اس کی اور عشرت کی باتیں ہوئیں۔ راج لاکا کوئی گھٹی ہوئی لڑکی نہ تھی۔ وہ اکثر ایک انقلابی اور باڈی پہنے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر میک آپ کرنے لگتی۔ یہ اس کی زندگی کے سنجیدہ ترین لمحے ہوتے۔ جب وہ خود سے اپنے حسن و جمال کا جائزہ لیتی۔ اور اپنی زندگی کے حریف پہلوؤں پر غور کرتی۔

”وا، نگ دو برش دینا، راج نے عشرت سے کہا
عشرت نے برش اٹھا کے دیا۔

راج بولی : جو شہی جی نے وعدہ کر لیا ہے۔ سیٹر باجڑا نے بھی وعدہ کر لیا ہے۔ میڈم سے کبھی کبھار
ہوں۔ بلکہ کل تو دو سو روپے زمی میں جان بوجھ کے میں بارگئی، کہ کسی طرح میڈم خوش ہو جائیں
تم جو شہی جی کی اگلی بچہ میں بیڑ کا کام کر رہے ہو۔ مزاجی نے بھی ہاں کر دی ہے۔ چھیدی لال نے بھی
منظور کر لیا ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ اگر وہ بچہ میں بیڑ کا چانس دے تو میں اس سے دس ہزار روپے
کم لوں گی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اگلے ہفتے اپنی نئی تصویر کا اعلان کر رہا ہے۔ جس میں تم بیڑ میں تباہی
بیڑوں۔ ڈار فلک دو بچی کوٹ دیتا۔ یوں دھبے تو رات کو دس ہیں پروڈیوسروں نے کئے ہیں۔ مگر
ان میں دو چار بھی نہیں چانس دے دیں۔ تو دو سالوں ہی میں تم وہاں اوپر نظر آؤ گے۔ راج نے زحمت
کی طرف دیکھی، عشرت نے اسے گلے سے لگایا۔

”اے سے۔ میرا میک اپ مت خراب کر۔ جان!“

راج ذرا تنک کر بولی : کالی پہننا ہے۔ اتحاد دیکھو۔ ابھینو نے میرے لئے ایک تقریر تیار کر دی ہے
فورا تم دیکھ لو اے۔ تم ذکر بحیث ہو۔ آئینہ میری تقریر کی تم ہی لکھا کرتا۔ ٹھیک ہے نا پارے؟“
”ہاں ہاری؟“

عشرت قہر سے دیکھنے لگا۔ اسنے میں راج نے اس سے بڑے پیار سے کہا : جانی
رجنل کے ہاں تھے پیرس کا ڈاکے میں اور ایک بہت عمدہ بلو ظم بھی آئی ہے۔ کہہ رہی تھی بہت
بلو ظم ہے۔

”بلو ظم کیا ہوتی ہے؟“

”تم پہو کے تو تمہیں بتائیں گے“

”اور کون کون ہو گا وہاں؟“

”زیادہ لوگ نہیں ہوں گے۔ زیادہ لوگوں میں بلوغت نہیں دیگی جاتی۔ بس تم اوزیں، خشتا اور اس کا۔
دو بٹا اور اس کا۔“

”خشتا کا اس کا کون ہے؟“ شرت نے پوچھا۔

”تم نہیں جانتے ہارے سیٹھ، نو درد من داس جوہری کا لڑکا گلاب داس۔ دیکھنے میں بڑا حسین اور خوبصورت ہے۔ سچی سچی گلاب معلوم ہوتا ہے۔ مگر خشتا کو اس سے محبت نہیں ہے۔“

”کیوں؟“

”کیوں کہ وہ جی اسٹوارٹ پر مبنی ہے۔ گلاب بے چارہ ہر سال اسے ایک نئی کار اور ہزاروں کے جواہرات لے کے دیتا ہے۔ پھر بھی خشتا خوش نہیں ہے۔ اگر وادی کا دباؤ نہ ہوتا تو وہ کب کی اُسے دستا بپائی کرتی۔ فوراً وہ سینڈل تو دیتا۔“

سجنا ناکالچ کا بال باصل بھرا ہوا تھا۔ ادنیٰ مجلس کا افتتاح تھا۔ لیکن سائنس کے علماء نے بھی مہنی مہنائی تھی۔ اور سب کے سب ہاں میں جمع تھے۔ بلکہ بہت سے لڑکے تو بال کے باہر کھڑے تھے۔ انہیں بال میں کھڑے ہونے کو بھی جگہ نہ ملی تھی۔ پرنسپل صاحب جن کی مونچھیں برود زگری دکھائی تھیں۔ وہ بھی آج اپنی مونچھوں کو ہل دے کے آئے تھے۔ ہر فیصلوں کی جینکوں کے شیشے غیر معمولی طور پر صاف تھے۔ اور پتلونوں پر بھی استری کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لڑکے تو غیر بہترین لباس پہن کے آئے ہی تھے تو خرف اور نالی لان کے شرٹ جن سے اند کا ہم کا حصہ صاف نظر آتا ہے۔ ٹخنوں سے اور تنگ مہی

کی چٹوئیں۔ کچھ عرصے کے بعد لڑکے نائی لان کی شفات چٹوئیں بھی پہنے لگیں گے بھرپور دھڑکتوں میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔ راج دل لے سوچا۔

راج لاہشرٹ اور ابھینو کو ساتھ لے کے آئی تھی۔ مگر وہ چونکہ لڑکوں کا کالج تھا۔ اس نے کسی نے ان دو خلیوں کی طرف توجہ نہ کی۔ عشرت بہت عرصہ باس پہن کے آیا تھا۔ مگر لڑکوں نے اُسے ایک نظر دیکھا۔ پھر سمجھ گئے۔ پھر انہوں نے اُسے واقعی نظر انداز کر دیا۔ جیسے وہ بال ہیں۔ ٹھیکانہ ہو۔ راج لڑکیاں تقریر بہت عرصہ تھی۔ ابھینو نے جگہ جگہ۔ اپنی فقرے اور اقوال پُر کر کر دے دیے تھے۔ ان پر راج کو بے حد داولی۔ آخر میں جب اس نے اپنی تقریر اس شعر پر ختم کی۔

جو بے نشان چلتے وہ پاگئے منزل

ہیں تو راہ کے نام و نشان نے ٹوٹ دیا

ماہرین متواثر نہ دست تک تمہاریاں بیٹھے رہے۔ راج لڑکی کی تقریر کا موضوع تھا "اخلاق اور ادب" صاحب صدر جو خود کالج کے پرنسپل تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اخلاق اور ادب پاس ہے بہتر تقریر آج تک نہیں کی گئی۔

تقریر کرنے کے بعد راج کو لڑکوں نے گھیر لیا۔ آؤ گراں کے لئے۔ اس میں کالج میں جانے کا مقصد یہی ہوتا ہے۔ تقریر اور دعوت تو ایک ہی بات ہوتی ہے۔ اس چیز کو تو لہو ہوتا ہے جب تک کی مائے ناز ہر دین آپ کے سامنے باطل سامنے چندا پنوں کے غاصط پر کڑی آپ کی آؤ گراں ہم پر دستخط کر رہی ہوتی ہے۔ تم جنت میں پہنچ جاتے ہو۔

راج کو کئی لڑکوں نے گھیر رکھا تھا

شیخ کے ایک کونے میں ابھینو اور عشرت بے وقوفوں کی طرح بیٹھے کبھی اٹھیاں ہٹاتے۔ کبھی پاؤں کھانے لگتے۔ عشرت کو بار بار پسینہ آتا تھا مالاں کے سر کے اوپر پس کھاہل رہا تھا۔

تاریخ کے پروفیسر نے جزئیے کے پروفیسر سے کہا "ہمارے وقتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ہم لوگ ملک کے بڑے بڑے فلسفیوں، سیاست دانوں، عالموں اور اادیوں کو بلاتے تھے، اور ان کی باتیں سنتے تھے۔ آج اگر فزکس سوسائٹی کے لئے چندہ اکٹھا کرنا ہو تو ہمیں کسی ظم اشار کو بلایا جاتا ہے۔ مجھے ظم دانوں سے کوئی عطا نہیں ہے۔ مگر یہ لڑکی پروفیسر نے راج کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ یہ ادب یا سائنس یا تاریخ یا جغرافیہ کس کے بارے میں کیا جانتی ہے۔ یہ غالباً صرف چیک بک یا انٹرکرافٹ بک پروفیکار سکتی ہے۔"

جزئیے کے پروفیسر نے جس کر کہا "مائی ڈیرئل گاؤٹھر۔ آج کل تاریخ کا زمانہ نہیں ملتا۔ آج کل کے نئے لڑکے تاریخ کے بجائے جزئیے میں زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ اب اس بہترین ناخیز جزئیے ڈکھو! پروفیسر مل گاؤٹھر ہنسنے لگا۔ اور جزئیے کے پروفیسر کو کھینچ کر بال سے باہر لے گیا۔

کئی بنے گزر گئے، مگر عشرت کو سیر کا پانس نہ ملا۔ راج لانے بے حد کوشش کی، مگر اسے کہیں کامیابی کی صورت نظر نہ آئی۔ سیٹھ جمیدی لال نے تو قہر کا اعلان ہی کر دیا تھا: ”جمیدی ڈاکو، جس میں عشرت اللہ راج لانہ لوں گا کام تھا۔ مگر بعد میں ڈسٹری بیوٹروں کے کہنے پر اسے اس قصیدے کے بننے کا خیال ترک کر دینا پڑا۔ کیوں کہ ڈسٹری بیوٹران دونوں لڑکیوں کے اعزاز کے مطالب سرائے کی کسی کے باعث اور اس پر سود و سود کی زیادتی کے باعث زیادہ تصویریں بنانے کے حق میں نہیں تھے اور ان تصویروں میں قورہ باگل ہی کسی نئے چہرے کو لے کر کسی نئے فلم کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ جمیدی لال نے سب کچھ راج لانگو اچھی طرح سمجھایا، مگر تے چہرے نہیں آئیں گے تو نئے لوگوں کو پانس کیسے لے گا؟ ایک روز میں بھی تو دنیا چہرہ تھی؟ راج لانے پوچھا۔

لڑکیوں کی بات اور ہے: ”جمیدی لال نے مسکرا کر کہا: ”اُن کے لئے زیادہ گنجائش ہے۔“

سیٹھ باکھریا لے گیا۔ ”آج کل منہ چل رہا ہے۔ ارے جب سے جنگ بند ہوئی ہے منہ چل رہا ہے۔ تمہیں معلوم نہیں راج غلوں کا حال کتنا بُرا ہے۔ جو فلم بناتے ہیں۔ ڈبوں سے پھر سکتے ہیں ہر جاتی ہے۔ پاس آفس نے تو ہمارے پوش گم کر دیے۔ کچھ معلوم نہیں۔ عام لوگ کیا چاہتے

ہیں۔ یہ سالے چوٹی والے۔

کسی زمانے میں کم سے کم ٹٹ چار آنے کا ہر اکڑا تھا۔ اور عوام اسی میں جاک بٹھا کرتے تھے درود
کاری گر چھوٹے چھوٹے دوکان دار، کلرک، طالب علم ب چوٹی میں غم دیکھتے تھے مگر جیوں جیوں کرانی
بڑھتی گئی، غم دیکھنے کے بھی دھم بڑھتے گئے۔ ابھی چوٹی آٹھ دس آنے میں خریدایا جاتا تھا۔ لوگ اب اس
کلاس میں ٹٹنے کے لئے چار آنے کے پیلے دس آنے دیتے تھے۔ مگر ان سے مدد یہ چور نے ملے حضرات
اب تک انہیں "سالے چوٹی والے" کہہ کر پکاراتے تھے۔

"نہیں کوریں کو دیکھو۔ یہ سالے گھوڑوں کو کیا بولیگا۔ اس سال میرا ایک گھوڑا بھی نہیں بیٹا۔ بیٹھ بکلیا
راج کو جانے لگے۔

مگر میں تو عشرت —

بانکڑا نے راج کی بات کاٹ کے کہا "اھر شاک ابھیج کرلو۔ چارمیں سال سے شاک ابھیج کا دستا
کر رہا ہوں۔ ایسا بڑا زمانہ بھی نہیں دیکھا۔ وہ لوگو تو کل ہی ہار گیا۔ ایک دن میں؟
"مگر میں تو سوتی آپ سے شاک ابھیج نہیں عشرت کی بات کرنے لائی تھی۔ دونوں کا آپس میں کیا تعلق؟
"بہت گہرا تعلق ہے۔ تم نہیں جانتیں؟ بیٹھو چک کے لئے۔

شاک ابھیج ہارے سا ج کا پردیو سر ہے۔ وہ اپنی جگر پرتاؤم ہے۔ تو ب کہو اپنی جگر پرتاؤم ہے؟
مگر تم نہیں جانتیں؟

راج سٹ پٹا گئی۔ بولی "آپ عشرت کو سیر کا پاس دے رہے ہیں، کہ نہیں۔ صحت صحت بتائیے نا؟
"وہی تو بتا رہا ہوں؟ بانکڑا نے راج کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کے کہا "اور اس کی تبدیلی کی صورت
خود سے دیکھ کے دلا "بہت لگی ہو۔ تم بہت لگی ہو۔
راج نے ہانا ہاتھ بٹایا۔

باہر جانے سے روک کر کہا: "اگر زمانہ اچھا نہ تھا۔ تو ضرور میں عشرت کو چانس دیتا۔ مگر اب تو میں نے سوچ لیا ہے۔ کہ آپ کو رسک لینا ہی نہیں۔ سال میں چار بچہ بناؤ۔ چنانچہ نہ بناؤ۔ مگر بڑی اسٹارکاسٹ لیلی بچہ بناؤ۔ بچہ بننے سے پہلے۔ ڈوشری بیروں کو بچہ دو۔ نہ کھٹ کھٹ نہ پٹ پٹ :-
راج اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیشوراء! باہر دیا بیٹھ لے کہا: "سیڈم ابھی آتی ہوں گی :-
راج جواب دے بغیر سیڈم کی کہیں سے نکل گئی۔

جوشی راج محل میں خوشگ کر رہا تھا۔ وہ راج کا کو۔ ساؤنڈر بکاؤنگ کے کمرے میں لے گیا۔ اور انجینیر سے کہنے لگا کہ وہ چندہ بیس منٹ کے لئے باہر چلا جائے۔ اُسے راج لٹا سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہے۔ جوشی راج کا کو بہت دیر تک اونٹنی بیچ بھانا ہا۔
"تم اتنی حق ہو۔ بے وقوف ہو۔ پاگل گدی ہو :- جوشی نے راج سے کہا: "آخر تم کیوں عشرت کو سیرد کا چانس دلوانا چاہتی ہو :-

"کیوں کریں اُسے چاہتی ہوں :-

"بس یہی تمہاری حماقت ہے کہ تم یہ سمجھتی ہو کہ تم اسے چاہتی ہو۔ دراصل نہ تم اُسے چاہتی ہو نہ وہ تمہیں چاہتا ہے :-

وہ! ————— وہ میرے لئے جان بھی دے سکتا ہے :- راج لٹا نے اپنے پس کوندے سے بند کرتے ہوئے کہا۔

توجھو۔ پیاری۔ کبھی تم باری بھی پیاری نہیں۔ اس لئے کم از کم اس خطہ کے برتے کا حق تو مجھے دیدو :-
جوشی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ راج خدا سا مسکراتی اور غصے سے اس کی باتیں سنتے لگی۔ جوشی کہہ رہا تھا :- "تم عورت ہو۔ بہت سی باتیں سمجھتی ہو۔ عشرت کو میں کل ہیسیر کا چانس

مے ملتا ہوں۔ وہ ملتا ہوں مگر ایسا بھی نہیں کر سکتا۔ مرث تہا ہے بھلے کی خاطر میں جانتا ہوں۔ تم اسے کتنا چاہتی ہو۔ مگر جس دن تم نے اسے بیرو کا چانس دلایا۔ وہ تمہارے ہاتھوں سے ضل جلتے گا آخر دوسری بیرو تینوں کے بھی قوماشق میں۔ وہ بھی خوب مصرت ہیں۔ بلتے ہیں۔ بھلے ہیں۔ نوجوان ہیں وہ لڑکیاں کیوں انہیں سہما سہما کے رکھتی ہیں۔ کیوں انہیں کسی غم میں بیرو کا بلکہ بیرو سے کم درجہ کا بدل بھی نہیں دلاتیں؟

راج لا جوشی ہی کا منہ دیکھنے لگی۔ واقعی یہ بات جری عجیب تھی۔ اُسے رہنا اے اسس کا دوست سنتو شس کمار یا آیا۔

جوشی جی نے راج کا چہرہ دیکھا۔ اور اپنی آواز غبی کر کے بولا: ڈارنگ تمہارے بھلے کے لئے کہتا ہیں اگر عشرت کو اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہو تو اُسے کسی غم میں چانس مت لینے۔ وہ نہ ایک ہی تصویر میں کام کرنے کے بعد وہ تمہارے کام کا نہیں رہے گا۔ تمہارے ہاتھ سے جلتے گا۔ دیکھو بیوند کمار کرب سے پہلے آٹالے کام ہو دلا تھا۔ اب دونوں ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے۔

گل کر رانی بال نے کام دلایا تھا۔ آج گل محمد نے ارشاد سے شادی رچائی ہے۔ اور رانی بال۔ منہ تکی رہ گئی۔ اگر تم عشرت کو اپنے ہاتھ سے کھونا چاہتی ہو۔ تو کل اُسے میرے پاس بیجو۔ میں اُسے کام مے دوں گا۔ جوشی جی نے سچی بکائی راج سوچنے لگی۔ بات تو ٹھیک کہتا ہے۔

جوشی جی نے کہا: ڈارنگ تم نے ہیں چھوڑ دیا۔ مگر اب بھی تمہارے بھلے کے لئے سوچتے ہیں تم۔ حضرت کاس خنہ ہی نہیں۔ اُسے تاج پائی۔ اپنے کپڑے۔ اور میں ایسا کم کر دو کہ مج سے شام تک اسے غم کا دھیان تک بھی نہ آئے۔ غم میں آیا۔ اور تمہارے ہاتھ سے گیا۔ کیوں؟ راج نے سوچتے ہوئے کہا: بات تو تم جگہ کتے ہو۔

جوشی جی نے خوش ہو کر اُسے گلے سے لگایا۔ اُس نے کہا کہ میں ہاتھ ڈال کے اس کا ہید بھٹکا کر پیش کرنے لگے۔ چند لمحوں کے لئے تو راج نے اُن کے بس کو برداشت کیا۔ پھر اپنے آپ کو جھٹاتے ہوئے بولی "اجتاب یہ کتوں کی طرح کیا کچ کچ کھا رہی ہے۔ مجھ کو بچے ۰"

اُس نے اپنے آپ کو جوشی جی کی گرفت سے چڑایا۔ اور ریکارڈنگ روم سے باہر چل گئی۔ باہر انجینئر دیوار سے لگا سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ راج کو دیکھ کر سکرا۔ راج جلدی سے اپنی ساڑی سنبھالتی ہوئی تیزی سے گزر گئی۔

"سال! انجینئر نے سگریٹ سبیک کر اُسے اپنے پاؤں تلے دالتے ہوئے کہا۔

ایک سال گزر گیا۔ عشرت کو کہیں بیرو کا چانس نہیں ملا۔ یہ سال عام لوگوں کے لئے بڑی مصیبتوں کا سال تھا۔ بہت سے سٹوڈیو میں لاسٹ میوز اور دوسرے خفہ مند کرتاواٹے چھپو ماہ ہو گئے تھے۔ میسور میں ایک سٹوڈیو بند ہوئے والا تھا۔ بہت کم تصویریں بن رہی تھیں۔ ایکسٹرا لوگ نہ بے کار رہتے ہی تھے۔ اب اس کا آخر دوسرے درجے کے اداکاروں پر بھی پڑ رہا تھا۔ جو کہ بیکٹر بدل کیا کرتے تھے اُن میں سے بہت سے لوگوں کی گاڑیاں گر دی ہوئے کاہا دیوڑی منڈ کے سبھوں کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ یہی لوگ تھے جو انڈسٹری میں نہ یہ بھی نکلے تھے۔ جب اُن لوگوں نے یہ حالت دیکھی تو سراسے کی شرع سودگی بڑھا دی۔ پہلے تیس ہائیس فی صدی پر سود پہل جاتا تھا۔ اب پچھتر فی صدی پہلے لگا ایک لاکھ روپے پر پچھتر ہزار سود دو۔ تو تصویر بننا۔ اب ایسے میں کسی تصویر بننے کی اور کیا تیار ہوگی۔ ایک

اتحاد پر ڈیو سر بھی بے ایمانی پر تل گئے۔ تصویریں شروع ہوئی تھیں اور آدمی یا ایک ہوتا تھا بن کے رہ جاتی تھیں۔ پر ڈیو سر بیچ میں دوسرے کھا جاتے تھے۔ ایک لاکھ پر کچھتر ہزار سود کو کن دے گا؟

جوشی جی نے سینٹ کٹر چند سے ایک لاکھ دوسرے سود پر لے کر اپنی بیوی کے نام پر ایک مکان بنایا تھا۔ میں ہزار نظم میں بھی لکھا تھا۔ دور میں تیار ہو کے ڈبے میں پڑی تھیں۔ آگے کے لئے کام بند تھا۔ جوشی جی باخود یا سینٹر کی تصویر بھل کر رہے تھے۔ اب سینٹ کٹر چند آگے بڑھے۔ مزید رقم دے تو اس کی پچھریں سکتی تھی۔ دوز میں کہے جس طرح جوشی جی میں کر رہے تھے۔

مگر مرث اؤپر کے چامیں پکاس یا سودی مزے میں تھے یہی کی فلم اندیشی میں نکلی گئیں ہزار آدمی کام کرتے تھے۔ اُن ایک سو کو چھوڑ کے باقی سب کی حالت بدتر سے بدتر ہوتی جا رہی تھی راج کی بانہوں کے باہر اندھیرا تھا۔ عشرت نے اُن خوب صورت بانہوں کے اُسے کو نشیت جانا۔ میں عشرت نے اُسے کال اور صُست اور جود بنا دیا تھا۔ وہ پہلے سے دکان سونا اور بھاری ہو گیا تھا۔ اُس کا پیٹ تھوڑا سا آگے کھل آیا تھا۔ اس کا چہرہ سخت ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں وہ خسر ملاہن نہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک طرح کی ملاہنیت چھا گئی تھی۔ جیسے پلے ہوئے شہر کے چہرے پر ہوتی ہے۔ اب اُسے گندہ خاق پسند آتا تھا۔ اب اُسے بھنگ یا دھکی یا چرس سے نشہ نہ آتا تھا۔ وہ راج کے بھائی ابھینو کے ساتھ اُن تمام مراحل سے گزر کر ارفیا کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ جب تک وہ لوفیا کا ابھینشن نہ دے لے اُسے نشہ نہیں ہوتا تھا۔

ابھینو اس میدان کا پُرا نامکلاڑی تھا۔ وہ کہنے لگا "بھائی جے تو اب اس لوفیا سے بھی نشہ کم ہونے لگا ہے۔ میں تو اب سنسکیا چائنا شروع کر دیں گا۔"

"سنسکیا؟ عشرت حیرت سے بولا "سنسکیا سے تو آدمی مر جاتا ہے"

"ایک دہائی سے شروع کر دیں گا۔ ابھینو بولا "اب پھر خوراک بڑھانے بڑھانے بڑھانے جاؤ گا۔"

سنگی سب نشوں کا بادشاہ ہے۔ اور پچ پوچھ تو نشتے کی سراج وہ مقام ہے جہاں آدمی سانپوں
 ڈسوا شروع کرتا ہے۔

”سانپوں سے ۱۰ عشرت کی انھیں حیرت سے چکی کی چکی رو گئیں جہنم مذاق کرتے ہو۔“
 ”مذاق نہیں ہے۔ خدا کم زہریلے سانپوں سے میں نے کئی سلاموں اور فیروں کو ڈسوانے دیکھا
 ہے۔ انہیں صرت سانپ کے زہر سے نشہ ہوتا ہے۔ بس اُس نشے کا جواب نہیں ہے۔ نشوں میں
 یہ عرفان کی آخری منزل ہے۔“ ”سانپ کا زہر ۱۰ عشرت کا پُٹھا نہیں اپنے لئے تو بس ملینا
 کافی ہے۔ چوسات گھنٹے ایسا جامہ ہوا نشہ ہوتا ہے کہ چٹو کیا چیز ہے۔“
 ”آپ کو تو اب اس سے بھی نشہ نہیں ہوتا۔“ ”ابھینو شیخی بھجار کے بولا۔
 اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ عشرت دھڑا دوڑا باہر گیا۔
 شمشاد ٹیلی فون کر رہی تھی۔

عشرت نے کہا ”راج تو کہیں باہر گئی ہے۔“

شمشاد بولی ”کل مید ہے۔ ہمارے ہاں آپ کی دعوت ہے۔ راج کی اور آپ کی۔ آئیں گے ہی؟“
 عشرت نے کہا ”منور آئیں گے۔ آپ بلائیں اور ہم نہ آئیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟“
 شمشاد نہیں بولی ”راج سے کہہ دیجئے گا۔ اُسے میں دوبارہ ٹیلی فون کروں گی۔ اور ہاں دیجئے۔“
 ٹیلی فون پر اپنی آواز سنی کرتے ہوئے بولی ”ابھینو شیخی کو نہ لایئے گا۔ میں نے بس بہت کم لوگوں کو
 بلایا ہے۔“

”جی بہت اچھا۔“ عشرت نے رسبور رکھ دیا۔

شمشاد خود تو اس قدر چاؤک نہ تھی۔ لیکن اس کی دادی آماں بہت ہوشیار تھیں۔ وہ راج کا ایسی نٹ کھٹ لڑکی کی حرکتوں کو پسند نہ کرتی تھی۔ وہ مفت لال پارک کے چمے سوز سوزے میں ایک خوب صورت غیٹ میں رہتی تھی۔ اس کے ہاں ہمیشہ عید کی دعوت ہوتی تھی، مگر کبھی ایسا بھید نہ ہو سکتا تھا۔ جو راج کی دعوت میں ہوتا تھا۔ اس نے اس دعوت میں صرف دس جوڑے بلائے تھے۔ کوئی آدمی کیلا نہیں آیا تھا۔ اور کوئی آدمی اپنی بیوی کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ شمشاد کی دادی اس کا خاص خیال رکھتی تھی۔ کہ کسی ایسے آدمی کو نہ بلایا جائے جو غلطی سے اس موقع پر اپنی بیوی کو لے کے چلا جائے۔ راج کے ہاں یہ بھی ہو جاتا تھا۔ جس سے دعوت کی گراگزی میں خاوند سے ایسی حرکتیں ہو جاتی تھیں جس کا خمیازہ اُسے بعد میں بیوی کے سامنے بھگتنا پڑتا تھا۔ ایسے موقعوں سے بے چاری بیویوں کو ڈور ہی رکھنا چاہیے۔

دادی آماں بہت کچھ دانتھیں۔ اُنہوں نے ریاستوں کا زمانہ دیکھا تھا۔ وہ محل کے آداب جانتی تھیں۔ آج کل کی لڑکیاں بسب گڈ ڈکرتی ہیں۔

اس دعوت میں فلم کے لوگ زیادہ تھے۔ مگر تین جوہری بھی تھے۔ ان کے ساتھی ہی کلاس کی بیرونیس بھی تھیں۔ راج لکے نے یہ نہیں لوگوں سے اس طرح ملنا واقعی ایک اچھا بار۔ لیکن وہ ان لڑکیوں سے واقف تھیں۔ مگر راج سے پہلی بار یوں ملنا ہوا کیوں کہ بظاہر یہ لڑکیاں اپنے آپ کو بہت لے دے رہتی تھیں۔ ان کی آمدنی یعنی غصوں سے آمدنی بھی زیادہ نہ تھی۔ اس نے راج کچھ نہیں سکتی تھی۔ کہ ان لڑکیوں کا بیش قیمت لباس قیمتی زیورات اور ہر سال نئی گاڑی کہاں سے آتی

ہے؟ پیاری راج کنتی جلدی تم اپنے اسی کو بھول گئی ہو۔ تلخ باتیں کون یاد رکھتا ہے۔ ایک دن وہ لوکیں بھی بام شہرت پہنچ کر بھول جائیں گی۔ آج یہ لوگ جدوجہد کر رہی ہیں۔ اور وہی ہتھیار استعمال کر رہی ہیں۔ جو کبھی تم نے کئے تھے۔ کتنا صدیوں پُرانا راستہ یہ ہے۔ کتنا آسان بھی ہے۔ ایک خوب صورت منجی انماؤں والی عورت کے لئے؛

دعوت میں کسی طرح کا بھگسا بھی نہ ہوا۔ شراب کا اور بھی نہ پلا۔ جوہری لوگ اور دوسرے لوگ بھی ششاد کے لئے تھخنے لائے تھے۔ ششاد کا دوست گلاب داس خود ایک جوہری کا لڑکا تھا۔ ظاہر ہے، کہ اس کے تھخنے سب سے عمدہ تھے۔ مگر دوسرے جوہریوں کے تھخنے بھی۔ کوئی کم شادار نہ تھے کوئی چھپ کرنے کے لئے۔ کوئی دفاع قائم کرنے کے لئے۔ کوئی مستقبل کی طرف نگاہ رکھتے ہوئے ششاد کے لئے عمدہ سے عمدہ تھخنے لائے تھے۔ اسی بیروں کے زیورات۔ ان لوگوں کا تاج اور گرہن میں کانٹ پلتا تھا لندن، شہر کا گورنر پارک میں ان لوگوں کے دفتر تھے۔ یہ لوگ سبئی کے اسی ملک تھے۔ ان کے ہاتھوں میں گھڑیوں پر کوٹ اور قیس کے جنوں پر اتنے میرے گھے ہوئے تھے کہ ان کی قیمت ساموت میں خرید کر ہونے والی تمام میوینوں کے مجموعی بنک بلیٹس سے زیادہ ہوگی۔ وہ صوفے پر اس طرح بٹھے تھے۔ جیسے وہ اس صوفے کے مالک ہوں۔ جب وہ پائے پیتے تھے۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی پراسان کر رہے ہیں۔ جب وہ لوگ کسی کی طرف دیکھتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُس کے بھی مالک ہیں۔ جس کی طرف وہ دیکھ رہے ہیں۔ ان کے جسم کی ہر ادا کتنی تھی بہم ملک ہیں۔ ہم مالک ہیں؛

ان لوگوں کی بہت اچھی بیویاں تھیں۔ جن کے ساتھ بہت پیاری پاکیزہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے بچے تھے۔ خوب صورت پیارے بچے جو آخر غریب اسکولوں میں قلم پاتے تھے۔ یہ لوگ اُن سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان لوگوں کو اُن کے گھر میں اپنی پیدی جھولا جھولتی ہوئی بیویوں کے ساتھ دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ لوگ کبھی ایسی دعوتوں میں شریک ہو سکتے ہیں یہ لوگ اپنے اچھے پر

چند لگے ہوئے اس قدر پوتر باطل گنگا جل کی طرح شفاف اور شمرے ہوئے نظر آتے تھے۔ یہ لوگ جو بیسویں صدی کے خدا تھے۔ مقدس تھے۔ اور ہر سوساٹی میں پرچہ جاتے تھے۔ یہ لوگ یہاں کیوں بٹے تھے جس کے پاس سب کچھ موجود تھا۔ پھر یہ زندگی سے کیا چاہتے تھے۔

سب کچھ کے بعد کچھ اور اس کے بعد کچھ اور ————— دیوتاؤں کا تہیاری ہوس کبھی نہیں مٹسکی؟ کیا تم کسی کو انسان نہیں بننے دو گئے۔

ہندو دیوتا میں کتنے ہی ایسے دیوتا تھے جن کی سینکڑوں بیویاں تھیں۔ تو پھر آج کل کے لوگ کیوں شاپنا پرائیویٹ مرم رکھیں۔ گھر سے دود۔ گھر سے باہر۔ ایک مسات ستر افلیٹ۔ ایک بھی جھانپا باندی۔ ان کے حکم کے منتظر کا بادیوی روڈ۔ اور حمام اسٹریٹ کے خداؤں کے ہاں یہ فیشن میں داخل تھا۔ ایک بیوی اور ایک داشتہ۔ بہت سے بندھے سینٹو جرسی فٹم کے جنسی تعلقات درکار کر سکتے تھے۔ وہ بھی ایک داشتہ چاہتے تھے۔
 —————
 فیشن!

ششاد کی دادی بہت خوش تھی۔ اب کی بچہلی عید سے زیادہ تھنے آئے تھے۔ زیور کی پائیں خزا کے ہوں گے۔ اکیلے سینٹو جسونت لال پارک بے پندہ ہزارے زیور دئے تھے۔ حالانکہ پچھلے سال اس نے صرت سات ہزار کا ایک بار دیا تھا۔ جسونت لال پارک کی طرف ششاد کی دادی نے غور سے دیکھا مگر سینٹو جسونت لال پارک کو بڑے آرام سے چائے پی رہے تھے جیسے کچھ ہوا نہیں۔ مجھے اس سینٹو کو کسی دن ٹیل فون کرنا پڑے گا۔ دادی انہں نے دل میں سوچا۔ میری بے بی بڑی بڑے قوت ہے اسے کھانا پکانا نہیں ہیں دیکھو اس وقت بھی کیا مزے سے گلاب کاس سے باتیں کر رہی ہے۔ اسے گلاب داس تو مالی ایک جوہری کا لاکا ہے۔ مگر جسونت لال پارک تو کرسٹل ایسی ہی ایشن کے سکرٹری ہیں۔ بڑی احمق ہے۔ ایک اندر بھی توڑ کے نہیں دیکھتی سینٹو پارک کی طرف۔ بس گلاب کو دیکھ کر ہی ٹسکرائے جاتی ہے۔ اندر ہی!

دعوتِ خیر و خوبی ختم ہوئی۔ اب لوگ چلے گئے۔ ششاد نے راج اور عشرت کو روک دیا۔ وہی ماں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ششاد نے دیکھی کی بوتل کھولی۔

اس جگہ ہوئے غلیٹ میں بڑا سکون ہے۔ رنگ مدیم ہیں۔ پردے نظر تو انا ہیں۔ تصویریں آرٹ کے بہترین نمونے ہیں۔ کتابوں میں عمدہ مصنفوں کی کتابیں بھی ہوئی ہیں۔ گلاب داس خوش ذوق آدمی معلوم ہوتا ہے۔ عشرت نے سوچا۔ راج تلکے گھر میں۔ کتنی انا رکھی ہے۔ پڑھیں تو شروع تصویریں ہیں تو ٹنگی۔ رنگ میں تو چھینے ہوئے۔ اس کم بہت راج کو کبھی عقل نہیں آئے گی۔

رات ۱۔

یہ رات کتنی صاف ستھری اور سکنت ہے۔ گویا ابھی ابھی لائٹری سے دُھل کے آئی ہے۔ اس کے سیاہ بادے سے کسی ٹکی ٹکی خوشبو کی لپٹیں آرہی ہیں۔ ششاد نے صرف ایک ٹکی سی روشنی رہنے کی پھر اس پر بھی سلک کا ایک عدال ڈال دیا۔ اب روشنی کتنی آہستہ سے چھپتی ہوئی آرہی تھی عشرت کو گوانیچہ آنے لگی۔

ششاد نے ریڈیو گرام پر مغربی ناچ کی ایک سسٹ ریڈارگٹ چھیڑ دی۔ ششاد اور عشرت راج اور گلاب ہوئے ہوئے فاض کرنے لگے۔ کتنی خاموشی ہے۔ ششاد کی آنکھوں میں کتنی بلاغت ہے۔ بڑی تپانچے کو نہیں ایک دوسرے کے جسم میں عجیل جانے کو کہہ رہی ہے۔

پیرگیت ختم ہو گیا۔ طلسم ٹوٹ گیا۔

ششاد اور راج کو اپنی خواب گاہ میں لے گئی۔ بہر کرے میں صرف عشرت اور گلاب داس رہ گئے۔ دونوں ہوئے ہوئے دیکھی پتے رہے۔ گلاب داس کے چہرے پر ایک عجیب طنز یہ مسکراہٹ تھی۔ عشرت کی آنکھیں شے سے سُرخ تھیں۔ دونوں ہوئے ہوئے خاموشی سے دیکھی پتے رہے ایسے لوگوں میں کہ کہنا بے کلام ہوتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ششاد اپنی خواب گاہ سے باہر آئی۔ مگر راج اس کے ساتھ باہر نہیں آئی ششاد اُن دونوں کے سامنے آکے بیٹھ گئی۔ اُس کا مھلاں خالی تھا۔ عشرت نے اس کے لئے مھلاں بنایا۔ ششاد نے ایک گھونٹ پی کے کہا ” اندر راج آپ کو بلاتی ہے۔ عشرت مھلاں ہاتھ میں تھامے اُٹھا۔ اور ششاد کی خراب گاہ میں چلا گیا۔ اس نے سوچا، اب میرے فرائض سرانجام دینے کا وقت آگیا ہے فرض فرض ہے۔

راج ایک میڈ پریم دراز حالت میں تھی اپنی جامنی رنگ کی ساڑی کے مٹلا پلو سے کیل رہی تھی عشرت اس کے قریب آکے بیٹھ گیا۔ راج نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا اُس کے ہاتھ میں یا قوت کی ایک خوبصورت انگوٹھی چمک رہی تھی۔ جو عشرت نے اس سے پہلے نہ دیکھی تھی۔ یہ انگوٹھی بے عشرت نے پوچھا۔

” ششاد نے مجھے دی ہے۔ دی نہیں ہے۔ مجھ سے بدل لی ہے۔ میں نے اُس کی انگوٹھی۔ اور اس نے میری انگوٹھی پہن لی ہے۔ آج سے ہم دونوں بہنیں بن گئی ہیں پہلے ہم دوست تھیں، مگر آج سے بہنیں ہیں؟“

منہ دکھ ہوا

” کچھ عرصے تک خاموشی رہی۔ راج پھر اپنی ساڑی کے پلو سے کہنے لگی۔ آخریونی ” ششاد تمہیں جاہتی ہے۔“

” کیا مطلب؟“ عشرت کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

” بس کج کی آج تم اس کے پاس رہ جاؤ؟“

” تمہارا مطلب ہے؟“ عشرت نے بڑی حیرت سے پوچھا ” جس طرح تم نے انگوٹھیاں بدل لی ہیں اُسی طرح۔۔۔۔“

” ہاں۔“ راج نے سکڑا کر کہا ” میں مگلاب داس کے ساتھ جاؤں گی، تم یہاں رہو گے؟“

”عزیز کن ہوں۔ کیا ہوں۔ تم ————— کیسے بے غصے کے ارے عشرت کے منہ سے
 کچھ اور نہ نکلا۔“

زارنگ ایک رات میں کیا ہوتا ہے ؟ راج نے اپنے ہونے کیلئے ہونے کہا۔

یہی ہے کہ عشرت نے راج سے شادی نہ کی تھی۔ پھر بھی وہ اسی طرح رہتا تھا۔ جیسا کہ وہ
 اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ اسی طرح اس کا وفادار تھا۔ دل سے اور روح سے۔ اور حالات سے
 بھی۔ کسی طرح سے بھی اس نے کسی دوسرے طریقے سے نہ سوچا تھا۔ وہ چاہتا تو اور مراد مرچا سکتا
 تھا۔ جیسے کہ اس کے ماحول میں دوسرے لوگ کرتے تھے۔ اور اُسے ہرگز بُرا نہیں سمجھتے تھے۔ مگر اس
 قدر بڑے کرپ کرپ کرپ کا ایک حصہ بن کر بھی وہ اس حد تک گیا تھا۔ وہ مکرور تھا، بُرا تھا، بولبی تھا
 یہ بھی سچ ہے کہ وہ راج سے دلی محبت نہ کرتا تھا۔ وہ خود ہیروئن کرپ سے نجات پانا چاہتا تھا، مگر
 کچھ عرصے سے اس نے ہیروئن کے انخاب بھی دیکھنا بند کر دیا تھا۔ کچھ عرصے سے وہ اپنی قسمت پر راقع
 تھا۔ راج پر راقع، شراب پر راقع، اپنے لباس پر راقع اور مارنیے کے انجکشن پر راقع۔

پھر بھی وہ بدکار نہ تھا۔ اس وقت جب راج نے اس کے سامنے یہ تجویز کی تو کہیں کسی کو نے میں کبھی
 ہوئی ہرافت کے دو آنسو اس کی آنکھوں میں کھسک آئے۔

راج نے اس کے گلے میں بانیں ڈال کے کہا: ”دیکھو میں خدا کی بات کے لئے اپنی بہن کو کیسے بھلا
 کر سکتی ہوں۔“

عشرت اس قدر احمق تو نہ تھا کہ کچھ نہ بوسکتا۔ ایک چہرے پر لہے لہے نے اس کے
 ارد گرد کے غول کو پیچیں سے شق کر دیا تھا۔ ایک لہے کے لئے حقیقت اس کے سامنے بالکل نئی ایک
 لہے میں گویا راج نے اپنے جسم سے پاشش شدہ ناخنوں سے اس کی روح کے باوے کو
 تھماتا کر دیا تھا۔ اور اُسے بالکل نکمہ کر دیا تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو اس طرح دیکھنے لگا کہ اسے اپنے



درد نے غرت ہو گئی۔ وہ کس لئے کرا تھا۔ کس اربابوں اور ندوں کو لے کر کبھی میں مارا ہوا تھا۔ کس طرح سے درد جہد کرنا چاہتا تھا۔ درد پھر اس نے کس طرح جہد کو ختم کرنے کے لئے ایک چوڑا اور مہمہ ماسٹر ڈھونڈ لیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اُسے محسوس ہوا کہ جہد جہد کا کوئی آرام دہ چوڑا راستہ نہیں ہے۔ جہد جہد سخت جانکاہ طریقہ اور جاں گداز ہوتی ہے۔ اس میں غریبی بھی ٹھوکرنا پڑتا ہے۔ اور رات کبھی کبھی اتنا سہا ہوتا ہے کہ نا اچھی تو نا اچھی آنکھیں اُسے دیکھتے ہوئے تھک جاتی ہیں۔

مگر صرف ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا۔ دوسرے لمحے میں اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی۔ ایک رات ہی کی تو بات ہے۔ پھر یہ رات کتنی حسین ہے۔ کتنی نرم اور گداز۔ منہ نہیں سرگوشی کرتی یہی سوچاؤ۔ سوچاؤ۔ زندگی نام ہے سوچنے کا۔ آنکھیں بند کر لینے کا۔ کئی بلی غصہ کی آہیں سنتی ہے کہ بولن باہنوں کی گولائی میں اپنے آپ کو محصور کر لینے کا۔ ایک نئے جسم کی پکار سننے کا۔۔۔ آج تو سوچاؤ۔ کل دیکھا جائے گا۔ یہ رات گزر جانے دو۔ کل سے وہ پھر جہد جہد شروع کرے گا۔ وہ راج کو اور ششاد کو اور اسی تم کے بے حد اپنے اور بے حد نیچے۔ احوال کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دے گا۔ پھر سے زندگی کا ایک نیا باب شروع کرے گا۔

مگر آج تو سوچاؤ۔ کل دیکھا جائے گا۔ ایک رات سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک دوسری بات تو ہے بھائی عشرت کو اور دنیا کے الجھن کی سخت ضرورت محسوس ہوئی۔

جب آدمی جنت نہیں کرتا ہے تو وہ اپنی زندگی میں ایمان چاہتا ہے۔ راج کا خیال تھا۔ وہ عشرت سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ لیکن جب ششاد نے اس کے سامنے یہ سوال رکھ دیا تو راج کو فیصلہ کرنے میں ایک منٹ نہیں لگا۔ کسی طرح کی اُداسی، گھٹن وہ پریشان کن استہباب جو اسے اس صوف پر محسوس کرنا چاہتے تھے۔ اس نے کچھ کبھی محسوس نہ کیا۔ اس بات پر اُسے بڑی حیرت ہوئی۔ دوسرے لمحے میں اس کے سامنے ہم میں ایک سنسنی سی زندگی تھی۔ اور اس نے باطل نئی نگاہوں سے

گلاب داس کی طرف دیکھا اور مضی جذبے کی چمکانی لہریں اس کے دگ وپے میں لڑکتی چلی گئیں۔ عشرت ٹھیک تھا۔ بہت عمدہ اور پیارا تھا۔ مگر یہ چیز بالکل نئی تھی۔ اس میں کتنا تعمر ہے! بوائے یہ تعمر! موٹر گلاب داس اور راج کو لئے ہوئے جوہی کی پڑیج سڑک پر دوڑنے لگی۔

مگر جب ایک دن گزر گیا۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ اور عشرت واپس نہ آیا تو راج کو تشویش سی محسوس ہوئی۔ اس نے شمشاد کو ٹیلی فون کیا۔

”کیا بات ہے۔ عشرت کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”ہاں بالکل ٹھیک ہے۔“

”تو پھر وہ آیا کیوں نہیں؟“

”یوں ہی۔ شمشاد نہی؟“

”یوں ہی کیا؟ راج نے فدا خفا ہو کے پوچھا۔

”میں نے سوچا۔ کیوں؟ مدھنتے بھر کے لئے یہاں ٹھہر جائے۔ اس میں ہرج ہی کیا ہے؟“

”بھنتے بھر کے لئے؟“ راج ٹیلی فون پر چلی۔

”چلاؤ نہیں بہن؟“ شمشاد نے ٹیلی فون پر راج کو مشورہ دیا۔ عشرت کا کبھی کبھی خیال ہے۔

”بہن! خیال ہے؟“ راج نے غصے میں دوبارہ ”سُنو شمشاد تم وہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آتی ہوں؟“

”مگر؟“ شمشاد ہوئی۔

مگر راج نے یہی فون بند کر دیا تھا۔ اور اب وہ اپنے کمرے میں زبردستی بیٹھ رہی تھی۔

”ابھینو ہشکر، چچا دودھور۔ تم سب کہاں مر گئے؟“

تھوڑی دیر میں غلامان کے آٹھ دس افراد، اور پانچ چھ نوکر اور نوکرانیاں راج کے گرد اٹنے لگیں۔

راج ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے غصے سے باؤل ہو رہی ہے۔

اس نے پاؤں فرش پر ندوسے باز مار کر کہا۔

”جلدی سے گاڑی بنائو۔ سور کے بچہ؟“

جب گاڑی ماہم کے کازوسے پر سے گزر گئی۔ تو راج نے پھر پاؤں پٹخ کر اپنے غائبہ شکر سے کہا۔

”گاڑی تیز کیوں نہیں چلاتے؟“

”چالان ہو جائے گا۔“

”ہو جائے دو۔“

”کوئی آدمی نیچے آجائے گا۔“

”آجائے دو۔ مگر گاڑی تیز چلاؤ۔“

یہ جودن دواوی اماں کے لئے بڑی مصیبت کے دن تھے۔ اپنی پوتی کو وہ کیے بھائے
 لکھاپ داس کی ہتھکڑی سے۔ اور اس نئے تختہ نشین۔ ہلائی۔ روز عشرت کو گھر میں رکھنے کی بات باہل ہی
 - ہر مہربانی ہے بھر لی ہوئے بلدا رہنما کو بھایا۔ مگر شاد تو دایسے خوش تھی۔ جیسے اُسے کوئی نیا
 کھلونا مل گیا ہو۔ وہ اپنے آپ سے بہت خوش تھی۔ اس نے راج کا ہیرہ مار لیا تھا جیسے شعلہ نہیں
 کوئی دھیریا سلطان کو مارتا ہے۔ وہ جیتی ہوئی بازی کو اپنی جوتی بازی میں کیوں کر تبدیل کر سکتی تھی
 اور پھر عشرت نے رد رد کر اُسے بتایا تھا کہ کس طرح وہ اُسے چاہتا ہے۔ شروع ہی سے چاہتا تھا۔
 مگر حالات نے اُسے ایسا مجبور کر دیا تھا کہ راج کے ہاں رہتے ہوئے وہ محبت کا غلط منہ پر نہیں لے سکتا

تھا۔ بس طرح عشرت نے اس کے قدم چھولنے تھے۔ جیسے وہ زہرہ کی دیوی ہو۔ اور گلاب داس کیسے اکٹو کے اس سے بات کرتا تھا۔ وہ اس کے روپے اور جواہرات کی بھونکی نہیں تھی۔ وہ سینے میں خود ستر ہی ہزار کمائی تھی۔

محبوب داس کیسے اس پر محم چلاتا تھا۔ جیسے ششاد ہندوستان کی اول درجے کی بیروٹی نہ ہو۔ اس کی متوجہ باگیر ہو۔ نکلا۔ اب وہ اسے مزہ دکھا دے گی۔

لیکن راج کے آنے سے وہ ڈر بھی رہی تھی۔ بڑی تیز ہے۔ جانے کیا کیا کہے گی۔ مجھ۔ تو بات بھی نہیں کی جائے گی۔ اور وہ تو ایک مشط میں بے ہزار مسلوں میں مسادے گی۔

اور راج کی حالت جب وہ ششاد کے گھر پہنچی یہ تھی کہ اگر اس وقت ششاد کی خوش قسمتی سے اس کی دواوی اماں ڈھانگہ روم میں بیٹھی نہ ہوتی۔ تو وہ ششاد سے بات کرنے کے لئے زان کے بجائے چپ سے کام لیتی۔ اس قدر اُسے غصہ تھا۔ اس کا لڑکا اور کوئی دوسرا بٹائے لڑکے اس ملکیت اب پوری طرح سے باگ چلی تھی۔ وہ عشرت کو بازو سے پھڑکرا پنے گھر لے جائے گی۔ یہ بھی نہیں گی میری چیز کو کون مجھ سے چھین سکتا ہے۔ داد! ایک دن کے لئے اُدھار دیا۔ اور آپ ملک ہی بن نہیں۔ مسلم ہوتا ہے۔ اخلاق تو دنیا میں رہ ہی نہیں گیا ہے۔

راج اسی طرح جتنی بھنی کو مٹی کو مٹی ہوئی جب ڈھانگہ روم میں آئی تو دواوی اماں کے دیکھتے ہی اس کی بلایں بے لگیں۔ اور اُسے گلے سے لگنے کے لئے گئیں۔ دواوی اماں بڑی ہی ہلکے نمبر کی کشتی اور زمانہ ساز تھیں۔ زمانے نے انہیں اور انہوں نے زمانے کو بیت اپنی طرح سے دیکھا تھا۔ وہ تو توئی کو ایک نظر سے دیکھ کر بتا دیتیں کہ اس وقت اس کے دل میں کیا ہے۔ ششاد راج کے آنے سے گہرائی ہوئی تھی۔ راج غصے سے اپنے نبش و محاس میں نہ تھی۔ دواوی اماں کے دماغ میں یہ بات باطل صاف اٹھ تھی۔ جنگ کا نقشہ انہوں نے اپنے سامنے ذہن میں پھیلایا تھا۔ اور ایسا

وہ اس کے مطابق کام کرنے لگیں۔ کچھ ہی روز بعد۔ عشرت کو واپس راج کے ماں باا ہی پڑے گا
 کہاں عشرت؟ کہاں گلاب داس۔ ایسا امیر سرسٹے دار شیوا کہاں لے گا۔ ششاد کی عقل پر تو پونے
 بڑ گئے تھے۔ گروادی اماں نے دنیا ابھی طرح دیکھ رکھی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ اس دنیا میں کوئی محبت
 نہیں کرتا ہے۔ لوگ محبت سے کہتے ہیں۔ جیسے باکی سے فٹیل سے کیلا جاتا ہے۔ اس کیل کے
 بھی اصول ہوتے ہیں۔ اور اب ششاد این اصولوں سے انحراف کر رہی تھی۔ ششاد کو ہوش میں لانا
 پڑے گا۔ سچی محبت میں لاکھوں کی کمائی کیسے ہو سکتی ہے۔ ہر سال نئی گاڑی کہاں سے آ سکتی ہے عمو
 سے عمدہ خلیٹ کیسے خریدے جاسکتے ہیں۔ آدمی کو محبت نہیں کرنی چاہئے۔ محبت سے کیلا پانا ہے
 محبت کا کیل بہت عمدہ ہے۔ دل کا روگ بہت بُرا ہے۔ اور ششاد بڑی جذباتی لڑکی تھی۔ عشرت کے
 آنسوؤں نے اُسے رام کر لیا تھا۔ دادی اماں جانتی تھیں۔ مگر ششاد نہیں جانتی تھی۔ کہ عشرت کا کیل
 کیا ہے۔ وہ اپنا کیل کیل رہا تھا۔ دادی اماں ایک ہوشیار کھلاڑی کی طرح اُسے نظروں میں نہ رکھتی
 تھیں وہ اگر عشرت کی حالت میں ہوتیں تو غالباً یہی کرتیں۔ ان کے ذہن میں عشرت کے لئے تفریق
 کے کوئی پہلو نہ تھی۔ گرامیوں نے ان دونوں میں عشرت پر باہل کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ انہوں
 نے اس سے بات بھی نہیں کی۔ اس کا آداب بھی قبول نہیں کیا۔ بہت بُری بات تھی۔ لڑکا مسین
 تھا۔ خوب بُرا تھا۔ مسلمان تھا۔ اچھے گھر کے لڑکا تھا۔ مگر امیر متا تو دادی اماں کو کوئی اعتراض بھی
 نہ ہوتا۔ مگر۔۔۔۔۔!

دادی اماں نے پہلے تو راج کی بلائیں میں۔ پھر رد نے لگیں۔ پھر آنسو پونچھ کر کہنے
 لگیں: یہ ششاد کی طرف اشارہ کر کے، یہ تو سچی ہے۔ اسے کیا معلوم کہ تم دونوں۔ تم دونوں
 سیلیوں کی چھ سال کی دوستی اور بہنا پاکیا ایک مرد نے کے تھے قربان کیا جاسکتا ہے؟
 اسی بات پر مجھے بھی حیرت ہوئی اماں۔ راج دادی اماں کو اپنا ہم خیال ہانکے بہت خوش ہوئی

اس کا بوجھ بھی بدل گیا۔ ہماری دوستی پر تو ساری غم انڈسٹری رشک کرتی تھی۔ مکی بہنوں سے بھی زیادہ ہم میں محبت تھی۔ سدا کا ساتھ، اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا سب اکٹھا، اور اب یہ بچا ایک... راج نے شخصیات آمیز چھا ہوں سے ششاد کی طرف دیکھا۔

ششاد کی محبہ ہوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ بولی "میں کب کہتی ہوں تمہاری یہ سبلی نہیں ہوں؟" عشرت کہاں ہے؟ راج نے ششاد سے ٹوٹ کے پوچھا۔

"اندر بیڈروم میں ہے؟" ششاد نے ذرا گہرا لے کہا۔

"اے رہنے دو۔" دادی آں نے بڑے میٹھے لہجے میں کہا "بہدی آپس کی گفتگو میں اُسے رازدار بنانا مجھے ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ جو فیصلہ کریں گے وہ ہم لوگ آپس میں بات چیت کر کے طے کریں گے۔ اُسے چھ میں بولنے کا کیا حق ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔" راج بولی۔

"تو تو اس کے لئے مجھے چھوڑ دے گی؟" راج نے ششاد سے پوچھا۔

ششاد نے کہا "یہ میں نے کب کہا ہے۔ میں نے ٹیلی فون پر یہی کہا تھا کہ ایک وین اور ایک مہینے میں کیا فرق ہے۔ یوں پلک جھپکتے میں گزر جاتے گا۔"

"مگر مجھے منظور نہیں ہے۔" راج ذرا سختی سے بولی۔

"اور مجھے بھی ڈاؤی ماں نے کہا۔"

ششاد نے دھکی جو کہ کہا "مگر میں زبان دے چکی ہوں؟"

ششاد نے بیڈروم کی طرف اشارہ کیا۔

"اُس سو کو میرے سامنے لاؤ۔" راج غصے سے صوفے پر سے اُٹھتے ہوئے بولی۔ مگر دادی آں نے ہاتھ پیر کر اُسے واپس بلا لیا۔

”اُس پر غصہ نہ کرو۔ یہ مردوسے ہوتے ہی ایسے ہیں۔ انہیں بت نہی مٹی رہے۔ یہ بہت خوش رہتے ہیں۔ عشرت کی بات جانے دو راج۔ یہ ہمارے آپس کی بات ہے۔“
 ششاد نے سر ہلایا۔ ”ہاں۔ یہ ہمارے آپس کی بات ہے۔“
 ”تو عشرت کو میرے حوالے کر دو۔ ہیں۔“

”مگر میں وعدہ کر چکی ہوں۔ اور پھر مجھے اس سے محبت بھی ہو گئی ہے۔“ ششاد بولی۔
 ”مگر تم تو جی اسٹوارٹ! —————“ راج نے فقرہ ناتمام رہنے دیا۔
 ”ہاں۔ مگر ————— یہ بھی چپے کا؟“ ششاد آنکھوں میں آنسو لاکے بولی۔

”محبت وغیرہ کچھ نہیں ہوتی اسے۔“ دادی اماں نے راج سے کہا۔ ”میں کسی وقت میری طرح کی ضد آجاتی ہے اسے۔ میں تو اسے خوب جانتی ہوں۔ اچھی طرح سے۔۔۔۔۔ لے اب دونوں سیلیاں گلے مل جاؤ۔ مل جاؤ۔ مل جاؤ۔“

دادی اماں نے راج اور ششاد دونوں کو پکڑ کر ایک دوسرے کے گلے سے لگا دیا۔

گلے لگتے ہی دونوں سیلیاں خوب پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ ایک دوسرے کے آنسو پونچھنے لگیں۔ ایک دوسرے سے پیار کرنے لگیں۔ روتے روتے ششاد نے کہا ”جائیاں میں نے تیرے ساتھ بڑا دھوکہ کیا، بائے اپنی سیلی کے ساتھ دھوکہ کیا؟“

راج سکتے ہوئے بولی ”تو تو میری جان ہے شتو۔ میں تو عشرت کے بغیر رہ سکتی ہوں۔ مگر تیرے بغیر نہیں۔“
 ششاد نے ایک سگریٹ سٹکا کے راج کے منہ میں رکھا۔ بولی ”اے جاہ لے جا۔ تو اب عشرت کو لے جا۔“

راج ششاد کی بلائیں لے کے بولی ”نہیں جائیاں۔ تجھے اگر اچھا لگتا ہے۔ تو تو رکھ لے۔ میں کیا اتنی گنتی گزری ہوں کہ اپنی سیلی کے لئے خلاصی قربانی بھی نہ دے سکوں۔“

گھوڑی دیر کے بعد داوی آاں نے عشرت کا سوٹ کیس بند کر کے اسے رنجنکے ہمراہ کر دیا۔ اس سے پہلے ہی وہ راج کو کہہ چکی تھی چپکے سے کہ وہ رنجنکے آنے سے پہلے ہی شمشاد کو اپنے گھر لے جائے تاکہ معاملت میں آسانی رہے۔ چنانچہ جب رنجنہ عشرت کو لے کے گئی۔ اس وقت گھر میں داوی آاں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ عشرت سے نہ راج ٹی۔ نہ شمشاد عشرت کے پاؤں تلے جتنی زمین تھی وہ سب کی سب داوی آاں نے لے کر کھائی تھی۔ اب اب عشرت کو سہارا لینے کی عادت چڑھ چکی تھی۔ اس نے رنجنہ کا ہاتھ پکڑ لیا رنجنہ کا اپنا دوست ستوش کمار چندہ میں مدد کے لئے پوٹا گیا ہوا تھا۔ جب اسے داوی آاں نے بتایا کہ عشرت اور راج کی آپس میں چل گئی ہے۔ تو اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھانا مناسب سمجھا۔ اور پھر عشرت کس قدر حسین تھا۔ کئی دفعہ پارٹیوں میں رنجنہ نے راج کے ساتھ اسے دکھایا تھا۔ یونانی دیوتا کی طرح مضبوط اور گھٹا ہوا۔ اس نے کبھی رنجنہ کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھا بھی نہ تھا۔

اس لئے اب ————— اب ۹ —————

رنجنہ کے بھائی پراطیناں اور استقام کی مسکوتہ آئی۔ اس نے عشرت کی طرف ہاتھ بڑھا کے کہا کہ آؤ۔ مگر جب وہ عشرت کو لے کے اپنے گھر پہنچی تو اس کی خادمہ نے اسے بتایا۔ کہ اس کے جانے کے بعد پونا سے ٹرک کال آیا تھا۔ اس کا دوست آج رات کی گاڑی سے واپس آ رہا تھا۔ خادمہ نے ٹیلیفون کا پیغام لے لیا تھا۔

اب رنجنہ کیا کرے۔ پسینہ اس کے ماتھے سے چوٹے نکلا۔ ستوش کمار بڑا غلام تھا۔ وہ اس سے بہت ڈرتی تھی۔ رنجنہ نے عشرت کو بتایا۔

عشرت نے کہا : ”آگے دو سالے کا سر پھوڑ کے رکھ دوں گا۔“

”نا، نا، بنیاد، رنجنا بڑی بڑول تھی۔ ٹھکے بولی : ”جے کوئی لڑائی جھگڑا نہیں چاہئے جے بہت نہیں ہے۔ مگر تم اب یہاں نہیں رہ سکتے۔“

عشرت خاموش ہو گیا۔ اب وہ کہاں جائے۔

رنجنے راج کو ٹیلیفون کیا : ”راج : ”رنجنے جھوٹ بولتے ہوئے کہا : ”تہا راجشرت شاید تم سے رنکر گیا آگیا ہے۔ اپنا سوٹ کیس اٹھائے ہوئے۔ مگر میں ڈارنگ اسے اپنے پاس کیے رکھ سکتی ہوں بنتی ہو۔“

”ہاں۔ ہاں سنی ہوں : ”راج جو سارے واسے سے واقف تھی۔ انجان ہیں کے بولی۔

”تو بہنا تم اسے آگے جاؤ۔“

”اسی بھی کیا جلدی ہے۔ آج ہی تو ہماری لڑائی ہوئی ہے اسے ہفتہ بھر اپنے پاس رکھو۔ میں آگے لے جاؤں گی، اور تم بھی تو آج کل۔۔۔۔۔۔“

”نہیں نہیں : ”رنجنہ چلا کے بولی : ”وہ آج شام کو آگے والے ہیں۔ بہنا۔ میں باز آئی۔ تم آگے اسے لگی لے جاؤ۔“

اس وقت فریڈا اور راج دونوں راج کے کمرے میں دھنسی ٹپتی تھیں۔ بلکہ نرم واز حالت میں۔

ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے لیتی تھیں۔ جب یہ ٹیلیفون آیا۔ راج نے بڑی بے دلی سے کہا : ”اسے بھیج دو۔“

”کہاں بھیجوں؟“

”جہاں اُس کا جی چاہے : ”اناکہ کہ راج نے ٹیلی فون رکھ دیا۔ مگر پھر فوراً ہی ٹیلی فون کی گنتی یہ عشرت بول رہا تھا۔

”راج میں آجاؤں : ”عشرت نے بڑی خصل سے کہا۔

”نہیں۔“

”تو پھر میں کہاں جاؤں؟“ عشرت نے بڑی مایوسی سے پوچھا۔

”جہنم میں جاؤ گی۔“

راج نے ٹہلی زون رکھ دیا۔ یہ ایک اُسے محسوس ہوا کہ وہ ایک عرصہ ہوا عشرت سے اگست ہو چکی تھی۔ وہ اُسے فوراً بھی نہ چاہتی تھی۔ اس کے دل میں اور داغ میں محبت تو کیا، ندامت کا ایک مشابہہ تک نہ تھا۔

عشرت نے اپنا سوٹ کھین اُٹھایا۔ ڈرائنگ روم سے باہر رآمدے میں آیا۔ برآمدے سے پورچ میں آیا۔ پورچ سے باہر سڑک پر آیا۔ سڑک سسٹنٹ تھی۔ تاریکی گہری تھی۔ وہ دیر تک چلتا رہا، اتنے اس کے ہر دم کو کوئی فاصلہ نہ تھا۔ کوئی منزل نہ تھی۔ اور جب راتے میں راہ گیروں نے اُسے دیکھا، تو ڈر کے مارے پیچھے ہٹ گئے۔ کیوں کہ آج عشرت کے پاس کوئی چہرہ بھی نہ تھا۔ آج وہ موت کی طرح چلی رہا تھا۔

کھینٹے ہی مہینے گزر گئے۔ اکرم کو کوئی ایسا کام نہ ملا جسے وہ اپنے خیر کو بڑی طرح مجروح نہ کر سکے۔
 پھر یہ خیبر، یہ منہ اس کے لئے اس قدر تحفیف وہ کیوں ہے۔ بہت سے لوگ بلکہ اکثر و بیشتر لوگ اس کی تعلیم
 اندیشی میں اس طرح گھومتے تھے جیسے انہوں نے اپنے لئے سائی ٹس کی طرح اپنے خیر کو کبھی آپریشن کر دے
 مٹھوایا ہو اور کسی دوسرے طریقے سے ان کا بدن خروما چلن اس کی جگہ میں نہیں آسکتا تھا۔ وہ خود بھی کیوں
 نہیں اپنے خیر کا آپریشن کروا دیتا۔ ایسے تو وہ مجھ کو مہم کر رہے تھے۔

اور اب تک وہ مجھ کو مر گیا ہوتا مگر وہ اپنی بہن کے پاس دہانہ ہوتا۔ رشید بھی طرح اتنی دوپے میں
 پورے مگر کو چلائی تھی، اسے بے اوقات حیرت ہوتی تھی۔ یہ سب کچھ ہے کہ اب نفس اور صیب رشید کے
 دونوں بڑے لڑکے اخبار بچنے لگے مگر کرتے تھے۔ مگر زندگی گویا موت کی مدد کو چمک کر گزرتی تھی اس
 زندگی کی کسی تیز و مار ہے۔ خدا کا ہنسی کی قدم پہلے چند ماہ کی حالت یا چند ماہ کی بے روزگاری اور آدمی
 غائب۔

پرل میں آج دیوالی کی بھارتی۔ قہقہوں کی جھلکی تھی تھوڑا سا سن پر سبز لڑکی کی اڑتی ہوئی ڈیڑھ آنکھوں
 کی بھارتی اچھلنے کودنے، پٹانے چھوڑتے ہوئے پتوں کی چیر و پھار قابل دید تھی۔ اسے دیوالی بہت پسند

کسی نے دائیں رک دی۔ دائیں کے تاروں سے ٹرنسپس سوسکے نوٹ سمجھتے تھے اور ان جہوں پر بچے جاتے تھے
 خٹے کو وہ جہان نوٹوں سے باہر چپ گئے۔ پھر وہ نوٹ لوہا خٹے اٹھتے ایک نیز بن گئے۔ نیز کے اوپر چڑھتا
 ہشس کیلئے گئے۔ تاش میں کوئی حجم، بادشاہ، یکہ نہ تھا۔ ہر تاش کے پتے پر عجیب سے لوگوں کی تصویریں تھیں۔
 کوئی چھاؤں چلا رہا تھا۔ کوئی سڑک کھڑ رہا تھا۔ کوئی کپڑا نہیں رہا تھا۔ کوئی انجن چلا رہا تھا۔ کوئی کپڑے سی رہا تھا۔
 کوئی سیٹ بنا رہا تھا۔ کوئی پہول آکا رہا تھا۔ کسی کے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی۔ کسی کی آنکھیں غائب تھیں۔ کوئی
 ہسپتال میں پڑا ہوا تھا۔ کوئی مرگٹ کر رہا تھا۔

مگر جو کیلئے والے ہاتھ تھوڑے خوبصورت، موزوں اور حنائی پریں تھے ہوئے تھے۔ کسی
 کی انجی میں دوڑے سونے کی مروانی انگوٹھی میں نعل کمال شہر تھا۔ کسی کی سلائی میں سونے کی زنجیر تھی ایسے
 کھانگن تھا۔ کسی کی پٹیلیا میں ہیروں سے جڑی ہوئی انگوٹھی تھی جس کے درمیان میں ایک گڑی تھی ہوتی تھی۔
 وہ ہاتھ تاش کو اٹھاتے۔ زور سے نیز پر دیکھتے

کٹ!

ٹوٹ!

چلو۔

پتے اور سرے اور پیچھے جاتے اور کوئی ہسپتال چلا جاتا۔ کوئی پام خانے۔ کوئی مرگٹ کو
 کوئی کارخانے کو، اور کوئی ڈاک خانے کو۔ کوئی پتہ سڑک پر کھڑا ہو کے بیک مانگے لگتا۔ کچھ کسی کوئی فوجی
 انگوٹھوں سے مزین ہاتھات۔ تاکہ ایک طرف ڈال دیتا۔ اور نہیں کرا پنے ساتھی۔ کتنا تیرے پاس ایک
 ہو کر آگیا ہے۔

بکرم نے بیت پئی تھی اس نے پیاسہ دیا۔ اپنی "نہیں یہ کیا ہیں۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا
 کہ وہ نیز کے دفتر میں آگیا ہے۔ اس کے سامنے جوشی جی کا سسٹنٹ بننا چاہو بیٹا ہوا اس کی طرف تک

۱۰۷۔

”میں کہاں ہوں؟“ اکرم نے پوچھا۔

”سینٹر کے دفتر میں“ بٹا پارو نے جواب دیا۔

”سینٹر کہاں ہے؟“

”تیار میل پر“

”مگر جے اُن سے۔۔۔۔۔ انہوں نے مجھ سے دعوہ۔۔۔۔۔“ اکرم خاموش

ہو گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی، مگر اس کی ٹانگوں نے اسے جوب دے دیا۔ بٹا نے اپنی جگہ سے اٹھ کے اسے سہارا دیا، جب کہیں وہ چلانے کے قابل ہوا۔

باہر آ کے بٹا نے کہا: ”آپ کی وجہ سے آج میری دریاں حرام ہو گئی۔۔۔۔۔ آپ آنکلیں

پہنچتے ہیں“

”کیوں کس اس ہاشم کا کیل مجھ سے دیکھا نہیں جاتا؟“

”قرمت دیجئے“

”آٹھیس کیسے بند کروں“

بٹا نے بڑا ساموئیل بنا کے کہا: ”جو شئی بھی کہہ گئے تھے۔ میں آپ کو گھر سنایا ہوں! اب بارہ نکال چکے

ہیں۔۔۔۔۔“

”تمہارے دو“ اکرم نے کہا: ”میں خود گھر چاہوں؟“

”یقیناً؟“

”یقیناً!“

بٹا اکرم کو جھوڑ کے چلا گیا۔ پرل سے گزرتے ہوئے اکرم نے سر ہلایا۔ آج وہ پھر نکل رہا تھا

اپنی بہن کے گھر جا رہا ہے۔ آج وہ ہر کیلکے کا اے۔ کیا کچے کا اے۔ کیلکے کا۔۔۔۔۔

گر رشید بہت کچھ جانتی تھی۔ نہ صرف اپنے بھائی کو بلکہ اپنے بھائی کے بڑے گرو کی زندگی کو۔ اسے انا کچھ معلوم تھا۔ جب ہی وہ خاموش رہتی تھی۔ بہت سے لوگ بہت سی باتیں کرتے ہیں اور کچھ نہیں جانتے۔ بہت سے لوگ کچھ نہیں کہتے اور سب کچھ جانتے ہیں۔ ان کی خاموشی حماقت نہیں ہوتی ہے۔ اس نے جب اپنے بھائی کو اس طرح لاکھڑا کرتے ہوئے دیکھنے سے جڑ کے آتے ہوئے دیکھا اس نے جب اُس کے سوتے ہوئے چہرے اور اس چہرے پر ہستی برتی آنکھوں کو دیکھا تو وہ خاموش رہ گئی۔

اکرم نفیس کے سرانے آکے فرش پر بیٹھ گیا۔ نفیس کپڑا اٹھ سے اور سر ہونڈ دھانچے بیٹھا تھا۔ اکرم نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیر کے بڑی تلی سے کہا: "بیٹو نے مجھے اتنی دھکی چلائی کہ اس سے بچنے کے لئے ماری دوائیں اور سانے ابکاشی آسکتے تھے۔ مگر اس نے مجھے دھکی چلائی اور پے نہیں دئے۔ رشید میں کیا کروں؟"

رشید نے کوئی جواب نہیں دیا۔۔۔۔۔ اس نے نفیس کے سر پر سے کپڑا اٹھایا۔ نفیس مردہ پڑا تھا۔

اکرم نفیس کی طرف دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ اور اس کے دل میں صرف یہ خیال آیا کہ اگر وہ رشید کے سر پر بار نہ ہوتا۔ اگر وہ خود کھانا ہوتا تو آج نفیس نہ مرنے لگا۔ وہ رقم جو اس کے کمانے پہنچے اور روز ترقی کی ٹرام کے کمانے پر خرچ ہوتی تھی وہ رقم نفیس کی بیماری پر رشید خرچ کر سکتی تھی۔ تو کبھی رشید نے ایک نظر باہر سے نہیں دیکھا۔ ایک دروہیر۔ ایک اٹھنی۔ ایک چوٹی۔ ایک دھاتی کرکر کے رشید نے نفیس کی ساری زندگی اکرم پر خرچ کر دی۔ ہر لمحہ اس نے نفیس کو جاتے ہوئے دیکھا۔ اور ایک دفعہ ہی اس نے

اکرم کو اس گھر میں آنے ہوئے نہیں روکا۔ کیسی برکات کی یہ تھی؟ اکرم سہارا بن کر پائے تک پہنچ گیا۔ کیا اس کا بھائی تھا؟ اگر کسی طرف سے وہ اس گھر سے چلا گیا ہوتا۔ اگر اس نے کھانا کھا یا پتھر ڈرام اور پل کر ڈوب نہ لیا ہوتا، تو آج نفیس زندہ ہوتا۔ کبھی کبھی قورشدیدہ کے سامنے باہل واضح طور پر یہ کیفیت آتی ہوگی۔ یہ متبادل کیفیت یعنی ایک طرف اکرم ہے۔ دوسری طرف نفیس ہے۔

ہائے جلاواں! ہائے جلاوہائی۔ ہائے جلاوہ زندگی! تم دونوں کو زندہ کیوں نہ رکھ سکیں؟ یہ کیسی زندگی ہے۔ خوراک۔ کرایہ۔ بجلی۔ پانی۔ چیزوں سے چیزوں سے چیزوں کی طرف واپس آ جانا اور بچ میں انسان کو غائب کر دینا۔ ایسے جیسے وہ کبھی نہ رہا ہی نہیں۔ اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا جیسے جیسے اس کے لئے نہیں تھیں۔ وہ چیزوں کے لئے تھا۔

یہ ایک اکرم کی زبان پر تک کا زمانہ آیا۔ ہاں۔ یہ ایک آسمان تھا جو اس کے رخسار سے بہ کر اس کے بوٹوں کی راہ سے زبان پر آ گیا تھا۔ مگر کس قدر تلخ اور تکلیف دہ! اکرم نے سختی سے اسے جھٹک دیا۔ نفیس کے سر پر چادر اڑھا دی اور خود باگنی میں جلنے کے کھڑا ہو گیا۔

دوسرے دن جب وہ اور رشیدہ، مصیب اور میل۔ نفیس کو دفن کر کے لوٹے تو اکرم نے اپنا سوٹ کیس بند کیا اور اپنا بستر باندھنے لگا۔ اس کی بہن غاموشی سے کھڑی دیکھتی رہی۔ بستر باندھ کر اکرم نے ہاتھ میں سوٹ کیس اٹھایا۔ بستر باندھ کر پڑا لیا۔

اس کی بہن نے اسے روکا نہیں۔ وہ اس کے ساتھ دروازے تک گئی۔ دونوں غاموش تھے۔ میرزا بھائی جا رہا ہے۔ کل میرزا بیٹا گیا۔ آج میرزا بھائی جا رہا ہے۔ میں اسے روک نہ سکی۔ میں اسے بھی روک نہ سکیں گی۔ روکنے کے لئے بھی انسان کے پاس کچھ چاہیئے۔ رشیدہ نے سوچا۔ تمہارے پاس اگر کچھ ہے تو بھائی بھی کچھ ہے۔ وہ ایک خوب صورت بندہ ہے۔ ایک پایاؤنٹ ہے۔ اور اگر کچھ نہ ہو تو بھائی ایک بہت بُری عادت ہے۔

اکرم نے سوچا۔ کچھ ہر تو بہن ایک بھول ہے۔ نہ ہر تو ایک آنسو ہے۔

دونوں بھائی بہن خاموشی سے دروازے تک گئے۔ جب اکرم دروازے سے باہر نکلے گا تو رشیدہ نے اسے روک کر اس کے ہاتھ پر ایک روپیہ رکھ دیا۔ اور جلدی سے اندر آ کے دروازہ بند کر لیا۔ اکرم نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنے آنسو روک سکے، مگر نہ روک سکا۔ وہ وہیں بند دروازے کے باہر کھٹکھٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ دروازے کے ادھر اکرم رو رہا تھا۔ دروازے کے اُدھر رشیدہ رو رہی تھی۔ دونوں کے بیچ میں زندگی سفید کینن کی طرح کھڑی تھی۔

ہارون بی روڈ کے مرکزی ایپلائمنٹ پیچنگ کے باہر چنے والے کے پاس اپنا سوٹ کیس اور سترنگ کر
 کرم دفتر میں داخل ہوا۔ اب اس نے اپنے دل میں طے کر لیا تھا کہ وہ فلم کا کام نہیں کرے گا بلکہ کوئی دوسری
 نوکری اختیار کرے گا۔ کوئی چھوٹی موٹی نوکری تو بکالت سے مل جائے گی وہ اُسے کر لے گا۔ یہی سوچ کر وہ ایپلائمنٹ
 پیچنگ میں عرضی گزارنے آیا تھا۔ یہاں ایک کلرک اس کا پہلے سے واقف تھا۔ اس نے کام آسانی سے ہو گیا وہ
 جانے کتنے دن گئے ایک عرضی گزارنے میں۔ کلرک سے دفتر کے بڑے باپ سے ملا کے کہیں میں چلا گیا بڑا باپ
 ان لوگوں میں سے تھا جنہیں اپنی اہمیت کا احساس ضرورت سے زیادہ ہو گیا ہے اور جس سے حکومت کے سیکرٹریٹ کے
 سیکرٹریٹ بھرے پڑے ہوتے ہیں۔

بڑے بڑے اپنے گھنے سر پر ہاتھ پیرا۔ اپنی بوتل کی سی گونجیوں کو سنو لایا۔ اپنی منیہ قیس کی سیاہ
 برکوشیک کیا اور کھانسی کڑکڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بیٹھ جائے" بڑے باپ کے لیے سے صاف
 ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں اس نے بلایا ہے کہ تم میرے اسسٹنٹ کے واقف کار ہو۔ وہ... بڑے بڑے
 دو چار غلام کھائے۔ دو ایک سوپ اٹے یہ دے گئے۔ ہمدردی سے اظہار کر دینے کی سی آواز میں کہا "آپ

”اکرم!“

”باب ۲؟“

”منظر!“

”سکنہ؟“

”نورپردہ؟“

”آخرم۔۔۔۔۔۔“ بڑے باورزدا سا کھانے۔ اب ذرا سے وقفے کے بعد پھر اگلے۔ ان کی سینڈ کائی بیجے

میں وہ بات تھی، جو کہہ رہی تھی۔ دیکھو اب بڑے پھلے! اب آرہی ہے اہل بات!

”کیا کام کرتے ہو؟“

”کوئی کام کرتا تو یہاں کیوں آتا“ اکرم نے جواب دیا۔

بڑے باورزدا چمکے۔ دماغ سے انہوں نے اکرم کی طرف دیکھا۔ بولے ”میرا مطلب ہے کرن

ہو تم؟ ٹائپسٹ ہو، ٹیکسٹ ہو۔ ڈائریکٹر ہو؟“

”میں شاعر ہوں“ اکرم نے جواب دیا۔

”شاعر؟ بڑے باورزدا نے ”شاعر؟ کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ شاعریوں۔ شعر کہتا ہوں۔ جیسے لڑا تھوڑا چلتا ہے۔ بڑھتی کڑوی ملاتا ہے۔“

ڈائریکٹر مڑ پڑتا ہے۔ ٹائپسٹ ٹاپ کرتا ہے اسی طرح شاعر شعر کہتا ہے۔“

”مگر۔۔۔۔۔۔ گرشا کو وہاں پلاٹینٹ کیسٹیں میں کیا کام؟“

”کیوں نہیں۔ بے مددگار شاعر ہوں۔ کام چاہتا ہوں۔“

جسے باورزدا نے سراہا کہ ”شاعری کوئی کام نہیں ہے۔“

”کیوں کام نہیں ہے۔ جڑی سنت، ہکاوش اور داغ سوزی کام ہے۔“

”میرا مطلب ہے، وہ کوئی ایسا کام نہیں ہے جس سے ساج کو فائدہ پہنچتا ہو۔ جیسے ڈمکی ہے،
 یکنک ہے، سندس ہے، کرک ہے، انجیر ہے۔“
 ”میں بھی ایک انجیر ہوں مدحوں کا، ایک سندس ہوں اخلاق کا، ایک یکنک ہوں ساج کا۔
 ایک ڈمکی ہوں تخلیق کا۔“

بڑے باور نے سزلا کے اس طرح کہا جیسے کسی دیوانے سے ان کا واسطہ پڑا ہو۔ مشترکاً مگر تم
 میرے سنسنٹ کی معرفت نہ آئے ہو تے تو میں تمہیں ابھی کھڑے کھڑے علوا دیتا، تم خواہ فرما میرا دست
 خارج کر رہے ہو۔ میں کہہ چکا ہوں، نہا سے ہاں شاعر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اگر تم اس کے
 علاوہ کوئی ڈھنگ کا کام چاہتے ہو تو بولو۔ میں بھی تمہاری عرضی داخل کرنے کو تیار ہوں۔“
 کرم نے میز پر ٹنگار کے کہا ”میں شاعر ہوں۔ میں بطور شاعر اور ادیب کے اس ملک سے اپنی
 مددی طلب کرتا ہوں۔“

”تو بڑے طلب کرتے رہو۔ میں تمہاری ضرورت نہیں ہے۔“
 ”اگر ضرورت نہیں ہے تو سہی اس کا نام کیوں پتے ہو؟ ٹیگور نے غالب کی تکلیف کیوں چاہتے ہو؟
 ٹیگور اور پریم چند کا نام فرمے کیوں پتے ہو؟ ٹاٹا نے اے۔گروہر کی کے سامنے سر کیوں جھکاتے ہو۔ تم بھگے
 بتاؤ۔ یہ تمہارا ساج کیا ہے؟ یعنی جب تک غالب زندہ رہا، تم نے اُسے سمجھا ملا جیل میں سٹرا لیگیں جب
 وہ مر گیا، اُس کے بعد تم نے اس کی تصویر اٹھا کے ڈاک کے ٹکٹوں پر چھاپ دی۔ اگر تمہیں اس کی ضرورت نہیں
 تھی۔ مگر اب بے کوئی مفید کام نہیں کیا تھا تو کیوں چھاپا؟ جواب دو۔“
 بڑا ابو کر سی سے آنکھ کھڑا ہوا۔ اُس نے تندہ سے گھنٹی بجانی کر ایک کے بدلے دو تین چیرا ہی اور
 دو ایک کلرک اندر دھکے دھکے آئے۔

ٹہسے باہر نے کرم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”اے باہر بھال دو“ پھر اس نے کرم

سے کہا۔ اے مہر-تم پاگل خانے میں جا کر اپنے داغ کا علاج کراؤ۔ پھر یہاں آنا تمہاری مرضی نے من کر لیا۔ جب وہ دفتر سے باہر نکلا، بلکہ جب اُسے نکال دیا گیا، تو اکرم کو احساس ہوا کہ اس نے کسی غلطی کی تھی۔ وہ گیا تھا کام کی تلاش میں، خواہ مخواہ بڑے بابے ابو حنیفہ! مگر اکرم نے سوچا۔ یہ نکتہ ہے۔ مجھے کے لئے دودھ کرنے کے لئے۔ یہ شاعروں اور ادیبوں والی بات۔ آخر ہم لوگ کہاں جائیں۔

اکرم نے ابو حنیفہ کو دیکھا۔ اُسے وہ چنے والا کہیں نظر نہ آیا جس کے پاس وہ اپنا سوٹ کیس اور بستر رکھ گیا تھا۔ اُس نے ابو حنیفہ کو نظر ڈالی، بڑی مشکل کے بعد اُسے چنے والا دو پولیس کے آدھوں میں بکھڑا ہوا سر پرچے کی فوٹری اور ہاتھ میں سوٹ کیس اور کندھے پر بستر اٹھاتے جاتا ہوا دکھائی دیا۔ اکرم بھاگ کر اس کی جانب گیا اور ہاتھ پر اسے پکڑ لیا۔

چنے والے نے اکرم کو دیکھ کر بڑے اطمینان کا سانس دیا۔ بولا۔ ”یہ پولیس والے مجھے چھری کے الزام میں پکڑ کر لے جا رہے تھے۔ میں نے لاکھ کہا، آپ اندھ گئے ہیں دفتر میں۔ مگر یہ ماننے نہیں۔ بولے چلو تمہارے اب میں تمہارے جہاز تھا۔ جنگلوں کی کرپا سے تم آگئے۔ لو سننا لا اپنا سوٹ کیس اور بستر اور اب ۲۴ بج رہا ہوں۔ آگے کسی کی مدد نہیں کروں گا۔ بیٹائی کا زمانہ نہیں ہے باور۔“

اکرم نے اپنا سوٹ کیس اور بستر سنبھالا اور دھڑکی طرٹ بولیا۔ آج رات تک اسے رہنے کے لئے کہیں نہ کہیں بلکہ ڈھونڈنا پڑے گی۔

شام کے پانچ بجے وہ لال باغ میں تھا۔ لال باغ سے وہ غیر راہروی طوعہ پر پرہیز کی طرف روانہ ہوا۔ پرہیز پہنچ کر اس نے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر سامنے کی بلڈنگ کی طرف دیکھا جس کے ایک کمرے میں اُس کی بڑی بہن رہتی تھی۔ اس کے دل میں بڑی شقت سے یہ خیال ابھرا۔ کیوں نہ وہ واپس چلا جائے اپنی بڑی بہن کے پاس۔ پھر اسی شقت اور سختی سے اس نے اس خیال کو اپنے دل میں دبا دیا۔ نہیں وہ واپس نہیں چلا سکا۔ اب وہ آگے جاتے گا۔ کہیں پر خود اپنے لئے جگہ تلاش کرے گا۔ وہ اپنی بہن کی غریب

پسں سے کہہ دے کہ بخش کے گنہگار و مہر و عزت اور پرانی دھرم شلہ کے باہر بگد کے پڑ کے نیچے سولی لگاتے
ہیں اُن کی جلا کے دو بال بچکے۔“

”اے کے ۲؟“ اکرم نے دل چسپی سے پوچھا۔

”تم کو دنا، نہیں کیا؟“ دھوہن بڑے پراسرار طریقے سے بولی۔

”میرا بیٹا بیرونی سیدہ کر رہا ہے۔“

”اے کے ۲؟“

دھوہن نے ابو مراد کو دیکھا۔ پھر وہ پاس کے پڑ کے نیچے اکرم کے بائیں قریب بیٹھ گئی اور بولی
”کسی کو بتانا مت۔ میرا بیٹا جب بیرونی کو بقتہ کرے گا تو اس پاس کی سب لائڈ یوں کے کپڑے اس کے
پاس ڈھٹے کو آویں گے۔“

”ہوں۔“ اکرم نے کہا۔

”ہوں!“ دھوہن نے سر ہٹ کے کہا۔ ”بس بابا دھرم و عزت کی جلا کے دو بال ہی باہر ہی بڑب

ٹیک ہر بار لے گا۔“

”مگر“ اکرم نے کہا۔ ”اس خط میں تو اب کھنے کے لئے کوئی بکری باقی نہیں رہی۔“ اکرم نے خط

اٹھ پٹ کے دونوں طرف سے دکھایا۔

”یہاں کون نہیں کھو دیتے؟“ دھوہن نے ایک خالی جگہ پر اشارہ کیا۔

”یہ پتہ کھنے کی جگہ ہے؟“ اکرم بولا۔

دھوہن بڑی مایوس ہوئی۔ بولی ”نئے آئے معلوم ہوئے ہر حدہ تم سے پہلے اس بائیں کے

پڑ کے نیچے جو خط کھنے والا بیٹا تھا اُسے تو میں جو پہلے اور بتانا چاہے بول دوں وہ سب کھو دیتا تھا۔

تم بہت کھانا کھا کھتے ہو۔“

اکرم نے کہا "آئندہ سے احتیاط کروں گا"

دوبارہ نے اسے اپنی دھرتی کے فلو سے ایک آنہ محال کے اے دیا۔ بلی "میسے حساب سے دو پیسے ہونے تھے مگر تم اپنے دس کے مسلم ہوتے ہو اس نے دیا آگئی۔ رام رام"۔
 "رام رام" اکرم نے جواب دیا۔

اکرم نے کئی کی طرف دیکھا مگر اس نے ٹاک خانے کے باہر لوہے کا جھگڑا تھا جس کے نیچے دیوار سے لگے ہوئے بانگ کے بیڑوں کی ٹالیاں لوہے کے جھگڑے پر لٹائے ہوئے تھیں۔ جھگڑے کے باہر دیوار پر سائے کے نیچے ایک ٹائپسٹ اپنے سر کے اوپر چھتری کو لے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے سامنے ایک ٹول پر ٹائپ رائٹر رکھا ہوا تھا۔ ٹول پر اوپر بھی دوسرے کاغذ تھے۔ پوسٹ کارڈ۔ مٹی آنڈر نام۔ درجہ بڑی کے نام پارسل کے نام اور اسی طرح کا ٹاک خانے سے مطلق سامان۔ اکثر و بیشتر ٹاک خانے میں آنے والے لوگ آٹن پڑھتے تھے۔ اس نے ٹاک خانے کے باہر ہی قسم کے لوگوں کی آمد و رفت دیکھی تھی۔ اس نے ان لوگوں کا رخ اندھا چھا چٹا تھا۔

ٹاک خانہ بند ہونے والا تھا۔ ٹائپسٹ کے پاس اس وقت کوئی کام بھی نہ تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر باس کے بیڑے کے نیچے آیا۔ اکرم کی طرف خود سے دیکھ کر بولا "تم اپنے موٹے پر گئے؟"
 "کیا مطلب؟" اکرم نے چونک کر کہا۔

"زیادہ ہوشیار بنو" ٹائپسٹ نے کہا "میرا تھلا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ میں ٹائپسٹ ہوں۔ تم خطا کھنے والے ہو۔ مگر یہ بتاؤ تمہیں پتہ کیسے چاکر رام بھروسے مگر کیا اس کی جگہ خالی ہے؟"
 "رام بھروسے؟ جگہ خالی؟ میں سمجھتا ہوں" اکرم نے بڑے غلصے سے پوچھا۔

ٹائپسٹ نے مذاکرات اکرم کی آنکھوں میں دیکھا۔ پھر اُسے تعین ہو گیا کہ اکرم رام بھروسے کو بائیں نہیں جانتا ہے۔ براہِ نمونہ سے غلطی ہوئی۔ میں نے سمجھا تھا کہ کسی نے یہاں بھیجا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس بائیں کے

پڑ کے بچے رام بھروسے بیٹھا تھا۔ وہ کہی مر گیا۔

”کیا ہوا اے اکرم نے پوچھا

”ناقہ سے مر گیا۔ اکیلا ہوتا تو ناقہ سے کہی نہ مرنے لیا۔ یہاں خط لکھنے کا جو کام ہے اس

میں آپ ایک بڑے کنبے کا فرج نہیں چلا سکتے۔ ایک دوہوں تو رام چل جاتا ہے۔ رام بھروسے کی ریلو

تھی۔ سات بجے تھے۔ ناقہ سے تو مرنا ہی تھا اے۔ غلطوہ فرمیں اتنے پیسے کہاں سے کما سکتا ہے

تم اکیلے ہونا؟“

”ہاں!“

”کہاں ٹھہرے ہو؟“

”ٹھہرنے والا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں ہے“

”تو پھر میرے ساتھ باقی کھڑے ہیں۔“

”کہاں؟“

”وہاں جھونپڑیاں ہیں۔ ہم لوگ دس بارہ آدمی ہیں۔ تین جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ سب

ہم کے فرج چلاتے ہیں۔ مزے میں رہتے ہیں۔ تھلا نام کیا ہے؟“

”اکرم“

”مسلمان ہو؟“

”ہاں۔“

”کوئی بات نہیں۔ میرا نام جسونت ہے۔“ تاہم ٹھکانے والے نے انہیں آگے بڑھایا۔

اکرم نے مصافحہ کیا۔

جسونت نے کہا: میں گجراتی ہوں۔ مگر ہماری جھونپڑیوں میں ہندو، مسلمان، سیک، پشاور

گجراتی۔ سڑھے۔ پنجابی سب ہی طرح کے لوگ رہتے ہیں۔ ”پھر وہ جنس کر بولا۔ وہاں جگہ اس قدر تنگ ہوتی ہے۔ مددگنی اس قدر کم ہوتی ہے۔ غریبی اس قدر گہری ہوتی ہے کہ جھوٹ جھات ایک قسم کی میناقی سی معلوم ہوتی ہے، جب سوتے میں ایک کی ٹانگ دوسرے کے سر پر اور دوسرے کا سر تیسرے کی ٹانگ پر رکھا ہو تو مذہبی انتکافات کو قائم رکھنا ناممکن ہوتا ہے۔“

اکرم نے پوچھا۔ ”تم کیونٹ ہو؟“

”ہاں“ جوت نے سر ہلایا اور پھر اس کے قریب آکے کہا۔ ”مگر کسی سے کہنا نہیں بیٹا، ہم ایسا ہے کہ اپنی روزی کمانے کے لئے ڈاک خانے والوں کی اور پولیس والوں کی دونوں کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری ہے۔ وہ کوئی مشکل نہیں ہے۔ وہ میں تمہیں سب بتاؤں گا۔ مگر ہمائی اگر انہیں یہ پتہ چلے گا کہ میں اس طرح کے خیال رکھتا ہوں تو پولیس والے دوسرے دن ہی ڈنڈا مار کے مجھے اس جگہ کے آڈے سے نکال دیں گے۔ روزی سے بھی باز رہنا“

”میں بھلا کیوں کہوں گا“ اکرم نے بڑے زور سے سر ہلایا۔

اکرم کو بانی کلمہ کی جھوٹریوں کا آؤہ بہت پسند آیا۔ اس کے مقابلے میں اس کی بہن کا ایک کروہ تاج محل تھا۔ لیکن یہاں جو چیز بہت عمدہ تھی وہ یہ کہ ان جھوٹریوں میں وہ کے آدمی سوچے بھی نہیں سکتا کہ اس سے نیچی سطح پر بھی کوئی معاشرت ہو سکتی ہے۔ نہایت تنگ و تاریک جھوٹریاں تنگ آکر وہ ٹھین کی ہیں۔ مذکورہ دشمن دان مذکور کی کڑکی۔ ایک تنگ سا دواڑہ جس میں سے آدمی سر جھکا کے گزرے گشتوں کے بل ہل کے گزرے تو ادھر بھی اچھا ہے۔ قطار اندر قطار جھوٹریوں کے سلسلوں کے درمیان ایک تیز میز میز کی کئی جہیں جابجا نیم کے درخت اُگتے ہوئے تھے۔ جن کے گرد مرد و عورتیں بچے بوڑھے و جوان غریبان کے مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے مچھلی رہتے تھے۔ ناش کھیل رہے تھے۔ شکر زبوں

یہ ساری فضا بلور تاریکی، سیلین، گمشدہ خود بخود فنا ہو جائے گی۔ ایک دفعہ پولیس نے کوشش بھی کی تھی۔
 دو ایک بار یہ آٹے خود بھی مل گئے تھے۔ مسلسل برساتوں میں مڑتی ہوئی پرانی کھڑی کو خود بخود آگ
 لگ گئی تھی۔ اور صوبہ نپڑوں میں جب آگ لگ جائے تو کچھ نہیں بچتا۔ جتنے پٹے پڑنے بستر اور چیمبرے
 کھڑی کے صندوق ہوتے ہیں وہ جل جاتے ہیں۔ نیم کے درخت بھی محفوظ نہیں رہتے۔ لوگ کہتے ہیں
 کہ فرش کی مٹی اللہ زمین کی چست تک مل جاتی ہے۔ کچھ نہیں بچتا۔ اللہ کوئی کچھ اپنی جان بچانے کے سوا
 کچھ بچانے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ کیوں کہ کسی کے پاس ہوتا ہی کیا ہے جو بچایا جائے۔ اولیٰ تو ایسے
 مروتوں پہنا کر ریگڑا پنجن نہ تو بلایا جاتا ہے۔ نہ خود آتا ہے۔ اگر آبی جائے تو اسے اس پاس کی بچی
 مارتوں کو محفوظ کرنے کے کام میں لگا دیا جاتا ہے۔ ٹھیک بھی ہے۔ مناسب بھی ہے۔ رواج بھی ہے۔
 دستور بھی ہے۔ مگر ایک بات جو ان بتیوں کے جتنے بھر میں نہیں آتی وہ یہ کہ اگر فرش کریبچے بانی کلا
 کی مٹی جلادی جائے تو دو تین دنوں میں یہ مٹی یہاں سے ہٹ کر لٹاکا کے قریب نمودار ہو جائے گی۔
 لٹاکا سے جلادیجئے تو یہ پلٹ کر کلابے میں نمودار ہو جائے گی۔ وہاں سے جلادیجئے تو اہم میں ظہر
 آجائے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ مٹی شہر نہ ہوا ایک بہت بڑا جسم ہو جس میں جگہ جگہ پوٹے پنسیاں
 دکھائی دیتے ہیں۔ آپ ایک جگہ کے پوٹے کو دوا لگا کر جلادیجئے پھر پوٹا کسی دوسری جگہ نمودار ہو جائے
 گا۔ وہاں سے جلادیجئے کسی تیسری جگہ سے رہنے لگے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قصور پوٹے کا نہیں
 ہے، اندھا کا خون خراب ہے۔ اللہ جب تک اندھا کا خون صاف نہیں ہوگا، گے شرے پوٹے یہ کالی
 میلی پنسیاں اٹھتی رہیں گی۔

اکرم جب مٹی میں داخل ہوا تو اسے یہ سب باتیں ایک دم دھیان میں نہیں آتی تھیں۔ یہ
 تو وہاں مسلسل رہنے سے آہستہ آہستہ اس کے دماغ میں گھس گھس۔ لیکن تاریکی اللہ گمشدہ کے احساس کے
 ساتھ ساتھ سب سے بڑی بات جو اس نے اس وقت ملاحظہ کی وہ اس کی ناک کی تیز حس تھی۔ اُسے

بڑی حیرت ہوئی کہ اس بستی میں بد بوؤں کا ایسا مختلف انواع و اقسام کا جو اس سرسے سے اُس سرسے تک گندگی کی قوس و قزح کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اُس نے اپنی پوری زندگی میں اتنی بد بوئیں کبھی نہ سونگی تھیں۔ اپنی حس پر اس طرح اس کا اندبہ بدبو سے ملنا بھی نہ کیا تھا۔ دیواروں اور چھتوں پر کیڑوں کی طرح رینگتی ہوئی یہ بد بوئیں اس قدر صحیح ثابت ہوئی تھیں کہ وہی مسلسل اند متواتر ہوتی تھیں کہ گویا وہ انہیں اپنے ہاتھ سے چھو سکتا تھا۔

اُس وقت جھنڈا سا چورہا تھا جب جسوت اکرم کو لئے بستی میں داخل ہوا سب سے پہلے جسوت پرے کے باہر ایک کھاٹ پر شہباز خاں چٹان جو متحدہ پردہ پہے کا لائن دین کرنا تھا بیٹھا ہوا تھیں پھر سب سے آخر اس نے جسوت کو سلام علیکم کہا اور پھر ایک گہری جھلک اکرم پر ڈالی ہوا جھنڈا تھا۔ جسوت اکرم کو لئے آگے چلا گیا۔ جہاں ایک نیم کے پٹر کے ارد گرد مٹی کے ایک اونچے چبوترے پر بہت سی ڈھنڈی صوفیاں رکھائی تھیں۔ نیم کے پٹے سے ایک لائٹنگ ٹی تھی۔ چبوترے پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے جسوت کو ایک ادبھی کساتہ آتے ہوئے دیکھ لیا۔ اور اس لئے خاموش ہو گئے۔ اور جب جسوت چبوترے پر آ کے اکرم کے ساتھ بیٹھ گیا تب بھی وہ خاموش رہے اور خاموشی سے ادبھی کو گھورتے رہے۔

جن بیت سنگھ کی نگاہیں شہباز خاں چٹان کے بعد سب میں سے تیز اند تھکا لانا جاتا تھا۔ اس وقت اس نے پچھڑی آٹار کے اندر جسوت پرے میں رکھ دی تھی۔ بڑا ادبھی طرح سے بانو کے سر کے اوپر لٹکا تھا اور گلے میں ایک پٹی سی بیاٹھ اور کپتا پہنے ہوئے اپنے مائے اندر دھندلے رنگ میں بڑا بھیاگ رکھائی سے رہا تھا۔ اُس نے اپنی سرخسوں پٹاؤں دیتے ہوئے جسوت سے پوچھا: "یہ کون ہے؟ یہاں کیوں آیا ہے؟"

جسوت نے کہا: "یہ اکرم ہے۔ یہاں رہنے کے لئے آیا ہے۔"

"کیا کرتا ہے یہ؟ پولیس میں تو نوکر نہیں ہے؟ ہم پہلے ہی پولیس والوں کے ہاتھوں سے بہت

وہ ہیں۔ ”فضل رام ہر دینے یا نہ دینے کی ٹھانڈ تھا؟“

جسوت نے کہا۔ ”نہیں۔ یہ بے چارہ تو دلورڈاک خانے کے باہر خطا گھستا ہے۔“

”تو ٹھیک ہے۔“ ایک بڑھیا جس نے اپنی منجی ہوئی آواز میں پتائی۔ ”اس بستی میں ایک اور بڑے گھر آری کی ضرورت بھی تھی۔“

یہ بڑھی محبت بننا تھی۔ اپنے زمانے میں ایک شہر طوائف تھی۔ اب گوشہ نشینی اختیار کر کے اس بستی میں زندگی کے آخری دن پڑے کر رہی تھی۔ اس کی جھوپڑی، جیسا کہ گرم کوہد میں مسلم ہوا بستی میں سب سے عمدہ تھی۔ فرش سینٹ کا تھا اور ساری بستی میں ہی ایک جھوپڑی کا فرش سینٹ کا تھا مگر جہاں بے حد گنہگار تھے اور لوگوں کا خیال تھا کہ اس نے اپنی جھوپڑی میں اپنے اچھے وقتوں کا دوسرا حصہ رکھا ہے۔ اس نے فرش پر سینٹ کر رکھا ہے۔ تاکہ کوئی فرش آسانی سے کھود نہ سکے۔

”اس کی ضمانت کون دے گا؟“ پتہ قدمو سے کہا جو ملاحظہ تھا اور قریب کی جہالوں میں ہام کرنا تھا۔

جسوت بولا۔ ”میں دیتا ہوں۔ ابھی تو اس کے پاس پیسے نہیں ہیں تم میرے حساب میں گھوڑا آج شام سے تو اس نے ہام شروع کر لیا ہے۔ دس باہر اند میں سے دے گا۔ ابی میرے حساب میں گھوڑا“ ایک موٹی بھاری گرتی ہوئی آواز نے بند بانگ پر میں پتہ کے کہا۔ اور سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ بعد میں آواز آئی تھی۔ اکرم بھی اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک نوا آوی چوٹ سے اونچا نکلتا ہوا بڑے بڑے ٹھنڈے ٹھنڈے سیاہ بال اسے پر جھکائے ہوئے کمر تک نکلا۔ کمر سے نیچے ایک دھوئی پٹے ہوئے۔ ہاتھیں پانی کی بائی نے اس کے قریب کھڑا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

”اے تم ستیہ ملنے؟“ اکرم اپنی جگہ سے اٹھا۔

ستیہ ملنے نے اُسے گلے لگایا۔ اور پانی کی بائی زمین پر گر کر اس طرف غائب ہوا

جیسے اُس کے سامنے بستی کے دو چار آدمی نہ ہوں۔ دس بارہ ہزار کا مجمع ہو۔ ” دوستو! یہ سارا عرصہ کئی ہے۔ ہندوستان کا سب سے بڑا سارا عرصہ۔ ہندوستان کا سب سے بڑا کوی ہے۔ یہ غم ڈانڈ کڑی ہے۔ آں کیا بکھے؟ ہندوستان کا سب سے بڑا غم ڈانڈ کڑی ہے۔ سب سے چٹا۔ سب سے عمو۔ سب سے نیک۔ سب سے پیارا۔ غریبوں کی مدد کرنے والا۔ غریبوں کی بچی، صحیح زندگی دکھانے والا غم ڈانڈ کڑی آپ کے درمیان کھڑا ہے۔ دوستو! شرم کا مقام ہے۔ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ یہ دلش۔ یہ ہمارا راجہ رام موہن دئے اور سوامی بدھ بھاندکار لیش۔ ہانا کا مذہبی اور جواہر لال نہرو کا دلش اور محمد علی جناح کا کرام مسلان ہے، یہ ہمارا محمد علی اور شوکت علی کا دلش ہے۔ لغت ہے ہم پر۔ ایس کہ ہم ایسی بستی کی تعداد نہیں کر سکتے آں؟“

ستیا دئے نے اس طرح گفتگو کرتے ہوئے چلا کر چہرہ کا زلیں تک شروع کر کے چاروں طرف دیکھا۔ جیسے کسی کو کچا پیاجانے کا۔ اس کے بعد اس نے تمام چاروں طرف گھما کر اکرم پر ڈال دی۔ گویا سپر ڈال دی اور بڑی زلی سے اس سے مخاطب ہوا ”مگر تم نگرد کرد۔ میرے بھائی تم یہاں شوق سے رہو جب تک قبلہ ہی چاہے۔ میں سب نیک کردوں گا۔ ان حرام زادوں کو۔ یہ جو غم ڈانڈ کڑی پر اس وقت قبضہ کے بیٹھے ہیں۔ ان سب کو شکنجہ بن کر باہر نکال دوں گا۔ مگر میرا طریقہ دوسرا ہے۔“

اس کے بعد ستیا دئے رُک گیا اور اپنا ایک ہاتھ ہوا میں اونچا کر کے بولا ”بکھے۔ بکھے۔ دو کیا سمجھتے ہیں۔ آج میں اس گندی بستی میں ہوں۔ مگر ایک دن دکھاؤں گا کہ میں ستیا دئے بھائی نہیں رہا ہوں۔ پتھر کا تیسرا کیا ہوتا ہے۔“

”ارے بھائی“ باہرام لڑک نے جو دھوے کے ساتھ میں بیٹھا تھا اور دھوے میں ہی میں ہی اس وقت سیکشن میں ٹوک تھا احتجاج کرتے ہوئے کہا ”خود کو تو بھائی دیتے ہو۔ میں بھی تو تیسرا ہوں۔“

”اے! آئی ایم دیری ساری“ ستیہ رائے نے بڑی لاہرداہی سے کہا اور پھر اکرم کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا ”دیکھتے جاؤ۔ میری ٹینک دوسری ہے۔ میں تو آہستہ آہستہ چنگ اڑاتا ہوں۔ پہلے رکھا، پھر باندھا، پھر تانا۔ پھر کھینچا۔ اے گنجی کے چھوڑ دیا۔ کہ جاؤ بیٹا گلے رہو“ یہ اس کی تقریر آخری حلقہ تھا جسے اکرم کو بعد میں پتہ چلے۔ اس وقت آستیہ رائے نے اُسے اپنے گلے سے لگایا اور اس کے بعد پانی کی باٹھی اٹھاتے ایک جھونپڑی میں گھس گیا۔

ستیہ رائے کے اکرم کی ملاقات سرسری تھی۔ ایک مرتبہ اس نے ستیہ رائے کو سینہ بائٹھ کر کے تسلیم شہزادوں میں دیکھا۔ دو تین بار محلات غلی و غفران میں پتھر کھاتے ہوئے۔ اُسے اتنا سلطو تھا کہ ستیہ رائے ایک غلی مال ہے جو پر ویزو سول کی غلیں بکوانے کا مضامین کرتا ہے۔ ایسے آدمی کو چرب زبان ہر ناجی چاہئے ستیہ رائے کی زبان بھی موڑ کے پہنے کی طرح پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گومتی تھی۔ اس کی ماسیانی کا لڑی ہوئی تھا کہ کوئی دوسرا اس کے سامنے زبان گول نہیں مکتا تھا۔ ستیہ رائے کے جانے کے بعد محلات میں بڑی دیر تک تا ۱۳ ماہ خود محنت کو اکرم نے ابھی تک نہیں بتایا تھا کہ وہ اس سے پہلے کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ آہستہ آہستہ اُسے بتائے گا۔ اب اس وقت جو اس نے دیکھا تو بے لگ اسے ایک نئی ہمدردی کی چھان پڑا سے لگ رہے تھے۔ اوندھ بہت پریشان ہوا۔ وہ کسی کی ہمدردی نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو ان میں اُن صباہ کے رہنا چاہتا تھا۔

نفل خاموشی سے سر جھکے عقدہ پتارہ لمبھوڑی دیر کے بعد اس نے جوت سے کہا ”اے میری جھونپڑی میں سونے دو وہاں جگہ زیادہ ہے“

”بہت اچھا“ جوت بولا۔

اور اس نے دیکھا کہ جوت اس کے ہاں کرنے سے بہت خوش ہوا جس جوت نے قریب آکر اکرم کی ہنسی پر ہنس دے ہاتھ مار کے کہا ”دائیں رو بٹھیک کر دیں گے۔ تو بائیں۔ گھبرا۔ میں تجھے

اپنے چھوٹے بھائی کو کسے ملاؤں گا۔ کنارا میرا چھوٹا بھائی ہے۔ اور جب میں جیت گیا کہہ رہا تھا۔ اگر مرنے
مسموس کیا کہ چھوٹے بھائی کے ذکر سے میں جیت گیا آواز میں غم نہ مآ اچلا تھا "کنارا یہاں میڈیکل کالج
میں پڑھتا ہے۔ دو سال میں ڈاکٹر بن جائے گا۔ بڑا ڈاکٹر! میرا کنارا۔ میرا چھوٹا بھائی۔ میں اُسے کبھی
یہاں آنے نہیں دیتا۔ تو اگر کو اُس سے ملنے کے لئے ہوشل میں جاتا ہوں۔ اگلے اتوار کو تمہیں لے چلوں گا"
جیسے میں جیت کبہ رہا ہوں فکر نہ کرو تو مگر میرا چھوٹا بھائی ہے۔

میں جیت ٹھیک ٹھکانہ تھا اللہ خود اس گندی جتنی میں رہتا تھا۔ مگر اس کی ساری کمائی اپنے چھوٹے
بھائی کنارا کو خرچ کرنے میں صرف ہوتی تھی۔ اپنے اوپر وہ بہت کم صرف کرتا تھا۔ اکثر کہا کرتا۔ میرا اب
دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میری بچے تو بڑے ہیں اور اب صرف یہی ایک چھوٹا بھائی بچا ہے۔
مگر کاج پرائے۔ یہ ڈاکٹر بن جائے تو کھوں گا میں نے کچھ کیا۔ وہاں گرو کی بکرا سے اب دو سالہ بھگتے ہیں۔
جیسے میں جیت کبہ رہا ہوں۔ میں آن پڑھ ہوں۔ جاہل ہوں۔ غیر تہذیب یافتہ ہوں۔ تمہاری محبت کے لائق
نہیں ہوں۔ مگر میرا ایک بھائی ہے۔ میں نے اُسے پڑھا یا ہے۔ اُسے ہوشل میں رکھا ہے۔ وہ ڈاکٹر
بننے والا ہے۔ وہ تمہاری محبت کے لائق ہے۔ میں تو اس سے ملاؤں گا۔

اگر مگر ابھی میرا اس نے میں جیت کونہ سے لگے سے لگا کے کہا "نہیں جیتا میں جیت میں تم
سے بھی مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں تبت کے بھائیوں میں
آیا ہوں"

رات تاریک اللہ بدلتی۔ فرش پر کپڑے، جو میں، روج اللہ کشل رہتے تھے، دفنا میں
پھر بننے لگے تھے۔ میری جھونپڑوں کے اندر اللہ جھونپڑوں کے باہر گی میں اللہ نیم کے چوتھے کے
فرش پر انسانی جسم نیند میں مدھوش پڑے تھے۔ ایک دوسرے کے قریب قریب کلاڑی کے ہتھکڑیوں کی طرح نیم
کے پیر کے اوپر اٹھیں میری دھکیں مل رہی تھی۔ سب سو رہے تھے مگر اگر م باگ رہا تھا۔ اللہ جتنا بڑا صبا اپنے

بھونپڑے کے دودانے میں آگڑوں بیٹی ہوتی جاگ رہی تھی۔

”اماں تم سوتی کیوں نہیں ہو؟“ اکرم نے آہستہ سے پوچھا ”کس کا انتظار ہے؟“

بڑھی نہیں۔ اس کی بیٹی تلخ افسانہ ہر گھنٹہ تھی۔ پھر جنا نے آہستہ سے کہا ”بیٹا ایک عرائف چھانڈو کی طرح ہوتی ہے۔ وہ دن کو سوتی ہے۔ رات کو جاگتی ہے۔ میں برس تک رات کو مسلسل جاگنے سے اب نیندا آٹھوں سے آڑ گئی ہے۔ اب مجھے رات کو نیند نہیں آتی زندگی کے دن پلے سے ہونے کو آتے۔ پھر ہی اب عادت بن چکی ہے۔ میں رات کو جاگتی ہوں۔ دن کو سوتی ہوں۔ مجھے معلوم نہیں دن کیسا ہوتا ہے۔ مجھ کو کسی ہوتی ہے۔ سورج کو مرے بھٹا ہے۔ تم میری نگرہ کر دیتا۔ سو جاؤ۔ آرام سے سو جاؤ۔“

اکرم کو اپنا حلق کھینچا ہوا اندہ کو سکڑاتا ہوا محسوس ہوا۔ جیسے حلق میں کوئی چیز پھنس رہی ہو۔ اس نے آہستہ سے اپنا منہ موڑ لیا اور کدھٹ بدل کے جھوٹے پر دانا ہو گیا۔ پھر ہی سونے سے پہلے اس کے ذہن میں جو تصویر تھی۔ وہ ایک بڑھی عورت کی تھی۔ جس کے ہونٹوں پر پگیس نہیں تھیں اور جو آنکھیں جھکاتے ہیں ایک دودانے میں آگڑوں بیٹی اندھیرے میں دیکھ رہی تھی۔ اندھیرا اس کے آگے تھا، اندھیرا اس کے پیچھے تھا۔ اندھیرا اس کے اوپر تھا۔ اندھیرا اس کے نیچے تھا۔ اندھیرا۔۔۔ اندھیرا۔۔۔ اندھیرا۔۔۔ اندھیرا۔۔۔

دل ان اصدائیں ہمنوں میں تبدیل ہوتی گئیں۔ غلی سنت کا بحران کم نہ ہوا، بڑھتا ہی گیا۔
 اکرم کی خطوط نویسی کا بہت سے لوگوں نے مذاق اڑایا تھا۔ یہاں تک کہ ایکسٹرا بھائی لوگوں کے لئے بھی
 ہنسی مذاق کا موضوع بن گیا تھا۔ شروع شروع میں اکرم کے اس کام کے شروع کرنے کا چرچا بھی ہوا
 تھا۔ ایوننگ ورلڈ نے اس کی تصویر بھی چھاپی تھی۔ اس سے پہلے بھی یہ اخبار ایک بی اے پاس پاس کرنے
 والے کی تصویر چھاپ چکا تھا۔ مگر کسی بھڑکی کی محامہ سے نہیں، صرف سنی پیمانے کے نکتہ جھگڑے، مگر
 اس بات کو بھی اب چھ ماہ سے اوپر ہو گئے تھے۔ غلی لوگ اکرم کو بھول گئے تھے ان کے لئے پتی ہی پڑھیں
 کیا کم تھیں۔ اُبتر میں کم بھڑکی تھیں۔ مختلف سٹوڈیو میں لائٹ جیوں نے اپنی یونین بنالی تھی۔ کئی برسٹرو
 میں جڑتیں ہوتی تھیں۔ جڑے بڑے سرمایہ داروں نے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ بہت سی قادی پر غلی کی تصویر
 ڈبیل میں بندھ چکی تھیں۔ نئی تصویریں بہت کم شروع ہو چکی تھیں۔ جھٹ بہت کم ہوتے تھے۔ بھڑکیوں کو جاکے
 وقت خانے لگ رہے تھے۔ داد میں مغل پرانے دھواں دھواں کی کیفیت کا منتظر تھا۔ کبھی یہ سناٹا جیسے سب
 ادھمک رہے ہوں۔ کبھی ایک نئی ایسی طرائق کہ ان کی کہن میں سرکل جاتے۔ ایکسٹرا لوگوں کو سسٹنٹ ڈائریکٹروں
 کو جاکے کئی سفید پوش ڈائریکٹروں کو خانے لگ رہے تھے۔ میرے دوستوں کو اپنا اندھیرے بڑھتی ہوئی سکو اسٹ

کوناقم رکنا بڑا مشکل معلوم ہوتا تھا۔

بقا چاہیہ نے پہلے پہل اکرم صاحبت خاقا ٹٹایا تھا۔ پھر ڈی بجیدگی سے اسے اس ہم کو چھڑ کر پھرے
نہوں میں آئے کہ کیا تھا۔ یہاں تک کہا تھا کہ اس کے اس حقیر کام کرنے سے نعم دلوں کی تعمیر ہوتی ہے مگر اکرم
نہیں ملا۔ اب وہی بھٹا چاہیہ تھا کہ اکرم کی ناش مندی کو سراہ رہا تھا۔

”سبح سے ملت کے باں بجے تک کام کرتا ہوں۔ پھر کبھی کوئی پیہ نہیں ریتا۔ تین پچھوں کی سسٹنٹ
ڈائریکٹر ہوں۔ ایک کچر کے پردے پیہ نہیں تھے۔ بیٹہ باکڑا نے سٹے میں بیس لاکھ ہارے ہیں۔ بڑے ہیں
حالت تکی ہے فدا مبر کرد۔ اسے جب حالت موٹی تھی جب تم نے کون سی تیلیاں کھول دی تھیں۔“

اکرم خانوش رہا

”تم بہت اچھے رہے۔“ بھٹا نے کہا ”دن میں کتنا کھا لیتے ہو؟“

”دو ڈھائی روپے۔ کسی دن تین بھی ہو جاتے ہیں۔“

”یہاں تین بھی نہیں تھے۔“ بھٹا نے اکرم کی طرف رشک سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا میں یہ خانا ڈال آؤں۔ بھائی سے سوہنہ یہ لگایا ہے۔“ بھٹا نے خانا اکرم کے سامنے ہلایا۔

ابھ پھر ڈاک خانے کے اندر گھس گیا۔

ایک دن اکرم نے کسی صاحب کو ڈاک خانے میں گھستے ہوئے دیکھا۔ جانا چھاپا انداز معلوم ہوا

مگر چونکہ اس آدمی کی پشت اکرم کی طرف تھی اور اکرم اس وقت ایک خطا لکھنے میں مصروف تھا۔ اس نے اس نے
زبان توجہ نہ دی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ کوئی ڈاک خانے کے باہر نکلا تو اکرم نے جھٹ پھپھان یا مینز راست
خیش تھے۔ مگر کس قدر گھبراہٹ سے گھستے تھے۔ ان کے سرخ و سفید تھے اندر کو جس گھستے تھے اور اندر کو جس گھستے

باتحادیوں کے اصولوں سے ملتا تھا۔

”اے مرزا بی؟“ اکرم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

مرزا بی نے بھی حیرت سے اکرم کی طرف دیکھا۔ حیرت دونوں کو ایک دوسرے کو اس حالت میں پاکر مہدی تھی۔ مگر اکرم اپنی حالت پر زبان مطلق نظر آتا تھا۔ مرزا بی نے اپنی آنکھیں چھائی تھیں۔ گہرا کے بولنے میں تم یہاں کیا کرتے ہو؟“

”مظہر مازنی کی کتابوں“

مرزا بی خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد بولے ”دیکھا۔ اچھے پڑھے کھے مسلمانوں کو بھی یہاں کام نہیں دیتا۔ میں تو پاکستان چاہتا ہوں“

”کیوں؟“

”کیا کروں۔ یہاں ایک سال سے بے کار بیٹھا ہوں۔ اب تو قاتلوں پر زور پڑنے لگا“

”پاکستان میں کیا کمانے نہیں ہوں گے یہاں کیا بے کاری، غریبی، جہالت اور اس قسم کے مسائل نہ ہوں گے۔ یہ بیلاری ہر جگہ ہے مرزا بی“

مرزا بی اپنے غائب ہونے سے پہلے ”کراچی میں میرا کام زلف ہے۔ وہ ایک اونچے سہولتی جگہ پر قائم ہے۔ اس نے مجھے کھلا ہے کہ اگر میں پاکستان آ جاؤں تو وہ مجھے پلیٹنگ ڈپارٹمنٹ میں جو سکاڈرٹ ملائے گا ٹھیک ہے!“

”مگر تمہارا کام تو یہ تھا۔ نہیں گھٹو اس قدر ہند تھا۔ مرزا بی سال میں دو مرتبہ تم اپنے وطن جاتے تھے

گھٹو کے پاس۔ اس کا کچھ اس کا خصوص اب دیکھو۔ وہ گھٹو بلا تھک زمین کی سی سونڈی سونڈی خوشبو دے...“

مرزا بی نے اپنی نظریں اکرم سے پھیریں۔ آہستہ سے بولے ”میں نے سب ٹھیک کر لیا ہے“

اور اکرم نے مرزا بی کے گہرے چہرے، ان کے شفاف چہرے کے کڑتے اور سفید پائجائے کی طرف

دیکھ کر سوچا اسے کسی وسیع منہ نظر میں رہنے والے خوب صورت لوگو! اب تہلہ لے کر آئی ہوں نہیں ہے؟
 اللہ کوئی انتہا نہیں ہے۔ کوئی جڑا نہیں ہے اللہ کوئی سزا نہیں ہے۔ کیوں کہ تم نے اپنے سب کچھ منقود کر لیا
 ہے۔ تمہیں گمشدہ کے بجائے کچی لایا جانے کے بجائے جانور حرام اللہ تم نے اسے منقود کر لیا۔ اللہ کے بجائے تمہیں
 مشرت اللہ تم نے اسے منقود کر لیا۔ ایک دن تمہیں زندگی کے بجائے پتھر کی گولی ملے گی اللہ تم اسے بھی
 منقود کر لو گے۔ کیوں کہ تمہاری روح کا طوفان رچ چکا ہے۔ اللہ تہلہ لے سائل کا سیلاب تر چکا ہے۔ اللہ تمہاری
 کاوش نے تمہیں کاغذ پر سایہ بچھ لیا ہے۔ اس نے اب تہلہ لے کر کوئی پتہ نہیں کر سکتا کہ اللہ کوئی شاخ
 نہیں لہزے گی۔ اللہ کوئی پہاڑ تہلے لے دو تو بے پروا تک دینے کے نہیں آئے گی۔ اللہ تم اپنے ہون پرش
 میں نادم میں سر دی سے فخر کرتے ہوئے مر جاؤ گے۔ اے میرے غالی فانی خوبصورت نکلے لوگو!
 مرزا جی نے اس سے کہا "تم یہاں اپنی زندگی برباد کیوں کر رہے ہو پاکستان چلے جاؤ پڑے کسے
 مسلمان کے لئے اب بھی وہاں بہت قند ہے"

"اگر سب ہی پڑے کسے مسلمان چلتے بنے تو ان پڑے مسلمانوں کا یہاں کیا ہوگا؟"

اکرم کی آنکھیں فٹے سے چمک رہی تھیں اس نے ذرا بلند ہونے میں کہا "تم میرے ہو مرزا جی۔
 میں ایک نہیں ہوں۔ بے گہری، منطقی، اناداری مسلمانوں ہی میں نہیں ہے۔ ہندوؤں، سکھوں، جینیوں
 اللہ پارسیوں میں بھی ہے۔ غریب کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ لیکن اگر تم مسلمانوں ہی کی بات کہتے ہو تو یہ بھی
 تم کو کہ اس ملک میں ساڑھے چار کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ کوئی اللہ ملک بنا ڈالیں ہے کہ انہیں ہمسلا
 دے سکے۔ یہی ان کا ملک ہے۔ یہی ان کا وطن ہے۔ اسی وطن سے پیدا کرتے رہے اس کی مٹی کس
 گیت گاتے رہے۔ اسی کے سوا کچھ ایک ضروری نعمتی اللہ بہترین حقہ بن کے ان کے آگے بڑھنا ہوگا۔ اللہ کوئی
 بد سزا دیتے نہیں ہے۔ میرے داغ میں یہ بات بالکل واضح اور صاف صاف ہے"

مرزا جی ایک لمحہ ہنسی نہ سہے۔ بڑی احتیاط سے انہیں لے جانے بھی پاکستان میں سے ایک یا ان

”کالا۔ اسے تلے میں دیا یا اسے بغیر کسی سلام کے اکرم سے سونہر پیمبر کے چلے گئے۔ جیسے انہوں نے کسی سلطان نہیں کسی کافر کا چہرہ دیکھ لیا ہو کہ وہ ایک عزاجی کی غائب ہوئی ہوئی پشت کی طرف دیکھتا رہا۔ یکایک اس کے کانوں میں آواز آئی۔ سلام . . . اے!“ اودھ چونک کے کھڑا اس کے سامنے ولایت یلگم کھڑی تھی مگر وہ سوچتی وہ ادا، وہ مجروح، مصیبت اب جانے کہ غرائب ہو گئی تھی۔ ولایت یلگم نے اپنے خوب موتا ہوا سترے سے سات کروڑ اڑائے تھے۔ اور پہل سے نقلی امیر و کمان کی طرح خمیدہ بنائے تھے۔ اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے گتے تھے۔ جس میں چھپانے کے لئے اس نے اپنے دھندلوں پر لوگ و دونوں ضرورت سے زیادہ تھوپا تھا۔ ہونٹوں پر لپٹک اس قدر زیادہ تھی کہ دونوں ہونٹ پٹے ہوئے زخم معوم ہوتے تھے۔ اس قدر شوخ ہو کہ اس رنگ تھا وہ! ولایت یلگم نے اس کے کہا ”مجھے نصیب نے بنایا کہ اب تم یہاں بیٹھتے ہو“

”مگر نصیب؟“

”اے نصیب کہ تم نہیں جانتے ہو۔ کمال ہے۔ اے وہ اپنی ہے اپنے ساتھ جسم بہت اچھا ہے اس کا۔ وہ تو تہذیب اتنی تعریف کرتی ہے کہ میں بھی وہ تم پر عاشق ہے اے تم ضرور اسے جانتے ہو گے“

اکرم کو یاد آیا۔ اس نے سر ہلا کر کہا ”ہاں اے دو تین بار دیکھا ضرور ہے۔ مگر آج تک

نہیں۔۔۔“

ولایت یلگم ہنسی بولی ”کسی دن عہدوں گی۔ اس رت ایک نئی آفت کھود“

”کتنے کا ہے؟“

”پچتر دہائی“

”کے پھر گی؟“

”اے میری طرف سے مت پہنچے۔ وہ کمال کا غضب ہو جائے گا۔ حضرت کے نام

سے بچو“

اب اکرم چڑھا "کون مشرت؟"

"اسے وہی مشرت ہوگی دراج کے پاس تھا۔ دراج نے اسے کھال دیا۔ اس بے چارہ کی بہت

بڑی مالت ہے۔"

"مگر مشرت کون ہے کیا تعلق؟"

طاہت بیگم نے آہستہ سے کہا "اب میرے پاس ہے۔ گوگر ملے ہوئے بہت خفاریں۔ مگر

مجھے بڑا ترس آیا اس پر۔ میں نے کہا۔ جہاں اتنے لوگوں کو کرائی ہوں وہاں ایک لکھ ہی۔ کوئی آکر نہ ملدی
سے کہو۔"

"کس پتے پر جانے؟"

"نہیں گئے جانے۔ زمین پہلے کھائی گئی ہے۔ اب آئینہ بیگم اس کی ماں کا نام ہے۔ اس کی ماں

بہت بیل ہے۔ اس نے پیسا لگے تھے۔ مشرت کہاں کہاں سے ہوں گے۔ اس نے بیچ کر دی ہوں۔ میرا
پتہ نہ لگتا۔"

"تو کس کا پتہ لکھوں؟"

"مشرت لکھو۔ اہ۔ اہ۔ طاہت بیگم نے نیا ایک سونے کے کہا۔ نیچا پانا پتہ

دے۔ جب رسید آئے گی میں تم سے آگے لے جاؤں گی۔ لکھو؟"

"بہت اچھا!"

"تم بہت اچھے ہو۔ طاہت بیگم نے کمر سے کہا "اس دن جو میری بہن تم نے مجھے جو تک

نہیں لایا۔ میں نے اپنے دل سے کہہ دیا تھا کہ اس بے چارے کا بڑا شرم ہوگا۔ سو بخور دی ہوں۔"

"کیوں؟"

"یہ دنیا شرمیوں کی نہیں ہے۔"

”نہیں ولایتِ عظیم۔ یہ دنیا شریفیوں ہی کی ہے۔“ اکرم نے اس سے کہا۔

”نہیں۔۔۔“ ولایتِ عظیم بڑی سختی سے بولی ”یہ دنیا شریفیوں کی نہیں ہے۔“

اکرم چپ ہو رہا۔ نئی آفت گھوڑا کے ولایتِ عظیم نے اسے ایک دوپیرے دیا۔ اکرم نے اٹھ کر دیا۔

”لو“ ولایتِ عظیم نے کہا۔ ”ہم کی کمائی ہے۔ ایک دوپیرے تم لے گئے۔ آگنِ ماضی ہو جائے گا۔“

”ایسا کیوں کرتی ہو ولایت!“ اکرم نے بڑی مسرورگی سے کہا۔ ”ایسا کیوں کرتی ہو یہ عجیب نہیں

ہے۔ اپنے آپ کو تباہ کر دینا۔“

ولایت کی ساری شرفی ایک دم ختم ہو گئی۔ جیسے اس کے سپرے سے تاریکی ہلکی سا گھوم گیا۔ وہ

یہ ایک کافے تھی۔ اس کی آٹھیں، بنائیں، اس کے حق سے قحط کے ساتھ خون کی ایک کیر سی باہر فرسٹ
ہو رہی تھی۔

اکرم کانپ گیا۔ ”تم اپنا علاج کرو۔ تمہاری باتیں چھوڑ دو۔ کسی ماں باپ کو یہ حق نہیں پہنچتا۔ تم کسی ہسپتال میں داخل
ہو جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ مل کے تمہیں داخل کروا دوں گا۔“

ولایت اس کے ساتھ ساتھ اس کے اٹھی بولی ”اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب جو میں کچھ نہیں بلکہ اب

سب ختم ہے۔“

اور وہ چلی گئی۔ اکرم دیر تک اُٹھ بھٹا رہا۔ وہ ایک عجیب بے جگم چال سے چل رہی تھی وہ بسنا

پاؤں کیس اور بایں پاؤں کیس۔ اور وہ اپنا کُولا کیس اور بایں کُولا کیس۔ اور ایسا سلوم ہوتا تھا جیسے ایک

حالت نہیں۔ وہ خود تیس بیچ میں سے تین چوکے الگ الگ ٹانگے اور کُولا کے بدلے وہ تین تینوں میں

گھس رہی ہیں۔ اکرم نے منہ نہ پھیر دیا۔ بہت مشکل ہے۔ چیزوں کو دیکھنا۔ بھنا اور کچھ کرنا موش ہو جانا۔ اپنے

دل و دماغ کو اس قدر نکال کر دیکھنا کہ وہاں کوئی حویلی باقی نہ رہ جائے۔ بدلے ملک میں کتنی ہی حالتیں آئی

حالتیں ہیں۔ آدھی سے بھی کم ایک تباہی۔ ایک چرستان۔ حیرت۔ ایسی حالتیں جن کے اندہ کوئی حالت نہیں

اُس روز بارش برس کے خم گئی تھی۔ شام ۱۰ وقت تھا اہل بستی کے لوہے آسمان میں شفق ملایا
 بادلوں کی جھالیں جھانے کھڑی تھی۔ بستی کے آس پاس اہل بستی کی گلی میں چھوٹے چھوٹے بوڑھوں میں ہانی
 بھر گیا تھا۔ اہل اس وقت شفق کے کس سے ایسا سلوم ہوتا تھا اگر ہانی کی سطح پر بڑا دل محاب تر ہے ہیں
 آسمان کے اس چھوٹے سے کونے میں اس وقت آناٹھن تھا اگر اوپر دیکھتے ہوئے بحیث ہوتی تھی۔

گھر بستی کے لوگ اوپر نہیں دیکھتے تھے۔ ایک عرصہ ہوا وہ آسمان کو بھلا چکے تھے اس وقت
 نیم کے پڑ کے نیچے بڑے زور شور سے بوٹ جاری تھی دھوڑے جو عموماً غامض رہتا تھا۔ اس وقت بہت
 ہی بے چین اور مضطرب انداز میں باتیں کر رہا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا "بیٹھنے بچے بٹایا۔ کاغذ کا پرندہ جو میں نے بوائے میں کو دیا تھا۔ اہل بوائے میں
 نے انہیں کو دیا تھا۔ وہ اس وقت اس کے سامنے تھا۔ وہ بہت بے چین اور پریشان نظر آتا تھا۔ بچے
 اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر کہنے لگا۔ "کب سے تم ہماری بل میں کام کرتے ہو؟"

"دس سال سے"

"اس کاغذ پر تم دستخط کر رہے تھے؟"

”ہاں“

”تم جانتے ہو اس کاغذ پر کیا لکھا ہے“

”جی۔ لکھا ہے کہ دنیا میں جنگ بند ہونی چاہیے“

سیٹھ نے کاغذ دہرا کیا۔ تہرا کیا۔ چہرہ کیا۔ اس نے اُسے پھر آہستہ سے کھولا اور اتنے عرصے

تک وہ بھل خاموش رہا۔ پھر اُس نے مجھ سے کہد

”کیا تم کو یہی شانتی سما کے ممبر ہو؟“

”ممبر تو نہیں ہوں۔ واسطیٰ ضرور ہوں“

”دنیا میں امن ہو یا جنگ ہو، تمہیں اس سے کیا۔ تم مزے سے اپنا کپڑا بٹختے جاؤ“

میں نے سیٹھ کو ہنس دیکھا کہ اسے میں بتایا۔ اُس نے میری گوی بات سن کر ہی کہد

”سیاست؟ سیاست۔ تم مزدور لوگ اگر سیاست کم کرو اور کام زیادہ کرو تو دنیا میں کسی

قسم کی صحیفت باقی نہ ہے۔“

میں نے کہا ”میرے پچھلے دس سال کا ریکارڈ دیکھو۔ کیسا کام میں نے کیا ہے۔“

سیٹھ ہوا ”اہی نے تو تمہیں بھلا سنا ہوں۔ کوئی دوسرا جوتا تو اُسے غرا کمال دیتا۔“ آٹا کہہ کر اس

نے بچے نصیحت دیکھا، بلکہ گھوڑا، جیسے پلین ول نے کسی لازم کو گھومتے ہیں۔ سیٹھ ہنس دیا ”تم بہت چالاک

ہو۔ اچھا جانتا اب کی تمہیں سامان کر دیتا ہوں۔ مگر آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا“ اس کے بعد اس نے وہ دستلوں

والا آئینہ لے کر پھاڑ دیا اور مجھے اشارے سے کہا کہ اب بچے چھٹی ہے۔

”پھر“ مجھ نے اپنی ناک اٹھی سے دو تین بار منڑتے ہوئے پوچھا ”تم نے دستا نہیں

کر دیا؟“

”جسے بلا“ ایسا ہی کیا؟ مگر میں اب محتاط ہو گیا۔ میں نے جا کھانے مزدور بھائیوں سے

کہا کہ سچ کیا کہتا تھا۔ کئی مزدور جہاں جراس سے پہلے شانتی سماجی اپیل پر دستخط کرتے تھے انہوں نے فوراً دستخط کر دیے۔

”میں“

وہ بولے ”سینئر کراس اپیل کی مخالفت کرتا ہے اس میں ضرور کوئی ایسی چیز ہوگی۔“

اس پر ایک قبضہ ڈالا۔ من بیت سنگھ اور فضل خٹک نے دھم دے دی۔ ”کرم جواب تک اس کو کہہ دو جتنا تھا، مسکرا کر اس کو سختی سے دیکھ رہا تھا اور بچے کی کوششیں کر رہا تھا۔ دوسرے نے اپنی ٹیکر کی جیب سے ساقدوں کا ایک پلندہ نکالا۔ کہنے لگا ”پہلا ساقدور بیٹھو نے پاڑ دیا اس پر بڑی شکل سے دوسرا دستخط ہوئے ہیں گئے بیٹھ کے سنا کرنے کے بعد آٹھ سو لوگوں نے اس پر دستخط کر دیے۔ تم نے مگر اس وقت ان لوگوں کے ہیرے دیکھے ہوتے!“ دوسرے بیک خاصٹس ہو گیا۔ اس نے دستکوں ملنے کاقدوں کا پلندہ مہرنت کے ہاتھوں میں دے دیا۔

جواب دیا ”اس جنگ کی تو میں بات نہیں کرتی لیکن پھل جنگ میں بچے یا دے رہا ہے وہی بچے ہونے مانگے نام دے جاتے تھے“

من بیت نے کہا ”اور اس کے بعد وہ خندق پر جا کے گولی کما کے فرماتے تھے۔ اسی طرح میرا چچا مر گیا تھا۔ بچے یا دے رہا ہے گاؤں میں دیوانی لایا تھا۔ اس مذہم لوگوں نے نئے کپڑے پہنے تھے ہلکے دوڑوں یا تو مشائیوں سے بھرے ہوئے تھے اور جیپوں میں آتش بازی کا سامان تھا اور ہم پہلے سے خرید کے لے جا رہے تھے۔ اتنے میں ایک ڈاکٹر میرے والد کو مرنے لگا ہوا آیا۔ اور وہ مار چڑھ کے میرے والد پر ہاتھیں مار کے روئے لگ چکے۔“ وہ چپ ہو گیا۔ پھر من بیت نے سر ہلکے کہا ”یقیناً زندگی بہت اچھی چیز ہے۔ بچے اپنا چچا ابھی تک یا دے رہا ہے۔ لام پر جانے سے پہلے وہ کس قدر خوب صورت اور تندرست دکھائی دیتا تھا۔ اس کی دواڑھی سرخ تھی، اور سرخ اس کے بال تھے، اور سرخ اس کے

مال تھے۔ اور وہ ایک بڑے لڑاکیلی بچے کی پھوڑ کر مر گیا۔ اگر وہ آج زندہ ہوتا تو شاید میں اپنی پڑھائی جاری رکھ سکتا۔ میں جیت نے اس زندگی سے سر ملایا۔

فضل نے کہا: پہلی جنگ کی بات تو میں نہیں کرتا لیکن اس جنگ کے دنوں میں، میں نے بہت بہتے تھے۔ میری ٹیکسی بھسے شام تک چلتی تھی۔ ان سے زیادہ رات میں کمانا تھا۔ کوئی دن ہی ایسا ہوتا تھا جس میں صاف شہر دے نہ کھاتا تھا۔ اب؟ مشکل سے بائیس تھیں دوپے ہوتے ہیں۔

جسوت نے کہا: ”جنگ میں دشمن کتنا تھا۔ شہر دے پر دس تم خرید کیا سکتے تھے۔ جنگ میں جنگ کے دنوں میں کیا ہوا۔ تیس لاکھ آدمی فلقے سے کیوں مر گئے کیوں کہ سالانہ آج کا جنگ پر جا رہا تھا اس نے ہمیں اور بچے فلقے کرنے پڑے۔ صرف دھوپوں پر کوئی نہیں ہی سکتا ہے اور آدمی کی زندگی ایک ٹیکسی کی کمانی سے ہزاروں گے بہتر ہے۔ سامنے ہر کہ نہیں۔“

فضل نے اثبات میں سر ملایا۔ تھوڑی دیر کے بعد رنگ کے بولہ ”ایک اپیل بچے بھی دے دو میں ٹیکسی ڈرائیوروں کے سامنے اے رکھوں گا۔“

جسوت نے ذیل کا ایک چھاپا ہوا نڈلے دیا۔ پھر اس نے اکرم سے مڑ کے کہا تم خاندان مری میں اتنے بڑے بڑے نامور اور اداکاروں، ہدایت کاروں، تقسیم کاروں کو جانتے ہو اگر تم ان لوگوں سے دستخط کرا سکو تو ہمارے کام کو بہت فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

اکرم نے کاغذ اٹھائے اور لے کے کہا: ”مگر اس میں ہے کیا۔ میں تو سمجھتا ہی نہیں۔ کون ایسا آدمی ہو گا جو اپنے ہوش و حواس میں ہو اور اس اپیل پر دستخط نہ کر دے۔“

جسوت نے کہا: ”یہ چیز اس قدر آسان نہیں ہے۔ تم چھان بین کے سیٹھ کی باتیں تو سن چکے ہو۔“

”وہ سب تو پاگل معلوم ہوتا ہے۔ ساری دنیا تھوڑی پاگل ہے۔“ اکرم نے ہنس کے کہا۔

”دنیا میں کتنی خطرناک پالم موجود ہیں، جو پالم خانے میں موجود نہیں ہیں۔ بلکہ اونچے اونچے اور
 جھڑوں پر دوڑتے ہیں اور دن رات جنگ جنگ چلاتے ہیں۔“
 ”ہوں گے! دوسرے ملکوں میں ہوں گے۔“ اکرم نے ذرا جلدی لہجے میں کہا ”مگر ہمارے
 ملک میں نہیں ہیں۔ خود ہمارے ہر وہاں مستری کی پالیسی ہی ہے کہ دنیا میں کہیں جنگ
 نہ ہو۔“

”اس میں کوئی شک نہیں“ جسوت بولا ”پنڈت نہرو کی مخلصانہ کوششوں نے امن کی
 سازش میں ہندوستان کو ایک تاریخی مقام بخلا ہے۔ مگر یہ قسمتی سے خود ہمارے ملک میں ایسے لوگ موجود
 ہیں جو طرح طرح سے پنڈت نہرو کی صلح ہونی کی پالیسی کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کا موہنہ بند کرنا ضروری
 ہے۔ لہذا پنڈت نہرو کی امن پسند پالیسی کو آگے بڑھانے کے لئے عام کا تعاون دینا بھی بہت ضروری ہے۔“
 دھرمے نے بابرام کی طرف مسکرا کر کہا ”اپنے بابرام نے اپیل پر دستخط نہیں کئے۔“
 ”کیوں بابرام؟“ جسوت نے پوچھا۔

اب ہر شخص بابرام کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بابرام کے لئے ان کی محابوں سے پہنچا جانے میں ہر گھبراہٹ
 پہلے تو اس نے اپنے ہاتھ اپنی جیب کی طرف کرتے گویا وہ خود نہیں اس کے ہاتھ مجرم تھے۔ جنہوں نے اس
 (ہیں) پر دستخط نہیں کئے تھے۔ پھر اس نے دایاں پاؤں اٹھا کر انہیں پاؤں پر رکھا اور جب اس سے کبھی کام
 نہ بنا تو یکایک نیتے میں بولا ”میری بھرم میں نہیں آتا کہ انہیں کرک کو جنگ یا امن کے سوال سے کیا حق ہے
 میرے لئے آنا جانا ہی کافی ہے کہ وہ اور دو چار روپے ہوتے ہیں۔“

دھرمے نے کہا ”کبھی کبھی دو اور دو چار پائی بھی ہوتے ہیں۔“ منجیت سنگھ نے بابرام کے
 لہجے میں بائیں اس کی نقل کرتے اس طرح کہا کہ سب کو سنہی آگئی۔

جسوت بولا ”اور دو اور دو چار کم بھی ہوتے ہیں۔ اور اگر ان چاروں میں سے ایک کم ایشم یا

بائیں دو من بم کا ہوا تو تم اور تمہارا یہ کارخانہ اور چراغ اور غصہ سے شہر کبھی ایک لمحہ میں ناپا ہو جائے گا۔

بابر نام نے فستے سے کہا "ہو جائے مجھے کیا۔ میں تو اس کی مٹری بدبو دار سبزی میں۔"

مگر وہ اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔ اس کی آنکھیں بچا اختیار کی کے سوسے پر گھوم گئیں اور اس نے زندہ سے سانس اندھ کھینچی کو خیر ترے پر بیٹھے ہوئے دوسرے رنگ بھی اسی طرف دیکھنے لگے بعد میں بابر نام دیکھ رہا تھا۔

مٹی کے سوسے پر سے دو لڑکیاں چلی آ رہی تھیں۔ ابن جستم، بک خوام، شفق کے قاتل بلوروں کے پرے کے پرے ان کے پس منظر میں تھے جن سے ان کی ساڑیوں کے رنگ اور بھی بکھر گئے تھے اور ان کے سر کے گرد سرخ روشنی کے ہالے سے گھومتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ وہ اس دنیا، کم از کم اس مٹی کی مخلوق معلوم نہ ہوتی تھیں۔ ان کے روشن چہرے۔ ان کی سفید بھڑی ہنسی نضا میں ایک، سفید ناخت کی طرح ڈھونڈی ہوتی۔ اور جب وہ چوتھے کے قریب تھے آدمیوں کو دیکھ کر خشک گئیں تو مٹی کے چھوٹے چھوٹے جوڑوں میں ان کی ساڑیوں کے رنگ قوس و قزح کی طرح پھیل گئے۔ بچا ایک ایک لے کے تھے وہ ہم ہی گئیں۔ پھر ان میں سے ایک نے جھومری سے زیادہ ہر شیداء معلوم ہوتی تھی اپنی داغی داغی ہلکیں چپے کے پرچا "جو نمبر کی جھونپڑی کون سی ہے؟"

ایک لمحے کے لئے اٹا ہر ایک صدی کے لئے کسی نے جواب نہ دیا۔ پھر منانے آہستہ سے کہاں میری جھونپڑی ہے چار نمبر کی۔ اس سے آگے دانی کا نمبر ہانکا ہے۔ اس سے آگے کی جھونپڑی جو نمبر کی ہے۔

مہلے ہوئے قدم بڑھاتے ہوئے چوتھے کے قریب سے بدن چراتے ہوئے وہ دونوں لڑکیاں ساڑی بٹھلاتے ہوئے آگے چلی گئیں۔

وہ لڑکی جس نے سوال پر چپا تھا اس کے بالوں میں بابر نام نے دیکھا گلاب کا ایک پھول نکلا ہوا تھا۔ کتنا عرصہ۔ کتنا عرصہ ہوا اس نے گلاب کا پھول نہیں دیکھا تھا۔ ایک بے نام ہی ہیک

اس کے خنوں میں بھر گئی اور وہ سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔

جسوت نے اپنی سخا میں لڑکیوں کی طرف سے پھر لیں اور بابرام کے چہرے پر لڑویں۔ وہ
لہا لہاں صان رہتا ہے وہاں خوب صورتی بھی ہوتی ہے۔ چاہے وہ یہ لگی مڑی کئی کیوں نہ ہو۔

بابرام لا جواب ہو گیا۔ اس نے جسوت کی طرف ہاتھ بڑھا کے کہا "وہ کاغذ بچے دو۔ میں
دھنسا کر دیتا ہوں۔"

اور کسی نے نہیں پہچانا تھا لیکن حکم نے پہچان لیا تھا۔ ان میں ایک رضیہ تھی، اور دوسری
جس نے سوال پر چپا تھا وہ رضیہ تھی۔ جیسا کہ بعد میں اکرم کو معلوم ہوا رضیہ کی حالت اچھی نہ تھی۔ رضیہ
اس کی مدد کر رہی تھی۔ مگر پھر بھی کب تک کوئی کسی کی مدد کر سکتا ہے اس زمانے میں؟ رضیہ نے ہنسنے لگا
کا کرو چھوڑ کر ہاں بستی میں چھوڑ کر ہی کہہ دے کہ ہاں بستی میں، اور اب یہاں اپنی اماں اور اپنی مرحوم
بہن کے پانچ بچوں کو لے کر آئی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ رضیہ کو ساتھ لے کے چھوڑ دی دیکھنے کے لئے
آئی تھی۔

بستی میں ایسی خوب صحبت عورتیں، ایسی خوب ساتریاں، ایسے خوبصورت لڑکے کو
کسی نے دیکھے تھے۔ وہ لڑکیاں صدیوں کے پہلے خواب کی طرح اچانک اس بستی میں نمودار ہوئی تھیں۔
اور کسی کو قہقہے نہیں آتا تھا۔ وہ لوگ بدبو، مٹاؤ، بد صورتی، کینگی، تنگ نظری اور جھج و جھج سے اس قدر
انوس ہو چکے تھے کہ ایک مکشمن چہرہ، ایک صاف تھری سازی، گلاب کا ہنکا ہوا پھول بھی ان کے
لئے اجنبی تھا۔ ایک ایسا خوبصورت لڑکا جو شاید پر یوں کی دنیا سے آیا تھا۔

تنگ و صغیر گتے، غلیظ اور شرم پھاتے ہوئے بچے، لانے لانے بال کھولی ہوئی عورتیں،
لٹکے ہوئے پٹاؤں سے رہیں رہیں کرتے ہوئے بچوں کو درود چاتی ہوئی جوق جوق چوبیس بج رہی تھی
کے سامنے آ کے کھڑی ہوئی گئیں۔

یہ خوب صورتی ناقابل یقین تھی۔ یہ لوگ اس زمین کا نہیں شفق کے رنگیں آسمان کا کھڑا تھا۔
 بہت دیر تک لوگ کھڑے دیکھتے رہے۔ دیر تک رضیہ اندھیری جھونپڑی میں رضیہ کے ساتھ
 کھڑی اس کی دیواروں اور چیمبروں کو دیکھتی رہی۔ مگر وہاں دیکھنے کی چیز ہی کیا تھی۔ یہاں آٹھ روپے کرایہ
 تھا۔ ہینڈی بازلی کی کھولی کاشائیں روپے کرایہ تھا۔ فیصل پہلے ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر دیکھنے اور سوچنے
 کے بعد رضیہ اور رضیہ ہولے ہولے جھونپڑی سے علی گئی میں سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئیں، ساڑی اٹاکر
 جو جڑوں سے جکتی ہوئیں، اپنے خوشنایندوں سے ٹپ ٹپ کرتی ہوئیں گی کے سرے پر جدھر سے آئی
 تھیں اودھر غائب ہو گئیں۔

یہ سب کچھ اٹا اچانک، اتنا عجیب اور غری طریقے سے ہوا کہ سبھی کو باور نہ ہوتا تھا کہ ابھی
 یہاں چند لمبے پہلے خوب صورتی آئی تھی۔ جس نے اُترنا تھا، گلاب بھٹا تھا، نسا جگمگاتی تھی۔
 یہاں تو کوئی نہ آیا تھا۔

وہی تنگ و تاریک گلی تھی۔ وہی اس کے بد نما جوڑے تھے۔ وہی رنگ آلود دیواریں۔ وہی بد نما
 وہی پڑا ہوا سنانا۔ یہاں ایک گلی کے دوسرے سرے پر ایک آدمی اپنی بڑی کندھ زدہ سچے پٹنے کا
 اکرم کے سارے بدن میں ٹبر ٹبر ہی آئی۔ اس نے گھبر کر آسمان کی طرف دیکھا۔ مگر آسمان پر بھی شفق غائب ہو چکی
 تھی۔ آسمان پر صرف باران کی سیاہ رنگہ باقی رہ گئی تھی۔ اتنے میں جتنا اپنے کا پتہ چلے ہوئے انھوں نے لاٹھیاں
 روشن کئے آئی اور فضل نے لائیں اس کے اتارے کے نیم کے پیر پر لٹا دی۔ روشنی کا ایک ادا سا
 جھونپڑے پر پڑنے کا۔ جو لوگ اب تک خاموش تھے۔ دیرے دیرے باتیں کرنے لگے۔ آؤ۔ روشنی آؤ۔
 کہیں سے آؤ۔

اتوار کو غم سٹوڈیو تو بند نہیں ہوتے تھے لیکن فلم کمپنیوں کے دفتر ضرور بند ہوتے تھے۔ اداکار
 نہیں ہوتے تھے تو ان کمپنیوں کے جن کی شروعات میں روز کسی مشورہ میں جادی ہوتی لیکن ذمہ داریت پر خط کشن
 سہارن شوننگ ہرن ہر میٹر کٹا رہتا تھا۔ صرف باہر کا دکان فوٹو ساجندہ کھدیا جاتا۔ اندہاں میں دو بڑی بڑی
 بیڑوں پر بڑے زبردستی پتی تھی۔ میڈم نازیل الگ تھا۔ بیڑہ باغلیہ سا لگتا تھا۔ میڈم کی ٹیبل پر کانا آنا
 پرائیٹ کی گیم ہوتی تھی۔ بیڑہ باغلیہ کے ٹیبل پر شہر کے بڑے بڑے سٹا باز آتے تھے۔ مکان آنا پرائیٹ کر
 کیا خاطر میں لاتے۔ دو دو پے پرائیٹ تک تو وہ کرکٹ کلب کہنا لڑیا میں کھیل سکتے تھے۔ اس نے بیڑہ
 پہنچانے اپنی ٹیبل پر پانچ عدد پر پرائیٹ کی گیم رکھی تھی۔ بلکہ کچھ تو فرم آتے۔ اس کا روزی نتیجہ ہر اتوار
 عرصہ چلے وہ لاکھوں کھانے والی میرٹھ میں کیوں نہ ہوں۔ کبھی بیڑہ کے ٹیبل پر نہ کھیتی تھیں۔ وہ میڈم
 کے ٹیبل پر ہاتھ لے کے بیٹھ جاتیں اداکار کے ساتھ دوسرے بیڑے بڑے اداکار اسٹوڈیو جاتی مٹانے والے
 داریت کار کبھی کبھار شاہی ہر جاتے۔ دلی گیادہ جیکے دن سے شروع ہوتی اصلات کے گیارہ بجے سے پہلے
 ختم نہ ہوتی۔ نیچے میں دو ہر ہر کا کانا۔ شام کی چائے۔ رات کی دہائی اداکار کانا سب ہی کچھ پلا۔ ساری خندہ عرصہ
 کے سگرٹوں اداکار کی بڑے سسر ہر جاتی۔ آج بھی صرف تاش کے چرن پگڑی نہیں۔ کھانا پھانے۔ دہائی

مگر بے صبرت انہوں کے خدیجے ہونٹوں تک پہنچتے تھے۔ انہیں اس وقت ایسے سالوں میں باطل ہے کہ انہیں وہ شراب کا رنگ دیکھ سکتی تھیں۔ مگر بے صبرت کا بلائے نہ چاہتی کی صورت وہ صحت آتش کے پتے دیکھ سکتی تھیں۔

ایسے موقع پر اکرم کا شافی ہوا کی اہل لے کر پہنچا جانا ایک اذیت نگ بہت سے کم نہ تھا۔ بہت سے لوگوں نے بڑا املا۔ مگر وہ تاش کے تھریں میں اس قدر دھنک تھے کہ اس وقت انہوں نے غامضی سے اس اہل پر دستہ کر دینا ہی سب سے اچھا سمجھا۔ مگر کوئی دوسرا وقت ہوتا تو وہ خوب اکرم پر جرح کرتے۔ اس سے سوال پر پہنچتے۔ اور اکرم خود ہی سوچ کے آیا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ تھاکر سوال در جواب ہوں، مگر تھک گئیوں نہ گئے۔ بہت میں موصوفہ کھل کر سامنے آئے۔ اہل طرح ہوش کے بعد وہ لوگ دستہ کریں۔ اس بعد وایک بار اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے کی کوشش بھی کی۔ مگر تاش کھیلنے والے دی کے رہا کہیں اس وقت یا سب کی بات نئے والے تھے۔ ہاں۔ ہاں! ٹھیک ہے کہ کردہ جلدی سے دستہ کر کے اپنا بیجا بھڑاتے گئے۔ اکرم بہت افسوس ہوا۔ اسے اس بات کی امید تھی کہ حالات یہ صحت اختیار کریں گے۔ یہ ایک اس کا بھی چاہا کہ وہ مزید دستہ حاصل کرنا بند کر دے اور اس معاملے کو بھر کسی دوسرے ہدف کے لئے ٹال دے۔ مگر مصیبت تو یہ تھی کہ اسے اتوار کے ہدف کے طاق اور کسی دن پہنچی نہ ملتی تھی۔ صحت اتوار کو ڈاک فنانڈ ہوتا تھا۔ اور اتوار کو یہاں ہر روز سیٹھ باکڑیا کے دفتر میں دی ہوتی تھی۔ اور یہی ایک جگہ تھی جہاں انڈسٹری کے تقریباً سب بڑے بڑے اداکار اکٹھے مل جاتے تھے۔ وہ دایوس ہوکے اہل کردہ کر کے اپنی جیب میں رکھنے کا سوچ رہا تھا کہ اتنے میں حالات نے پٹا لگایا اور سیٹھ باکڑیا نے تاش کے پتے میز پر نہ دے پیسنگ کر اہل پر دستہ کرنے سے انکار کر دیا۔

”میں کہتا ہوں۔“ سیٹھ باکڑیا میز پر نکال دے کہ بولے میں سے جگہ ہراندہ بہتر ہے۔“

ہر شخص سیٹھ باکڑیا کی طرف دیکھنے لگا۔ نظم انڈسٹری کا میر تریں سیٹھ اس وقت یا سب مامو پر اپنی لمبے صبرناک سرفراز گھبراہٹ تھا۔ ہر شخص نے اپنے پتے میز پر ہوکے دئے اور فور سے سیٹھ باکڑیا کی طرف

سیٹ بگت لال نے کہا "اس سالے میں میں کرم کا ہم خیال ہوں۔ جنگ کے خانے میں لپٹا ہوا ہوں۔
 نے ہم ڈسٹری پر ٹروں کا خون پڑا ہے۔ کتنے ہی ڈسٹری پر جنگ میں دھلائے ہو گئے۔"

سیٹ ٹرنپنڈ نے کہا "ہاں یہ تو جیسے ہے۔"

اکرم نے کہا "دو کے مخالف دو۔"

راجہ بولی "کوئی بڑی جنگ بڑی چیز ہے۔ میں نے وہ طوائف ترضیں دیکھی ہیں میرا خاندان بہت جلا ہے
 ہر ہفتہ کبھی۔ کبھی سر ٹینکل ہر جاتی ہے۔ بڑی طاہیات چیز ہے یہ لڑائی۔"

شٹار بولی "جیسے ناخوش زندگی پسند ہے۔ مجھے یاد ہے جب جاپانیوں کے کم نکلتے پر گئے تھے
 قریب بچی سے بھاگنے کی سوجھ بوجھ تھی۔ یہ جگہ ہے۔ جنگ میں سیری لاساری کی قیمت بہت بڑی تھی۔ میں نے بچی
 میں کئی بڈھیں بھی خریدیں۔ مگر جن دونوں نکلتے میں کم پڑے۔ ان دونوں میں سوجھ بوجھ تھی۔ سیری اس جانتا دیکھا جگا
 سنتی ہیں، آج کل ایسا ایسے کم بن رہے ہیں۔ راجہ ٹوٹی بتا رہی تھی مجھے ایک کم بننے سے سلا شہر تک سے
 اڑتا ہے۔ ناں ناں باگلو یا سیٹ لاکھوں روپیہ کمانے کا کیا نامہ اگر آدمی زندہ ہی نہ رہے۔"
 "پتا کرم ہے کہا۔"

پیرا کرم حدوازے پر کھڑے ہو کر چھوٹی کی طرف مڑا اور اس سے کہنے لگا "ہٹو کے؟ تم بھی
 یکو کو گئے۔"

پٹھ کے نے اپنے بڑے بڑے دانت باہر نکال دیے۔ بولا "میں غریب آدمی ہوں۔ میں کیا
 بولوں گا۔"

"نہیں۔ نہیں۔" اکرم نے کہا "ایسے موقعوں پر غریب آدمی ہی کو زیادہ بولنا چاہئے۔"

پٹھ کے چپ رہا اور خاموشی سے باگلو یا سیٹ میں اپنے ہاتھ کی طرف دیکھنے لگا۔

سیٹ باگلو نے سکوڑ کے کہا "ہاں ہاں! بھئی۔ آج کل اشتراکیت کا زمانہ ہے۔ ہادی حکومت بھی

اشترک ہو رہی ہے۔ تم بھی کمرہ نشین پڑھو کے !

پڑھ کے کامیاب اس منزے سُرخ ہو گیا مگر اس نے اپنے آپ پر تباہی پائی کہتے ہوئے اب آپ اتنے عقل مندری بیٹھے ہیں میں ایک ماہل گنوا کر ان کیا کہوں۔ جنگ میں وہ لوگ میرے طرف بڑے بہانوں کو فرج میں مذہب و سستی بھرتی کر کے لے گئے۔ بلا بہائی تو لدا گیا۔ جھوٹا بہائی ادا ہو گیا۔ میں مگر ان کے باگ کر رہا ہوں نہ آقا تو شاید اس وقت یہ بات کہنے کے لئے زندہ بھی نہ ہوتا ؟

”کون سی بات ؟“ سیٹھ پاگل نے پوچھا۔

”آدمی مدھے کے بغیر زندہ نہ نکلتا ہے۔ زندگی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔“

پڑھ کے آٹھ گھنٹے کے غامض ہونے لگا۔ سارے ہاں میں مٹا لٹا ہوا گیا۔ ہاں میں بیٹھے ہوئے آتش کیلئے دل سے نکلنے لگے۔ سر پہ بھی نہ تھا کہ سہولت آن پڑے گا، ان کے آگیا ہوا چہرے ایسی موجود ہو چکے ہوتے تھے۔

اکرم نے کہا : ”پانچ ! اللہ کوئی بات کرے گا ؟“

میڈم بولی : ”تم نے سیٹھ کی دو کھوں مدھے والی بات کا جواب نہیں دیا ہے۔“

اکرم نے کہا : ”پڑھ کے نہ جواب دے دیا ہے۔ میں اس سے بہتر جواب نہیں دے سکتا لیکن میں ایک سوال ضرور سیٹھ سے پوچھنا چاہوں گا۔ یہ جو انھوں نے مدھے بیٹھنے کے لئے کہا یہ آسمان سے اتارے ہیں ؟ کیا یہ سیٹھ نے لونی ٹکڑی کھول رکھی ہے ؟ کہاں سے آئے ہیں ؟ آخر کسی نے موت کی ہونٹ کسی نے کھیت میں ہی پلایا ہو گا۔ کسی نے گھر خانے میں پکڑا ہوا ہو گا۔ کسی نے بیٹے میں لٹس لٹائی ہو گی۔ کسی نے دفتر میں صبح سے شام تک کام کیا ہو گا اور پھر دس دس آنے کر کے نیوا گھٹ خرچ ہو گا۔ کیا یہ صحیح ہے کہ پبلک کا آٹھ گھنٹہ کی آدمی کی قہوری میں آکر بند ہو جائے۔ ایک لاکھ آدمی بھر کے رہیں اور ایک آدمی کے پاس ایک لاکھ مدھیہ کاٹھا ہو جائے۔ میڈم کیا آپ نہیں دیکھ سکتیں کہ سیٹھ اس نے جنگ

پاتے میں جا کر آرام سے ٹانھوں کے انگوٹھوں کی دھڑکیوں کی ایک لڑکیٹ کر لیں۔
 میڈم بولی " تو تم کہتے ہو کہ سید کو جنگ نے فائدہ پہنچایا ہے۔"
 " ہاں! " اکرم نے اقرار کیا۔

میڈم فتح خندانہ ہو کر بولی " تو تو میرے دشمنوں کو دے دے اس وقت ہی کے دشمن میں
 دشمن کر کے تھے۔ میرا دیا جان پتوں میں تھا۔"

اکرم نے میڈم کے دشمن پر سیاہی کی کیر میری پر اس نے میز پر پٹھے ہوئے دوسرے لوگوں سے
 سکرانے کہا " اس کوئی اپنا دشمن واپس لینا چاہتا ہے۔"
 کوئی نہیں بولا۔

اکرم نے ساخنہ کر کے صوبہ میں رکھ لیا۔ پھر سید کی طرف رخ کر کے بولا " سید میں پھر آؤں گا تباہی پاس
 کہوں کہ مجھے یقین ہے کہ تم میرے ساخنہ پر ہتھ مارو گے۔"
 " کیوں؟ "

" کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ یہ وہ ساخنہ کا کھڑا ہے جو امیر اور غریب۔ نیک اور بد فرشتے اور شیطان
 دونوں کو اپنی زندگی گزارنے۔ اپنی قسمت آزمانے اور اپنے اپنے انجام تک پہنچنے کا موقع دیتا ہے۔ جس طرح
 کامی اور انجام ہو۔ اس سے بھی غرض نہیں۔ لیکن جو جنگ سامنے نظر آ رہی ہے۔ اور جیسے دکائی ہے وہ
 امیر اور غریب۔ نیک اور بد فرشتے اور شیطان میں کوئی امتیاز نظر نہیں رکھے گی۔ ہم سب قریا میں گئے۔ مجھے
 سب بات کامی یقین ہے کہ اگلی جنگ میں تم انگوٹھوں بھی کاٹ سکو گے۔ جگر پھل دیو جگوں میں جو انگوٹھ تم نے کٹائے
 ہیں وہ بھی ہاتھ سے کھود گئے۔ یا کہ وہ اس کی ہیر و شیا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا ہو اس طرح کہ مرے ہوئے۔ کوئی
 نہیں کہہ سکتا سید۔ ایک دن یہ سب بھی انگوٹھوں کی پیر و شیا سے ڈال دیے جانے۔ ایک ہمارے تباہی ساری
 بڑھ جائیں اور سارے شہزادوں ایک لمحے میں ختم! "

” اعلان کے ساتھ تم بھی “

” اس نے میں تم سے کہتا ہوں سیٹھ۔ میں پھر آؤں گا۔ اور پھر آؤں گا۔ کیوں کہ اس جیل پر مجھے تھامے آئے
ہو، بد معاش، ایک مار کئے اور تنگ کے بھی دستخط نظر میں “

باکڑیا نے ہنستے ہوئے سیٹھ بگت لال کو کہنی مار کے کہا ” سنئے ہو۔ سلا بجے کیسے کیسے غلاب سے
نوازا ہے۔ بس ایک اس کو میں نے چھوٹ دے رکھی ہے “
” کیوں “ سیٹھ بگت لال نے آندوہ ہو کے پوچھا۔

” مسلم نہیں کیوں؟ شاید کبھی کبھی دوسرے کے سونہ سے اپنے متعلق کچھ سنا اچھا مسلم ہوتا
ہے “ باکڑیا نے اقرار کیا اور پھر اس نے نوا کر جاتے ہوئے اکرم کو آواز دے کے کہا ” اکرم! دھڑاکم بہت
شاید تو ٹھیک کہتا ہے۔ اگلی جنگ میں کچھ نہیں بچے گا میرے سنئے۔ بتا کہاں دستخط کروں؟ “

جب اکرم کا غریب میں ڈال کے باہر کی طرف چلا تو خشنا نے راج کے کان میں سرگوشی کرتے
ہوئے کہا ” اے مجھے بڑا چھانگتا ہے یہ اکرم جب بات کرنا تھا تو کیسے معصوم بھولا سا لگ رہا تھا اسکا پتلا پیلا
بالوں کسی آئرش پوڈل کی طرح — آئرش کتے کیسے بہت پیارے لگتے ہیں نا! “

راج نے دے لے لے لے لے میں اسے جواب دیا ” کہو تو اسے پیغام بھیج دوں کہ تم کسی کو بہت پیارے
مسلم ہوتے ہو “

خشنا نے آہ بھر کے کہا ” نہیں۔ بانی۔ وہ اس مشرت کے واقعے کے بعد دلاوی اماں بہت
متلا ہو گئی ہیں۔ میرا خیال ہے میں ایک آئرش پوڈل ہی خرید لوں گی “

دوب اکرم ہال سے باہر آیا تو اسے اوموے ملا جو دروازے کے پیچھے کھڑا کھڑا یہ سب تنگوشیں رہا
تھا اس نے بڑی جبر سے اکرم کی طرف دیکھ کے کہا ” تم نے اسے ایسی کھری کھری سنائیں کہ میرا زونیاں
تھا، وہ تمہیں کھڑے کھڑے کھلائے گا “

اکرم نے کہا: ”اگر میں اے کمری کمری زشتا تو وہ کبھی دستخط نہ کرتا۔ میں اے خوب جانتا ہوں۔“
 ستیا دت نے اس کی پیڑ پر چھکی دے کے کہا: ”واہ اے میرے شیر، جھنڈے گاڑ دے تو نے
 آج۔ تو نے جھنڈا ہالیسے اٹھایا اور ایشیا پر گاڑ دیا۔ کیسے تو نے اس سٹیٹ کو رکھا، باندھا، تانا بکھینچا اور
 ہر کھینچ کے چھوڑ دیا کہ جاڑ بیٹا نکلے رہو۔“

میں بیت تنگہ نے پوچھا: ”اچھا اب کہاں چلیں گے؟“
 اکرم نے کہا: ”قرب ہی راج محل ملو ڈیو ہے۔ دیکھیں وہاں اگر کسی کی شوٹنگ ہو رہی ہوگی تو
 دستخط کرالیں گے۔“

اکرم جس وقت راج محل سٹوڈیو میں اپنے ساتھیوں کو لے کر پہنچا، اُس وقت جوشی جی کی کچر کی ٹرنگ بھڑکی تھی۔ مگر اُس وقت اتفاق سے ٹرنگ بند تھی۔ کیوں کہ جوشی جی اللہ سوش پرانچے ایک لائٹ میں کے درمیان جھکڑا چل رہا تھا۔ بڑی معمولی سی بات تھی۔ جوشی جی نے سیٹ پر ایک ناچنے والی لڑکی روفی کا بوسہ لے لیا تھا اور اس قسم کی چھوٹی موٹی حرکتیں سٹوڈیو میں اکثر ہو جایا کرتی تھیں اللہ لوگ عام طور سے اس طرف سے آنکھ بند کر کے کام کرتے تھے مگر آج سوش پرانچے بگڑ بیٹھا تھا۔ ایک معمولی لائٹ میں تھا۔ روفی کا عاشق بھی نہ تھا۔ پھر اُسے نیچے میں بولنے کا کیا حق تھا۔

جوشی جی برہم ہو رہے تھے "سلاؤ دنگے کا آدمی۔ ہم پر رباب کرتا ہے۔" جوشی جی نے بھیتا زبان میں کہا۔

سوش پرانچے نے کہا "سلاؤ دنگے کا ہر پادریکے کام کا اس سے کیا۔ ہم تم کو بتا رہے۔ تم ناگزیر رہے۔ آؤ سیٹ پر شرف سے کام کرو۔ سلاؤ دنگے کوئی ہان پل کا کرتا نہیں ہے۔"

"یہ روفی تمہاری ماں گنتی ہے؟" جوشی جی نے غصے سے پوچھا۔

سوش پرانچے بولا "یہ نہ ہماری ماں ہے۔ نہ بہن نہ دوست۔ ہماری کچر بھی نہیں ہے۔ کچر کی عورت

تو ہے۔ موت کی جنت کتنا سنگنا ہم کو۔

”بڑا آیا قریح کرنے والا۔ سارے گریہ جیسے بوسہ دیتی ہے توڑیچ میں بڑم مارنے والا کون ہوتا ہے۔“

”سوال مری کا نہیں ہے۔ سوال سوال کا ہے؟ کل کو یہ قہار سے ماقہ سیٹ پر سونے کے لئے تیار

ہو جانے لگی تھی کہ اس کی اجازت دیں گے؟ کبھی نہیں“ سوڈیش پرائیجے نے بڑی مضبوطی سے اشار

میں سر دیا۔

”تم کون ہوتے ہو حکم دینے والے“ جوشی جی نے اپنی ٹھوڑی آگے بڑھا کر رہا۔ اس کی نیوٹے

کی سی آنکھوں میں غصے کی ہری دھند گئیں۔ ”میں اس سیٹ کا ڈائریکٹر ہوں جو جاہلوں کو سکنا ہوں، جیسے جاہلوں

کاں سے پکڑ کر باہر نکال سکتا ہوں۔ گٹ آؤٹ یو بلیڈی سوانن!“ جوشی جی نے انگریزی میں کہا۔

”یو بلیڈی ڈنگ!“ سوڈیش پرائیجے نے بھی اسی جیسے میں رنگ بترکی جواب دیا۔

جوشی جی ادا ران کا اسٹنٹ بٹا پلیر اور دوسرے رنگ حیرت میں رہ گئے۔ ایک انٹ میں انگریزی

بول رہا تھا ان کے بار کی انگریزی۔ جوشی جی نے ایک نئی نظر سے سوڈیش پرائیجے کی طرف دیکھا۔ سوڈیش پرائیجے

ایک نئی نیکر خاکی قمیض پہنے اپنی جگہ پر غاصحوش کھڑا تھا۔ اگر نہ اس کی گھنی سموزوں کے نیچے کی مدھنی آنکھوں

کو دیکھا۔ اُس کے اُچھے ہونے موٹھی رخساروں کے نیچے کے مضبوط جڑے کو دیکھا۔ گردن کے نیچے کے مضبوط

صندھی جنم کو دیکھا۔ سوڈیش پرائیجے کا رنگ کھڑا ہو گئی تھی جواب غصے سے گرا سر نہا ہوا تھا۔ مگر کرم دیکھو رہا

تھا کہ سوڈیش اپنے آپ پر تار پانے کی بہت کوشش کر رہا تھا۔

جوشی جی بولے ”میں بلور ایک ڈائریکٹر کے نہیں حکم دیتا ہوں۔ سیٹ سے باہر چلے جاؤ“

سوڈیش پرائیجے ایک لمبے کے تے رہا۔ پھر گوم کر سینے سے باہر نکلیا۔

جوشی جی نے کیو میں سے کہا ”اؤٹ ٹکس کو جلدی سے“

کیو میں اندر سے چٹایا۔ وہ سولہ ادھر لڑا۔ بے بی ادھر کو کھڑا تو۔ جانتا تھا وہاں ٹکس کو۔“

مگر کسی لائٹ میں نے کرومین کی ہدایات پر عمل نہیں کیا اور سب لوگ سر جھکائے دشتیوں کے پاس سے کھٹک آنے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سیٹ کے باہر چلے گئے۔ شوٹنگ بند ہو گئی۔

رضیا اور رضیہ، رضی، سلوچا، ماریا، ولزبا اور دوسری نانچنے والی لڑکیاں اور ان کا استاد ابراہام سب حیرت سے کٹرے کے کٹرے رہ گئے۔ ————— بجایک رضیہ کو معلوم ہوا کہ شوٹاریں میں مرکزی فرد خود ڈاکٹر کٹر نہیں ہوتا ہے۔ ایک معمولی لائٹ میں ہوتا ہے جو دن رات شوٹاریوں کی مدد شایاں اور مرے اور مرے اور مرے اور مرے جاتا ہے۔ وہ اگر چاہے تو ایک منٹ میں شوٹاریوں کو بے بس کر سکتا ہے۔

دوسرے خود مزدور تھا اس نے آئے اس واقعے میں بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ————— منجے بڑا ایک کتے باہر جہاں سولشیں پانچپہلے اور دوسرے اس کے لائٹ میں ساتھی کٹرے تھے، خود اپنا قاتل کرانے کے لئے پہلا مکیا اور ان سب سے آپس میں تھیل سے پہنچنے لگا۔

سولشیں پانچپہلے کہنے لگا: "ایک تو قریباً ایک چھار نہیں مٹی ہے۔ دوسرے ہم لوگ ان کی رنڈی باہی بھی رکھیں۔ نہیں چلیگا!" سولشیں پانچپہلے بڑی مضبوطی سے سر دیا۔ "ہم کو ان کی پریزیڈنٹ لائٹ سے کوئی گتہ نہیں ہے۔ مگر یہ اور مر سیٹ پر آم کراپی پرائیڈنٹ لائٹ نہیں دکھا سکتے۔ نہیں چلیگا" اس نے پریزیڈنٹ سے سر دیا۔

"سارہ بکٹ!" دوسرا لائٹ میں ہوا۔ "میں مائے کا سر تو لٹا رہا، ڈاکا آپس کا ڈاکٹر کٹر" سولشیں مڑی سے ہوا۔ "سر قتلے سے کام نہیں چلیگا۔ سیٹ پر پہنچندہ، رخصتا بند ہونا چاہئے۔ بس!"

دوسرے نے پوچھا "کیا تہاری یونین ہے؟" "ہاں" دوسرا لائٹ میں ہوا۔ "آگیا۔ جی کی یونین ہے۔ پہلا سولشیں اشس کا داس پریزیڈنٹ ہے۔"

دوسرے انٹ میں نے بڑے فخر سے سودیش کی طرٹ دیکھ کے کہا۔ اکرم نے سودیش سے ہاتھ ہٹا دیا۔
 ”تم نے بہت اچھا کام کیا۔ ان لڑکیوں کی بہت بڑی حالت تھی۔“
 سودیش ذرا سا مسکرایا۔

لٹنے میں ان لوگوں نے دیکھا کہ کرنے کے ایک اپ درم سے بہت سی لڑکیاں بچھیں اور دوسرے
 دوسرے ان کی طرٹ آئی تھیں۔ ہر مرد لڑکیوں کو کھڑے تھے۔ بہت سی لڑکیاں جواب سمجھ کر رہی تھیں اور ایک
 دوسرے کو فہرہ کا دے کے آگے چلنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ یا ایک دوسرے کے پیچھے ہو کے ہنسنے کی کوشش
 کر رہی تھیں۔ جیسے لڑکیاں ایسے موقعوں پر اکثر کیا کرتی ہیں۔ رضیاء رضیہ ان سب میں آگے تھیں۔ رضیہ
 بولی ”آپ نے اس وقت بہت اچھا کیا۔“

رضیہ بولی ”آپ ہمارے لئے کھڑے ہو گئے ملا کر ہیں خود یہ لڑائی لڑائی چاہئے تھی میں تو ان لڑکیوں
 کو دکھ بھاتی مہل گرا ہی ہرمل ہیں۔!“

معدی محبوب ہی ایک کرنے میں لکڑی تھی اب وہ ہت کر کے آگے آئی۔ اس نے سودیش سے ہاتھ ہٹا دیا
 مگر کچھ کہا نہیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

سودیش نے کہا ”تم جاری رہیں ہوا جاری ہی طرٹ منہ ہو۔ ہماری ہی طرٹ دلہنات خزا پسینہ
 ایک کر کے نکال دینے والے اچوں میں کام کر کے اپنی مدد کی تھی ہر اس کے اوپر سے اگر کوئی تہا رہی ہے جتنی کہے
 تو تم کو خود مع کرنا چاہئے۔ ایسا بھی کیا؟“ سودیش کے لہجے میں بڑی شکایت تھی۔

رضیہ نے اس کے بازو کو ہموار سے کہا ”اب کے ایسا ہی ہوگا۔ ہماری آنکھیں کل گئی ہیں۔ ہم
 نے دیکھ دیا کہ اکیلی اکیلی الگ الگ رہنے سے دوسروں کی شرافت پر مجبور کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ ہم نے ابھی
 میک آپ نام میں اپنی یونین بنائی ہے اور رضیہ کو اپنا سرٹری بھی بن دیا ہے۔ اور اب ہم یہاں کوئی ایسی شرافت
 ہوگ سب کی سب کھانڈ کر جائیں گی۔“

”بس!“

سوریش مسکرانے لگا۔ اس نے رضیہ سے کہا ”جس سٹوڈیو میں تم سے کوئی گلا بڑھ کرنے کی کوشش کرے، مجھ سے کہو۔ وہاں کے کسی بھی لائٹ مین سے کہو۔ سالے ہم سٹوڈیو میں پڑتال کرادیں گے مگر یہ بد ساشی نہیں چنے دیں گے! نہیں چلیگا! کتم!!“

اکرم کو سوریش کا ”کتم“ بہت پسند آیا۔ اس نے سوریش سے پوچھا ”تم کہاں رہتے ہو؟“
 ”ہم کاندے کی جھونپڑیوں میں۔“ سوریش نے اسے بتایا۔

”پڑے کئے سلوم ہوتے ہو۔“

سوریش پُپ ہوا۔

اس کے ایک ساتھی نے ٹوٹے فخر سے اکرم کو بتایا ”ہلا سوریش بڑک تک پڑ ملے ہے۔“

اتنے میں رضیہ نے کہا ”ہلو لڑکیو بیک آپ! درد۔ مگر میں۔ توڑے دوسے میں یہ خبر دارے سٹوڈیو میں پہیل گئی کہ صرف لائٹ مینوں نے بلکہ ناچنے والی لڑکیوں نے بھی پڑتال کر دی ہے۔ جوشی جی کا اسٹنڈ بننا چاہیہ دوتہ تاوتہ! ان کے پاس آیا۔ اپنے ہوئے ہوا۔“ رضیہ ہوائی۔ کیا گب کر ہی ہو۔ سیٹ کا پڑا ہے۔ آج ہم ختم ہو تو میرا گونا پڑے گا۔ دس بجنا کا نقصان ہو جائے گا۔“

”ہم سے کیا کہتے ہو۔ اپنے اس باڈی مائی بے جوشی گئے ہو کہ آپ کو ہلدی لڑکی کو پیڑا تھا۔“

”رضیہ ہوائی۔ آپ کی جانے دو۔ جوشی دل میں بہت غرضہ ہیں۔“

رضیہ نے اپنی اٹھیاں نہاتے ہوئے کہا ”دل میں غرضہ، جو نے سے کلام نہیں چلے گا۔ سب کے سامنے سمانی اٹھنی پڑے گی۔ سیٹ پر جتنے آدمی موجود تھے جن کے سامنے جوشی جی نے یہ بڑی حرکت کی ان سب کے سامنے انہیں روزی کے پاؤں جھوکر سمانی اٹھنی پڑے گی۔ باز اپنے نار کرڑے ہو کر دو۔“

بنا چاہو مرنہ لاکا کے ہوئے جوشی جی کے پاس چلا گیا۔ ان کے جانے کے بعد لڑکیوں نے نصہ سے

مائی بھائی جو اپنی نئی ملاقات کو محسوس کر کے بہت خوش تھیں۔ بچوں کی طرح شروع اندیشی سے سمجھنے لگی تھیں۔
تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے مائی بھائی کو گمانہ اور ناچنا شروع کیا۔ شیخ خیر ایک کے لہان میں سامے لائٹ مین
اندھ دوسرے بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ سلام ہوتا تھا سٹوڈنٹس میں سٹرائیک نہیں ملے ہے
کوئی ایک گھنٹے کے بعد بیٹا چارو ٹرا بنجید، مامو نہ بنائے اس محلے کے قریب آیا "اندھ چلے۔ جوشی
جی سانی مانگنے کے لئے تیار ہیں۔"

محلے میں جوشی کے گھر سے بلند جوتے۔ ٹریاں نکالیں اچھلیں۔ لڑکیوں نے ناچ کا آخری پھرنڈ سے
ختم کیا۔ پھر سب لوگ اندھ سیٹ کی طرف بھاگے۔

اندھ سیٹ پر جوشی جی گرٹ پر گرٹ پڑ رہے تھے۔ ان کے قریب کیرو مین اور اس کا اسسٹنٹ
کھڑے تھے۔ اندھ ابراہل ڈانس اسٹرا، تمام لائٹ مین اندھ ناچنے والی لڑکیاں اور دوسرے بھی کئی تماشائی اندھ
آگئے اور سب فائوش سے کڑے ہو گئے۔ دیکھیں اب جوشی جی کیا کرتے ہیں جوشی جی کی جھوٹی تہی بڑی تھیں
ان کے ماتھے پر پینے کے قطرے خود بہہ گئے تھے۔ انہوں نے گرٹ کو زندہ سے فرش پر پھینک کر اُسے زہر
سے اپنے جوتے سے شل دیا۔ وہاں کمال کر اپنے ماتھے سے پینہ صاف کیا۔ پھر کہا "اے میری غلطی تھی۔
مجھے صاف کر دیا جائے" پھر وہ بیک آگے بڑھے اور انہوں نے روزی کے پاؤں چومے "اب زندگی
بہتر کبھی ایسی حرکت نہیں کریں گا"

جوشی جی کی آواز پر غصہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ سوزش کی طرف مڑا اور اس
نے کہا "میں نے تمہیں گالی دی۔ اور میں نے تمہیں"۔ سوزش نے انہوں کا انکار کرتے ہوئے کہا "باتو
حاذ" جوشی جی نے اتار آگے بڑھایا۔ سوزش نے بڑی مضبوطی سے مصافحہ کیا۔ سارے سیٹ پر تابیوں
کی گرجائی نائی دے گئی۔

کیرو مین نے چلا کے کہا: "اے! وہ رائیل اور حاذو۔ اس پچھلے پر بھانڈو پ۔ اور وہ سپاٹ

کہہ رہے!“

لائٹ مین روشنیاں ادا کرے اور مرے جانے لگے۔ سائنڈ نے ناچ کے گیت سنا دیے۔

شروع کیا۔

وکیاں پاؤں سے تل اپنے گیس۔

کام شروع ہو گیا۔

شوٹو لیسے باہر کے تیرے نے اتھا اور نکا کر کے زور سے چٹکے کہا ”جینڈا لاڑو یا۔ ہمارے

دشمن کی استروں نے۔ ہالیوے اٹھا یا اور یا پر جینڈا لاڑو!“

آٹا شہرہ کرو۔ اکرم نے جینڈا مدھو کے تیرے رائے سے کہا۔ ”تم نہیں جانتے آج ہمارے

انڈسٹری میں کتنی عظیم تحریک نے جنم لیا ہے۔“

یہ ایک اکرم کو رزائی یاد آئے وہ جہانستان چلے گئے تھے۔ ان کی سب باتیں۔ ان کی ٹھنک۔

گھبراہٹ۔ تاریکی۔ خداس کا اقصوں میں سرخچ کے بیٹے ہانا۔ راستہ ہاں ہے۔ یہ ایک اکرم کے

دل میں بہت سی باتیں سامنے ہو گئیں۔ اب اسے یہ ایک معلوم ہو گیا کہ راستہ کدھر سے جاتا ہے۔ پہلے اس کا

خیال تھا کہ راستہ شاید شاتادرام۔ محبوب۔ کادور۔ مگر جی۔ اور ایسے بڑے بڑے لوگ اُسے بتائیں گے۔

یہ ایک اسے معلوم ہو گیا کہ یہ راستہ تو نظم کے بہت معمولی افراد کے دلوں اور ذہن نگہوں سے ہو کے گزرتا ہے۔ ایک

لائٹ مین۔ ایک تلپنے والی۔ ایک نظم ایکسٹرا۔ جھانکے پر کھڑا ہوا چپڑی۔۔۔۔

زور سے فاس سے کہا ”یہ فضا میں ہے۔ یہ فضا میں ہے!“

”کیا؟“ اکرم نے پوچھا۔

”یہ سب کچھ جو ہوا ہے کس نے انہیں بتایا تھا؟ ہم لوگ تو الگ الگ ان سے رہے۔

کبھی ان لوگوں سے بات بھی نہیں کی۔ مقرر ہی نہیں بنا۔ مگر یہ تو فضا میں ہے۔ تم اس طرح کے خیال

کہنے والوں کو قید کر سکتے ہو۔ اس پوری فضا کو، بڑا کو کیسے قید کر دے؟" پچھتے ہوئے فولاد کی بجلی سی بجسک
 دُھوے کی آنکھوں میں تھی۔

پیدل چلتے ہوئے وہ لوگ ابجا بیت ڈونڈ گئے ہوں گے کہ ایک ٹکی ان کے قریب آ کے رکے۔
 اور کسی نسوانی آواز نے کہا "سٹراکرم!" اکرم نے سر اٹھا کر دیکھا۔ رضیہ اس سے مخاطب ہوئی "سٹراکرم! رضیہ
 بول "ولایت یکم کو آپ جانتے ہوں گے۔ وہ آپ کی پھر میں کام کر رہی تھی وہ شہر کے اسپتال میں بہت بُری
 حالت میں بیمار پڑی ہے۔ اُسے دیکھنے چئے؟"

اکرم نے ٹکی کے اندر چھا ڈالا۔ پیچھے کی سیٹ پر رضیہ کے ساتھ رضیہ اسدہ کی بیٹی تھیں۔ اکرم
 نے اپنے ساتھیوں سے اجازت مانگی اور پٹ کول کر آگے کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔
 ٹکی چل دی!

اکرم نے خڑکے پر مچا دیا ہوا تھا اُسے؟

تذکیوں نے شرم سے سونہ پھیر دیا۔ کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اکرم کچھ تو بھگ گیا۔ پھر اس کے ذہن
 میں ولایت یکم کے اس کی آخری ملاقات اُبھر آئی۔ اس اس نے انہیں وہ دعوہ سنایا۔ کس طرح وہ عشرت
 کی انہں کے پیچھے رہ پے مئی آئندہ کرنے کے لئے آئی تھی۔ عشرت کا ہم سننے ہی اکرم نے دیکھا کہ رضیہ زنا
 ہوئی۔ پھر اس کا رنگ فق ہو گیا۔ گردہ کچھ بھونڈا نکلا۔ اُسے یہ بات عجیب کی معلوم ہوئی مگر اُس نے اس کی بات
 نہ مانا تو ہم نہیں دی۔

رزدی بولی "وہ دل کی بڑی نیک ہے۔ مگر! —" رزدی چپ ہو گئی۔
 قصویٰ دیر تک خاموشی رہی۔ پھر رذیہ بولی "آپ آج کل کوئی پتھر نہیں بنا رہے ہیں؟ مجھ
 سب جانتی تھی پھر بھی اُس نے یہ سوال پوچھا۔
 "نہیں"
 "کیوں؟"

"وہ جن لوگوں کے ہاتھ میں خسیاں ہیں۔ وہ مجھے میری مرضی کا موضوع نہیں بننے دیتے۔
 اس نے —" اکرم نے ہنس کر کہا "اس نے تب میں دھندلا پوسٹ آفس کے باہر غلط فہمی کر کہاں"
 رذیہ نے حیرت سے پوچھا "آپ خوش ہیں اپنے اس نئے کام سے؟"
 "اتنا ہی خوش جتنا کہ ان حالات میں خوش رہ سکتا ہے۔"

رزدی بڑی حیرت سے اکرم کی طرف دیکھنے لگی۔ مگر کچھ بولی نہیں۔ اس کے بھرے ہوئے
 دھندلے ہونٹ واقعی اس قدر خوب صورت تھے کہ کسی بھی مرد کو بوسے کے لئے پاگل کر سکتے تھے۔ اکرم نے سر ہلایا
 پھر رزدی کی بڑی بڑی مدھن آنکھوں میں کتنی ٹھکی ہے۔ جیسے آدمی جولانی کی تپتی ہوئی لوکر چھوڑ کر کسی
 صندے چٹھے کے کنارے آ بیٹھے۔

باقی رستے میں خاموشی رہی۔ مگر اکرم نے محسوس کیا جیسے رزدی بار بار اس کی طرف
 دیکھ رہی ہے۔

ہسپتال میں ولایت یگم کے کمرے کے باہر ایک بیچ پر بے بے۔ ابابلا الدین۔ اور شفیق
 بیٹھے تھے۔ ہر پانچ ماں چلے ہوئے مردہ اور اُماں۔ گرائن میں عشرت کہیں نظر نہ آیا۔ اکرم کو بڑی
 حیرت ہوئی مگر بعد میں اُسے شفیق سے معلوم ہوا کہ ولایت یگم کے ہسپتال میں داخل ہوتے ہی ان لوگوں نے
 عشرت کو گھر سے نکال دیا تھا۔ مگر پھر بھی، اکرم نے سر ہلایا، عشرت کو یہاں آجایا ہے تھا۔

ٹھوڑی دیر تک وہ سب لوگ باہر کھڑے رہے بے امان کے دھچکھڑکے لوگوں نے باتیں کرتے رہے اور ولایت عجیب کی صحت کے بارے میں پوچھتے رہے اور انہا پرانوس کرتے رہے پھر یہ ہسپتال دھواں کی طرف سے کمرے کے اندر جانے کی اجازت نہ گئی تو نرس کے اشارے پر وہ سب لوگ ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ اندر چلے گئے۔ . . .

ایک اونچے سفید جراثق بستر پر ولایت عجیب بے ہوش پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے دھڑکتے تھے۔ اور اس کے رخسار نیلے تھے۔ اُسے ابھی ابھی سسکیں دینی باقی تھی۔ لیکن اس کا سونہرہ زرد سے اندر کو پھنپھرا تھا۔ اور ناک کے تھنوں سے اندر ماس کی تلی تک ماس میں ناک تک تک کڑکڑاؤں کرتی ہوئی چل رہی تھی جیسے ماس کے رستے میں کسی نے بھاری بھاری چٹانیں گرادی ہوں۔ اور اب ماس ان چٹانوں کی طعاندوں میں سے ہوتی ہوئی گونگتی ہوئی بڑی مصل سے ناک کے تھنوں سے خارج ہو رہی ہو۔

یہ جڑا بمیاک نظر تھا۔ ولایت عجیب کا وہ پھول کا سارنگ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اس کے دونوں بازو منہ سے سیاہ اور مٹی ہوئی گڑاؤں کی طرح اس کے دونوں طرف سرانے پہلے جس دھڑکتے تھے۔ کبھی کبھی ان کی انگوٹھوں میں ایک خفیف سی لڑکھائی پیدا ہوتی۔ وہ انگوٹھیں جیسے ٹھکی میں بند ہونا چاہتی تھیں۔ وہ بازو جیسے سرانے سے اٹھ کے سینے کی طرف آنا چاہتے ہیں۔ دو تین بار ولایت عجیب کے بازوؤں میں ایک ٹپک ٹپک پیدا بھی ہوئی اس کے ہاتھ اپنی جگہ سے اٹھے اور سینے کی طرف چلے مگر نرس نے انہیں ہلاتے ہوئے پھر سرانے پر رکھ دیا۔

ٹھوڑی سہی ہوئی تھی۔ ٹھوڑی پراک بے بڑا زخم تھا۔ انگوٹھ کا جو منہ مینی ٹھنوں سے نیچے کا جو منہ نظر آتا تھا وہاں پر زخم تھے۔ سب پرچی بندی ہوئی تھی کہ سب زخمیں اس سے تھیں اور ماس کڑکڑاؤں کرتی تھیں۔ کہیں یلوں سے آتی ہوئی گھٹ گھٹ کر چل رہی تھی۔

ایک ولایت عجیب نے انہیں کھلی دیں۔ رضیہ اور رضیہ ذرا آگے کو بولیں۔ مگر ولایت عجیب تو صوف

خینا جھلائی جو کر موت کے گڑھے کرکٹ میں پھینک دیا۔ لیکن جب تک میری جان میں جان ہے اور میرے اتموں میں طاقت ہے اسی آنکھوں میں نمود ہے اور دماغ میں سرچ اور جو کہ ایک رشتہ بھی موجود ہے میں فراقوں کا اس اندھی شیطنت، نعم اور غم، ناک بے انسانی کے ظلمات، ایک بار نہیں دس بار نہیں، میں دس لاکھ بار اپنے فراقی تئوں سے تہلے آہنی جبروں کے ظلمات بکڑھاتا رہوں گا۔ بلکہ کبھی کسی وقت کسی طرح تو تہلے اٹھ سے دماغ میں کہیں سے روشنی کی ایک کرن پہنچے۔ اے گندے، گندھڑے، غیظ، عوام خود بخود کھسا چہرے کر چلنے والے سارے۔

کبھی وہ کپڑے اچختے تھے۔ کبھی ان کی تراش بھی اچھی تھی۔ مگر اس وقت وہ گندے بنے پکیلے
 سے دکائی دے رہے تھے۔ سینٹر جمپر کی ٹانگ بہت دیر تک مشرت کے مرجائے ہوئے چہرے کی طرف فورے
 دیکھتا رہا۔ مگر مشرت کی آنکھیں غبر سولی۔ یہ پردہ شہن تھیں اور تیلیاں بھی پھیلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ رات بھر وہ بخار
 سے ٹوکتا رہا تھا۔ کتنی راتوں سے اسے بخار ہوتا تھا۔ پھٹکتا تھا۔ جسم کو جھلکانے والا بخار۔ بیکار سے
 ہو جاتا تھا۔ جسم کی ہڈی ہڈی لڑی ہوئی۔ ہمنوا پانی جگ سے ٹپک رہا تھا۔ اس کی پیاس کی شدت سے کانٹے۔ مشرت
 نے کانٹے کے ٹوٹے چھوئے مگر اس سے دو تین بارل سے پانی پیا۔ غصا، اندھ کتنی قوت۔ ہے۔ پیٹ میں پانی کی
 ایک پوری تنگ چاہئے۔ ان دو تین گلاسوں سے کیا ہو گا۔ پانی پنی کر اس نے زندگی کا منظر اپنے منے
 کے گرد بیٹھا۔ اتنے میں رنگ دینے بغیر تمام اندھا لیا۔ تمام کمالی پور کا شہر دوڑا تھا، اور بائیں دلواری دکھائی
 دیتا تھا۔ کوئی اسے دیکھ کر غلطی نہیں کا سکتا تھا۔ کوئی اسے کسی اعتبار سے کسی حیثیت سے شریف انسان نہیں سمجھ
 سکتا تھا۔ اس کی پوری زندگی، اس کا پیشہ، اس کے خصلت، اس کا کردار اس کے چہرے پر کھل ہوا تھا۔ تمام
 جہانگ کے ملک کی طرف سے کھولیں کا کرایہ وصول کرنا تھا۔ اور کوئی کچھ بھی کہے، ملک مکان کے انتخاب کی
 دادرینی پڑتی تھی جس قسم کے لوگ ان کو میلوں میں رہتے تھے ان سے کرایہ وصول کرنا تمام ہی کا کام تھا۔ تمام
 سے اس پاس کی تین بلڈ میچیں اپنے نئے لے رکھی تھیں۔

کیوں کہ قاسم نے اسے بتایا تھا کہ آدمی جرائم کی دنیا میں رہ کر اتنا ہوشیار نہیں ہوتا۔ پانچ سال تک آدمی باہر جرم کرتا رہے تو اسے اسی گڑ کا پتہ نہیں چلتا جب تک وہ جیل نہ جلتے۔ جیل کے اندر ہی وہ تمام سسار و دروزہ ایک ایک کر کے سمجھتے ہیں جن پر گناہوں کی دنیا پختی ہے۔ وہاں ایک سے ایک بڑا استاد ہوتا ہے، جس نے ساری زندگی کی ریاضت سے یہ فن حاصل کیا ہے۔ اس نے قاسم نے یا مصل بنارکھا تھا کہ جوں ہی کوئی نیا آدمی اس کی ٹولی میں شامل ہوتا، وہ اسے دو ایک ماہ میں جلد بگوارا دیتا، اسی جیل بگوانے میں ایک ادب بات بھی تھی۔ جیل جا کے آدمی پھر اوجھڑاؤ اور مکر نہیں کرتا۔ وہ میں اور مری کا ہر جانا ہے۔ اس دنیا کے صدفانے اس کے لئے بند ہو جاتے ہیں اور اس دنیا کے نیچے جو دنیا بچی ہے اس کے صدفانے اس کے لئے کھل جاتے ہیں۔ ایک دفعہ جیل جا کے آدمی کی بے چین رُوح اطمینان حاصل کر لیتی ہے۔ اسے عرفان حاصل ہو جاتا ہے عرفان دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو نئی دنیا پر کیزگی سے آتا ہے۔ اور جس کی معراج جنت ہے۔ دوسرا وہ جو بدی اور غلاطت میں ڈلب جاتے سے آتا ہے اور جس کی انتہا جہنم ہے۔ وہ لوگ جو شب و روز جہنم میں رہتے ہیں ان کے لئے آگ کے شعلے جھپڑوں کے ٹانگہ اور تپتے ہوئے لوہے کے داغ اور جلتے ہوئے گوشت کی بڑ کہہ سکتی نہیں رکھتی وہ تو درد مندی بات ہے۔ وہ لوگ جہنم سے اس طرح گزر جاتے ہیں جیسے جنتی ہنر کے کلا سے ٹپس رہے ہوں۔ کم از کم قاسم کو دیکھ کر اس کے سکون اطمینان اور اس کے ضمیر کی محنت نشانی کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا۔ ان چند سالوں میں عشرت کے ضمیر کی کمال بے حد موٹی، کھڑکی اور بے حد موٹی تھی۔ تو بھی کچھ باقی تھا، عشرت محسوس کرتا تھا کہ ابھی وہ وہاں تک نیچے نہیں اترا۔ جہاں تک اسے لگا، وہ عرفان حاصل کرنے کے لئے نیچے اترا چاہئے۔ اس ایک اصول ہی جھجک تھی۔ کہیں پر اس کے ضمیر کی موٹی کلا کے اندر کوئی چیز بھی تک زندہ تھی۔ حرکت کرتی تھی کبھی کبھی اسے پریشان کر دیتی تھی۔ وہ جب نیچے دیکھتا تو اسے گہرائی سے بڑا درد لگتا۔ جانے دُور نیچے اس سانپوں کے بل میں کیا ہو۔ نیچے جانے کی کشش بھی اس کے دل میں تھی کیونکہ اب اتنا نیچے آ چکا تھا کہ جب وہ اُپر دیکھتا تو زمین اُسے اتنی دُور اور بے نظارتی جیسے وہ کسی گہرے کنوئیں میں

گر چہ ہو۔

عشرت دومین بار آہستہ سے کمانا، پسینے کے ترڑے اُس کے ماتھے سے چھوٹنے لگے۔
عشرت نے بیب میں مدال مٹولا، مدال کہیں نہ ملا، اس نے کرٹ کے آستین سے ماتھے کا پسینہ پونچھ لیا۔
اس حرکت سے اس کے نذد، مدالوں پر سرخی چھا گئی۔

سینہ چیدی الال برے "آخری مرتبہ میں نے تمہیں راج کے ہاں ایک پارٹی میں دیکھا تھا۔
بہت عرصہ ہو گیا۔"

عشرت خاموش رہا۔

"تم بہت چل گئے ہو"

عشرت پھر بھی خاموش رہا۔

اُن دنوں راج نے تمہاری سفارش کی تھی کہ تمہیں میں اپنی تصویر میں بیروے لوں مگر کسی نہ کسی بہرے
سے وہ بیل منٹھے نہ چڑھ سکی۔

عشرت کمانا۔

"یہ کمانی بہت بڑی ہوتی ہے۔ بچ کر"

عشرت نے کہا "مجھے کام چاہئے"

"مجھے معلوم ہے" چیدی الال نے بناؤنی ہمدلی سے کہا "مگر مصیبت یہ ہے کہ میری دونوں
تصویری ختم ہو چکی ہیں اُن میں تو کوئی کام نہیں ہے۔ پھر بھی ان تصویروں کے ختم ہونے کا اثریت کرنے، سنسکر کو
دکانے اور نئی تصویر شروع کرنے میں چومنا تو ضرور تھیں گے"

عشرت نے مذکر کرتے ہوئے کہا "مجھے آج کام چاہئے"

چیدی الال ہنسا کہہ نہیں سکتا، تم وہ کام کر گئے ہو، تم بیرونا چاہتے تھے، اب چیدی الال

نے چٹکی بھاگے اپنے جتنے ہوئے گھٹ کر دکھانے میں گر جاتے ہوئے کہا "میں نہیں ہیرو بن سکتا ہوں
عشرت حیرت سے اس کا طوطا دیکھنے لگا۔ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ سیٹر جمیدی اول نے جانے اُس
وقت راج کے کہنے پر مجھے ہیرو بنایا۔ آج خود بخود کسی منارٹ کے بغیر مجھے اس حالت میں ہیرو بنانے کے
لئے تیار ہے۔ عشرت کی سانس تیز تیز پٹنے لگی اس کی آنکھوں میں ایک فیڑمول چمک اُٹھی۔ کیا رات ہی جمیدی
نے یہ کہا تھا۔ ایک لمحہ پہلے اس کے کان بج تو نہیں سہے تھے۔

جمیدی عشرت کی حیرت اور سرت کا غارشی سے نطت اٹھا آ رہا۔ پھر کہنے لگا "اس میں حیرت
کی کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں اپنی نئی فلم ۲ ہیرو بنانے کے لئے تیار ہوں۔"
"اُس فلم کا نام کیا ہے؟"

"اسرارِ محبت۔ عشرت کو کاکھی کہانی"

جمیدی لال نے معنی فیڑمولا ہوں سے عشرت کی طوطا دیکھا مگر عشرت کی جگہ میں کچھ نہ آیا۔

"اور ہیروئی کون ہوگی؟" عشرت نے پوچھا۔

"ماہ پارا"

"ماہ پارا۔ مگر وہ تو اب تین چار سال سے کسی جگہ میں ہیروئی نہیں آئی"

"بیچے جاڑی ہے" جمیدی نے سر ہل کے کہا "میں جانتا ہوں کچھ کل اس کے پاس کوئی کام

نہیں ہے۔ مگر میں اسے ہی یا سنے سے رہا ہوں"

عشرت نے رک رک کر کہا "یہ — میں — یعنی کی — کیا ہوں — بیڑہ۔ تم

آری نہیں فرشتے ہو"

جمیدی لال نے اپنی آنکھوں پر پٹیل پٹاتے ہوئے کہا "تم اپنے سامنے کسی فرشتے کو نہیں دیکھ رہے

ایک بڑی من کردیکھ سہے ہو"

عشرت نے سوائے کچھوں سے سیر کی حرکت دیکھا۔ سینہ چیدی اہل نے مذاکے جنگ کے کہا۔ یہ ایک بزرگم برگی۔

”بزرگم؟“

”ہاں سب کچھ اکر کے نام کرنا پڑے گا۔ اور وہ نام جس طرح سے کہیں گا اسی طرح سے کرنا پڑے گا۔ پخت کو کاکا کوک شاستر زندہ کر دیا گا اس غم میں۔“

جیسے کچھ ایک تعلق نے عشرت کو چھو لیا ہو۔ وہ چوٹا۔ اس نے نندے سے کڑی کرنا پڑے دونوں ہنسنے سے کڑیا چند لوگوں کے لئے کڑی، مینہ آس پاس کی دیواریں، تصویریں، چہرے سب اس کی نظروں میں گھوم گئے۔ اگلے سیدھے ہو گئے۔ اُسے سوت کا نانا بے صاف۔ دستہ کا جگہ کارٹی اس میں نہ ہلا سے اپنے گھر میں کوئی چیز بھٹی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے ہرٹ بائیں ٹنگ سے ہو گئے۔ جیسے کسی نے ان کا سلا خوں چوس لیا ہو۔ اس نے ہرٹوں پر نہاں پھیرنی چاہی مگر اس کے حق میں کوئی تلاب نہ تھا۔ اُسے یہ محسوس ہوا جیسے وہ اپنے ہرٹوں پر نہاں نہیں کوئی ٹنگا سا برش پھیرا ہو چپ کا صعب ہے کہ۔ کہ۔ کہ۔

— عشرت اپنا فقر و پرہیز کر سکا۔

”ہاں ہاں۔ بائیں ٹنگی غم۔ اسے ان دوسری غموں میں کیا دکھا ہے۔ چارہ کو خرچ کر دیا کوئی بھروسہ نہیں پاس ہو نہیں ہو۔ مگر جو غم کوئی ٹنگ نہیں ہوتی۔ اس میں سینہ بھی کلاتے ہیں۔ کرٹش بھی۔

ہاں اپنے نام شریف ادا کا بادیوں روڈ پر بہت سے اپنے بھائی بند ہیں جو پاخانے پاخانے ہزاروں ایک غم کا ہرٹ اٹھا کے جلتے ہیں۔ پھر دوسرے شہروں کے بڑے بڑے سینہ ہیں۔ دولت مند لوگ ہیں۔ سارے ہالہ بے ترے چارے ختم ہو گئے۔ جتنے جناب پکاس پکاس ہزاروں نے ایک دوسرے سے ایک بزرگم کے ہرٹ لایا ہے۔ اب بھی پرانے عکروں میں دس بارہ اپنے مستحق لوگ تریں۔ میں تم سے کچھ کہتا ہوں عشرت۔

بزرگم یہاں سوا پوری غم انڈیشی میں کہیں نہیں ہے۔ ادب تو سولی سولی لوگوں میں بھی اس کے لوگ پیدا

ہر گئے ہیں۔ میں دالوں کو پر دیکھ کر غم کی پیش بردیتا ہوں۔ سارے کئی ہی وہ لوگ دوسرے دوسرے گھومتے ہیں اور جہاں کوئی مخصوص جگہ دیکھی وہاں غم پلا کے دکھاتے ہیں۔ اور سب میری کئی باتوں میں سلسلہ جوئی اور کیا کر لیں جو دیاں منانگی ہیں۔

”مگر؟“ حضرت کچھ کہنے وہ تھا کہ چیدی دال نے اس کی بات سن کر کہیں پر کہہ دیا۔ اگر عطر کیا۔ بات تو یہی ہے جو دوسری غلوں میں کی جاتی ہے۔ وہ لوگ اسے کپڑے پہنا کر دیکھتے ہیں اور چکر مار کر طرح طرح کے ڈانٹ گیت اور نکالوں میں گھما پھرا کے کہتے ہیں دالیں ہزار فٹ میں کہتے ہیں۔ میں ایک ہزار فٹ میں یا دو ہزار فٹ میں کہتا ہوں۔ اور کپڑے تار کے ملان ملان مانت کہتا ہوں کوئی ٹی بیٹھی نہیں۔ برو منظر ہے؟“

حضرت اپنی ٹھٹھکیا آئین اپنے ماتوں کے کٹنے کھنچ کر اس نے کانچے بہتے بھٹوں کی طرح دیکھا۔ پھر اس نے سینہ چیدی دال سے پوچھا ”اے ادا پادا؟“

چیدی دال ہنسا۔ ہلا ”تم کیا کہتے ہو۔ بے چاری پچھلے تین چار سال سے جو بے کار ہے تو کیسے اب تک زندہ ہے۔ وہ برابر میری بڑی غلوں میں کام کرتی ہے۔ اسے جاب نہیں ہے اس کے آگٹ کا۔“

”آگٹ؟“ حضرت نے اپنے دل ہی دل میں سوچا۔

چیدی دال نے اپنی غلی کی طرح دیکھ کر کہا ”جے تھوڑی دیر میں سینہ کتر بند کئے اس جاتا ہے۔ اگر تم کو منظرہ جو بول دیو۔ اپنا ایڈوانس بھی لے جاؤ۔ ایک ہزار دو سو روپے کا۔ پانچ دن کی ٹورنگ ہے۔ سو دو سو روپے ایڈوانس لے جاؤ۔ کل سے حاضر ہو جاؤ۔ ایک ہزار سو روپے ساتھ رہنا ہوگا۔ جہاں لے جاتو بدھ لے جاؤں۔ تم بول نہیں سکتا۔ میں کسی کا سمجھ رہا نہیں کہ کتنا ہیں اس بات میں۔ تم کو ہمیں گھننے یہ ساتھ رہنا چاہیے گا۔ سلاؤنٹ۔ تم۔ میں۔ ماہ پادا۔ کیرہ میں۔ اس کا اسٹسٹ سب لوگ اکٹھے رہیں گے۔

سات ملنگ کرتی آدمی اپنے گھر نہیں جاسکتا۔ کسی کو میری اجازت کے بغیر ٹیلی فون نہیں کر سکتا۔ خدا نہیں بھڑکتا۔ ایک ہزار روپیہ پر دل کا سودہ یہاں داناں اگیلے جاؤ۔ منظر ہے؟“

عشرت نے ایدوانس کے لئے اپنا کاپتا ہوا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ”منظر ہے“
 سیٹھ نے گھٹنی بجائی۔ ایک چڑھی اندھا کیا۔ سیٹھ نے چڑھی کو کہا۔ ”خزانی کو اندھ بچا دے“۔ ”خزانی اندھا کیا۔ سیٹھ نے کہا۔“
 عشرت کو ایک سو روپیہ ایدوانس ملے دوں۔ لکھنوی پر دستخط لے لو۔
 ”کس مطلب میں؟“

”بچوں کی اخلاقی تربیت کی ڈاکو میٹری جو بن رہی ہے اس کے حساب میں“

جب خزانہ پھاگیا تو مشقت حیرت سے سیٹھ کا زہن دیکھنے لگا۔ سیٹھ نے جنس کر کہا۔ ارے بھائی۔ غم نہ آتا ہوں۔ تیس پیسے دیتا ہوں تو اس کا کس مطلب بھی رکھوں گا کہ نہیں؟ سو آج کل ایک ڈاکو نیشنل مشورہ کر رہی ہے۔ ”بچوں کی اخلاقی تربیت“۔ دو ایک شلٹ اس میں بھی تیار ہے ہر باتیں گئے۔ مگر وہ کہتی ہیں۔ مگر نیشنل آج کل اپنی ڈاکو میٹریاں بناتی ہے۔ وہ میری ڈاکو میٹری کہاں سے خریدے گی۔ میں تو بھی حساب رکھنے کے لئے ساٹھ پیسے کے کسی طرح وہ ڈاکو میٹری عقل کدوں کا۔ اور اس جو غم کا سارا غم اُس پر ڈال دلا گا۔ ارے کیا کریں مشرت بھائی آج کل میدان میں دھندلے کا نانا ہی نہیں رہا۔“
 ”بچوں کی اخلاقی تربیت۔“

”اسرا بہت عرصہ کر کاکی کہانی“

عشرت جب چیدی وال کے دفتر سے باہر نکلا تو ان دروازوں مٹانوں کا خنہ مٹن اس کے ذہن میں بیدار ہوا۔ مگر اس کی جیب میں سو کانوٹ بھی تھا اور اس سو کے نوٹ کا مطلب تھا۔ روٹی۔ کھول کھول کر لایا۔ شراب اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ تمام کے پنجے سے نچ جائے گا۔ ایک ہزار روپیہ! ارے وہ اس میں سے ہانچ سو اپنی اناں کر نہیں گئے ہیں کچھ سکتا ہے۔

راج کر جب تمام اس کے پاس آیا تو عشرت نے مختصر روپے محال کھائے دے دیئے اپنے پاس سرٹ پھیں رکھے۔ تمام بلا حیران ہوا جب عشرت نے اسے بتایا کہ اسے ایک فلم میں کام مل گیا ہے وہ بہت حیران ہوا۔ مگر کیا کر سکتا تھا۔ نوٹ لے کر خاموشی سے چلا گیا۔

عشرت نے اپنی منجلی چاہ پانی پر لیٹ کر اپنی بہن کا خط نہایت سیریں مرتب پڑھا۔

پیارے بیٹا!

تمہیں بھی گئے ہوئے یہ تیس سال جا رہا ہے۔ اتنی بہت پریشان رہتی ہیں۔ کیا تم کچھ کام کچھ نہیں گنج نہیں نوٹو گئے؟ ایک بار میں اپنی ماں اور اپنی چھوٹی بہن اور بھائیوں کو دیکھنے کے لئے نہیں آؤ گے۔ یہاں میں نے سب سے کہہ رکھا ہے کہ تم فلم میں ہیرو کا کام کر رہے ہو۔ مگر تین سال سے اب تک تمہاری کوئی فلم نہیں گنج میں نہیں آئی۔ اس لئے میری بہنیاں اب مجھ سے مذاق کرتی ہیں۔ وہ نہیں سمجھتی کہ تم واقعی کسی فلم میں ہیرو کا کام کر رہے ہو۔ کچھ بتا دینا۔ تم کسی فلم میں ہیرو کا کام کر رہے ہو۔ وہ فلم میں گنج میں کب آئے گی؟ تمہیں دیکھنے ہوتے آقا حرم ہو گیا کہ اب اگر میں تمہیں فلم میں دیکھوں تو دیکھتے ہی رو پڑوں گی۔ جلدی بنا۔ اچھے بیٹا۔ تمہاری فلم کب مختل ہوگی۔ ہمارے رئیس گنج میں کب آئے گی؟ اس فلم کا نام کیا ہے۔ میں اپنی ساری سیریں کر لے کر آئے دیکھنے باتوں گی۔ اور وہ جو خاں صاحب مگر عشرت آگے نہ بڑھ سکا۔ ایک زور کا کھوکھلا قبضہ اس کے ہونٹوں سے نکلا۔ عشرت۔ ہیرو۔

ایک بر غلیم کا!

پھر یہ ایک آئینہ تیزی سے اس کی آنکھوں میں منڈا آئے اور اس نے اپنی بہن کے خط سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور جا رہا پائی پر اندھا ہو کے گر گیا اور سبک سبک کر رونے لگا۔

دوسرے دن شام کے غمت چٹے میں کما حقہ ہوا پولیس ہاؤس کے پیچھے پاروں کے تختوں میں سب کھام اپنے ٹکڑوں سے ٹٹے صاحب نے ہوا تھا اور قہیں وصول کر رہا تھا۔ کسی نے اس کے شانے

ہلکا تو رکھا۔ تاہم نے حرکت کر پیچھے دیکھا۔ یہ عشرت تھا۔ مگر تاہم اس عشرت کو دیکھ کر حیرت ہو گیا۔ عشرت کے چہرے پر غم تھا ایک قطرہ تھا۔ وہ ایک نرودہ لاش کا چہرہ تھا۔ آنکھوں میں کوئی چمک نہ تھی۔ اور جب عشرت بولا تو ایسے بولا گویا کنوئیں میں سے بلبل رہا۔

”کیا ہے؟“ تاہم نے نڈاؤ دہشت سے کہا۔

عشرت نے کہا ”وہاں میں تمہارے ساتھ کام کروں گا۔ جو بھی تم دو گے کروں گا۔“

تاہم اندسے قریب غرض ہوا مگر اوپر سے اس نے وہ دہشت بھرا اختیار کئے رکھا۔ بولا ”کیا ہمارا وہاں جہاں کام ہوتا تھا۔ ملک کو کام پسند نہیں آیا؟“

”نہیں۔“ عشرت کے ہونٹ کو پیچھے لگے ”ہم۔۔۔ میں۔۔۔ وہ کام کر نہیں سکتا۔“

”اُسے بے درقوت کئے پتے۔ کام کرنے سے آتا ہے۔ ایک دوبارہ کوشش کی ہوتی۔“

”بہت کوشش کی وہاں مگر مجھ سے ہو نہیں سکتا۔ میٹھ نے ناکارہ بکھر کر مجھے جان دیا بہت غلط

تھا میٹھ۔ بہت تاہم ایک دن کیا برادر ہوا۔ ہزاروں کا نقصان ہو گیا۔ اُس کے آدمیوں نے مجھے دھتکے سے کے

کال دیا۔“ عشرت کے ہونٹ کو پیچھے لگے۔ وہ میٹھ کو سامنے تھا۔ تیری میں کھڑا ہوا۔ تیری کے اندر شعلے کی طرح

بھڑکتا ہوا۔ تیری کی سانس لیتا ہوا۔ وہ اُسے بھول جانا چاہتا تھا۔ نودج کو پرے سے ہمیشہ کے لئے غائب

مدونا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہر بار آ جاتا تھا۔ بار بار ملنے سے بھی آ جاتا تھا۔ اُس سے وہ

بھی بھول نہیں سکتا تھا۔ جیسے کسی نے دیکھتے ہوئے سہ کی گرم سلاخ سے اس کی نودج پر وہ منظور کھینچ دیا

وہ جانتا تھا۔ وہ زندگی بھر کے کبھی نہیں بھول سکے گا۔

اور پھر وہ نہیں۔ بے شرم۔ بے باک۔ بے حیاءت کی جی ہنسی۔ بار بار اس کے ہم پر کڑے نکال

تھی شرب۔ بھنگ۔ چرس۔ مدونا۔ متھکا۔ امراض کے سہلے نے ہرے کپڑوں کا کھایا ہوا کھوکھلا جسم۔ ونسیا

وہ نے اس کی تہی کا آخری گوشہ بھی کھایا تھا۔

یہ ایک انہوں نے مجھے باہر پھینک دیا۔ ایک نچڑے ہوئے لیوکی طرح! آے خدا!

ٹھہر جاؤ عشرت۔ آے ہوں جاؤ۔

عشرت نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور لڑکھڑکھ کر کام کے قدموں میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

ایک رات کو کھانا کھانے کے بعد چوتھے پر بیٹھے ہوئے کرم احمد حوے کے درمیان بڑے
 ناز کی ہمشیر ہی بحث بڑھتے بڑھتے اتنا پانی پر ختم ہوتی اگر موت، اس بیت عظمہ افضل احمد حوے کو
 کہیں میں نکال پھاڑ دیتے۔ بحث ہندوستانی غصہ کے بدلے میں بددیہی تھی اور غامی کر ترقی پسند فحشوں کے
 بدلے میں جن کے حقوق حوے اپنا مخصوص نقطہ نظر لکھا تھا اور کرم جن کی ناسایا بی بی جھگڑا ہوا تھا کرم
 کی تعلق پسند غصہ کے بدلے میں کہہ کر لگا ہوا کے چنے کو چیرا تھا۔ اکثر مقامات پر بحث میں تناب اور
 جھگڑا دھن دھن کر رہتا تھا۔

دھوے نے کہا "جے تم لوگوں کی تصویریں پر سب بڑا اعتراض یہ ہے کہ سب کی سب
 ٹیکس اور عورت پرست ہوتی ہیں۔ قبلی تصویریں کا مزہ ہے تو اس قدر پایا ہوا، گھٹا ہوا، غم و غم کا
 ملا ہوا کہ کبھی ہنسنا ہی نہیں تم سے کہتا ہوں کہ یہ کچھ نہیں ہے۔ یہ حقیقت ٹھیک کے خلاف ہے۔ اس میں
 کوئی شبہ نہیں کہ ہم پر بیت غم کوستم ہوتے ہیں۔ ہوتے ہیں۔ مگر ہم اس قدر اس انداز سے ہوتے ہوئے
 وگ نہیں ہیں جس قدر ہم ہیں غموں میں دکھاتے ہیں ہم غم کا جواب اپنی بھرپور ممانعت سے دیتے ہیں
 ہماری جدوجہد بیت ہی سخت۔ اکیسے عجز ہلکی زندگی میں ہر روز ہندو ایک لکھائے کرتے ہیں، جب سوج چمکتا
 ہے اور شبنم کے قطرے سکراتے ہیں جب بیت کی نگاہ پر باد سا گرتی ہے جب ہم گیت لکھتے ہیں

اور ہمارے بچے خوشی سے دُعوں میں پھلتے ہیں۔ تم اُن لوگوں کو کہیں بھول جاتے ہو۔

اکرم نے کہا: "اُن لوگوں کی موجودگی سے میں بھلا نہیں کرتا۔ غریب لوگوں کی زندگی میں ایسے لمے ضرور آتے ہیں۔ مگر یہ لمے بڑے مختصر ہوتے ہیں۔ جو غالب حقیقت ہے وہ غریب آدمی اس ایک تنگ و کمربند کی ہے۔ اور غالب حقیقت کو بڑا کر کے دکھانا ہمارا فرض ہے۔"

دوسرے نے کہا: "تہا سب سے پہلا فرض ہے کہ تم ایسی تصویریں بناؤ جو ہم دل چاہی سے دیکھ سکیں۔ تہا ری نہیں دل چاہی نہیں رہیں۔ وہ سوکھے ہوئے کانوں کی طرح تنگ ہوتی ہیں۔ سالی یہ بھی کوئی تصویر ہے۔ بیرونی دیکھو تو لباس نامزد شکل ایسی کہ، پیکر کا بھائی آئے۔ ہر مرد دیکھو تو یکہ مالکہ بیڑی کا ٹیڈی مالک۔ جہاں موقع ملے اُسے تفریح جلاؤ دیتا ہے۔ اسے بھائی ہم دنیا میں تفریح کھینچتے نہیں جانتے۔ تفریحیں بھی بہت سنتے ہیں۔ کامکار میدان میں پہلے ٹیڈی بزمین کے لینڈ میں غریب کے مشعلی تم سے دنیا اور دُشوار بتا سکتے ہیں۔ مگر ہم دنیا میں اعلیٰ دُشوار دیکھنے نہیں جانتے۔ دن بھر کے تھکے اسے ۷۴ م اور وہ بھی اس گنہگاروں میں جاں گسل کام کرنے کے بعد جب ہم دنیا میں جاتے ہیں تو کوئی ایسی تصویر دیکھنا چاہتے ہیں جس سے ہمارے تھے ہوئے اعیان کو سکون پہنچے۔ آنکھوں میں طراوت آئے۔ دل کچھ اس طرح مائل ہو کر یہ دنیا اپنی تمام عقیدوں اور محرومیوں کے باوجود اتنی بڑی بگ نہیں ہے کہ فدا دنیا والے سے عمل کر فدا کٹی ہی کرنا جانتے۔ اسے میں تم سے کچھ کہتا ہوں۔ تہا ری بہت سی تصویریں کہو کہ وہ اسی خیال ہوتا ہے کہ یہ دنیا اتنی بڑی ہے۔ ماحول اس قدر پریشان کن ہیں۔ مخالف قوتوں کا بازار اس قدر وسیع ہے کہ خود کشی کے سوا کوئی اور چارہ ہی نہیں۔ میں تم سے کچھ کہتا ہوں اکرم بھائی۔ تم لوگوں کی تصویر اکثر میں آدھی دیکھ کے اُٹھا آ رہی ہیں۔"

اکرم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کے تھکے دو تین بار تیزی سے سانس لے رہے تھے۔ اپنا فون تیزی سے گیندوں کی طرح جاتا ہوا سلام ہوا میں تہا سب سے ایک چڑھے کے باشندہ۔ مزید سے ایسا

ہائیں مٹ رہی ہوں، جو کہ تم کہہ رہے ہو اس آفریقہ طبع ہر اک زندگی کے کج خالق سے منہ ہٹ کر دلچسپ تصویریں بنائیں، یعنی ایسا دل چسپ تصویریں جس سے تمہارے شکے ہرے اعتبار کو سکون ملے، تھلا فلسفہ ہل دلائی تصویریں کا فلسفہ ہے۔“

دوسرے نے فتنے سے کہا: ”تم میری بات نہیں سمجھتے ہو۔“

گرا کر مرنے کو کہ کہا: ”میں خوب جانتا ہوں یہ دل چسپ کا فلسفہ، سکون اور اطمینان کا فلسفہ، نر کا فلسفہ ہے جو زندگی کی غالب حقیقت ہے، اس سے منہ ہٹ کر دلچسپی کہانیاں، ہم پہنچاؤ یا بلند حلاؤ کی تصویریں بنانا۔ جنسی ترغیب دینے والے ناچ گانے دیکھو، وہ آنکھوں کو بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں، یا حسن خفیل نیند لای بنانا۔ اور وہی سا بیٹا، چند سو سالہ شاہی صوم، کنڈری کینز، ایسی زندگی جو خود آج کے عرب ملکوں میں کہیں نظر نہیں آتی، اس کی عکاسی کر کے دوسرے ملکوں کے کچھری بے عزتی کر کے اپنی جیبیں بھر دیتا۔ تم کیا۔۔۔۔۔“

دوسرے بیچ میں ہل اٹھا، تم بات کو سمجھتے نہیں، بیچ میں کہاں کر رہے گے۔۔۔۔۔“
 ”کون اس تم کرتے ہو؟“ اکرم نے جواب دیا۔

دوسرے کی آنکھیں ایک لمحہ کے لئے شرع ہو گئیں، پھر وہ فتنے کو پکایا، پھر اس کے پیسے پر ایک عیب ہی سکواٹ آئی، وہ آہستہ سے ہلکا کر مٹائی یہ بھاس نہیں ہے، تم مرنے اپنے کتابی ذوق کے بل بوتے پر، اپنے کتابی علم کے بند پر تصویریں بناتے ہو اور اس نے نام دیتے ہو کہ تمہارے تھلائی اور تھلائے دوسرے ساتھیوں کی تصویریں نام دیتی ہیں، کبھی تم نے اس کے بارے میں سوچا یا ہو تم نے خدا میں اپنی نامی کی برتری کو گھڑا ہے جس میں تم لوگ اپنے آپ کو ترقی پسندی کا شہید سمجھتے ہو، اس سے الگ ہٹ کر سوچنے کے لئے تم باہل تیار نہیں ہو، میں تم سے کچھ کہتا ہوں تم شہید نہیں ہو سناں فرمائیے گا آپ لوگ شہید نہیں ہیں، اپنے نام کے بل بوتہ آپ باہل میں اصرار میں یہ غبت کر سکتا ہوں۔“

دوسرے نے اپنی باتیں تمہیل پر دائیں باتوں کا ذکر کیا کہ پھر پھر تھک سکا ہوں سے فضل میں دیتے تھے
 اب وہ دوسرے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔
 "مہبت کرو" اکرم بولا۔

"کنا ہوں۔ مگر پیچھے میں تم سے ایک سال کر لیں۔ کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ میں اس کی بڑی چیز
 ہے۔ ایک سو ایک صحت۔ جون باغ۔ زندگی میں پہلی بدعت سے آشنا ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کو پہنچتے
 ہیں۔ اس میں کیا بڑی بات ہے۔ کیوں یہ ایک اپنی غم کا منہ نہیں بن سکتا۔ آج اس نے کھانے کے تم سب
 لوگ اس قدر غصہ نظر آتے ہو۔ تم سب لوگ اسی بات پر غصہ کرتے ہو کہ اسی تصویر بتائی جانے میں میں
 کہے کہ آج اس نے ہوں بلکہ گراں ہی نہ ہوں تو سب سے زیادہ ترقی پسند غم ہو گیا۔ سیٹ۔ جتنے
 بے ہوں گے پکڑے جتنے پکڑے ہوں گے سنا دھوا جتنا زیادہ ہوگا۔ منظر جتنے نکلیں ہوں گے
 اتنی ہی زیادہ ترقی پسند غم ہو گیا۔ حقیقت کے زیادہ قریب ہوتی جانے گی۔ تمہا کیوں سوچتے ہو۔ میں تم سے
 پر جو سکتا ہوں آج اس کا دل میں کیا بڑائی ہے۔ ہمارے پھر کا ایک شاندار حصہ ہیں۔ یہ بڑا ہے۔ لوگ آج
 اور شگیت۔ تم ان غریب المیہ سے ہمارے لوگوں کو اپنی غصہ میں اُن سے کیوں کر دم لکنا چاہتے ہو۔ لوگ
 آج ہمارے کے ہمارے میں سے متعلق نہیں ہیں۔ لیکن کہہ میں ہی تو اس میں کیا بڑائی ہے۔ کیا کوئی اور موت
 کی ہمت۔ کیا جس کی عمر وہی یا اس کی نئی طائر کیفیت ایک آج میں ظاہر نہیں کی جا سکتی یہ کس قسم کی ترقی
 پسندی ہے۔ تم کہنا چاہتے ہو کہ یہی انگریزوں کے مڑھ اور کمان اس قدر ہے ہوتے اور کھٹے ہوتے
 ہیں۔ ان کی زندگی میں موت کی جدوجہد اس قدر شدید ہے کہ انہیں ہنسنے کے لئے آج اس نے کھانے سے
 جلا ٹھنڈے کے لئے زہراں کے پاس وقت ہے۔ اس کا پاس اس کا طریقہ ہے۔ مگر۔ دونوں باتیں
 غلط ہیں اور ہم پریشان ہیں۔ اس نے پہلی تصویر میں ہماری چھدی حاصل کرنے میں اکثر کام
 رہتی ہیں۔"

اکرم نے کہا "تم پر اہ تبدلی طرح تصویریں دیکھنے والوں کے اندر بڑا ہی گھنٹی تصویروں
زہر سہاگت کر چکا ہے۔ جو حقیقت ہم اپنی تصویروں میں بیان کرتے ہیں وہ بے مدعا ہے۔ تم لوگ نہ
گول نہیں کرتے۔ مگر ایک وقت آنے کا۔"

کب وہ وقت آئے گا؟ دوسرے نے جفا کے کہا "مگر تم آج کے مسائل کو دیکھتے ہو آج کے
لوگوں کو ان میں سب سے زیادہ دل پی ہونی چاہئے۔ جب یہ مسائل ختم ہو جائیں گے تو آنے والی نسلوں کو
ان میں سہرت تارینی دل پی نہ جانے گی۔ مگر یہ غریب یہ بے مدی۔ ساشی پریشانی تو آج کے حقائق
ہیں جن میں کچھ کھڑا نہ کرنے کے لوگوں کو گہری دل پی ہونی چاہئے۔ پھر وہ کیوں تبدیلی نہیں نہیں دیکھتے
کیونکہ وہ دوسری نسل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ سارا باطل مانت ہے۔ تم ان نسلوں کو صحیح نہیں دکھائی دے
نہیں پیش کرتے اس لئے وہ غیور چپا ہونے لگے ہیں؟

"دوسرا مگر، ایسا کہ بہت سے کھلی ہیں اس طرح کی تصویریں تیار ہوتی ہیں جو موت
نے بحث میں حصہ لے کر کہا۔

"دوسرے کھلی کی نقل میں نکلے پر نکلے سے لے کر دوس میں مریکہ میں برما میں اٹلی میں
لوگوں کی دل پی کے لئے اور بہت سے سامان ہیں۔ دوس میں تمیز اسی لئے بہت ترقی یافتہ حالت میں
ہیں۔ پھر ان کھلیوں میں ٹیلی ویژن ہے۔ بھنگا ہل میں۔ اور پورا اوس میں۔ گنتی تمیز ہیں۔ شکایت اور
ناخ کی پڑیاں ہیں جو مکانات اور سیاق میں جا جا کے دلوں کے لوگوں کے نن اور ذوق کی تکیوں
کرتی ہیں۔ یہاں پر کیا ہے؟ زخمی زخمی ڈیڑھ ڈیڑھ شکایت پائی۔ ناخ کا انتظام لے دے کے حدود
طرح پر ایک نیلہ گیا ہے جس میں دس آئے فرخ کر کے قوم جاسکتے ہیں۔ اس لئے دس آؤں میں
اگر یہ چاہتے ہیں کہ ناخ بھی دیکھ میں۔ جانے بھی میں۔ زندگی کے تلخ تجربوں کے ساتھ تھوڑا سا
اس جو میں۔ تھوڑا سا جنس بھی میں۔ مگر وہاں تمام باتوں کو ایک ہی غم میں لہا ہوتے ہوئے دیکھا جاتا ہے

پڑے اور بحث ختم ہو گئی۔

اور سب کے لئے تربیت ختم ہو گئی تھی لیکن دو کاموں کے لئے یہ بحث ختم نہ ہوئی تھی۔ راست کے سائے میں جب سب سرگئے تو اکرم دیر تک جاگتا رہا اور اس بحث کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ موضوع کے انتخاب اور زاویہ نگاہ کی چٹائی میں اس کے ہاں اور اس کی طرح سرچنے والے دوسرے دوستوں میں کوئی کمی نہ تھی مگر کوئی کمی تھی تو یہی کہ وہ لوگ اپنے جوش میں یا تجربے کی کمی کے باعث یا دونوں باتوں کی درجے پر وہ کہتا پاتے تھے اُسے صحیح فہم نہ تھی کہ نہیں پاتے۔ دوسرے اور سب نے آج جو باتیں کہیں اُن میں بہت سچائی تھی۔ ہر ایک کے اپنے مخصوص حالات بہتے ہیں اس کی اپنی پچھری ضرورتیں ہوتی ہیں۔ اس کے فنون لطیفہ کی ایک مخصوص قوی ہوتی ہے۔ ایسی چیز جو دوسرے کو ملے یا قوسوں سے مستعدی جائے اُسے بھی دوسرے ملک میں جا کر وہاں کی زندگی میں اپنی جڑ پکڑنا پڑتی ہے۔ وہ نہ مڑ رہا جائے گی۔ اکرم کی ناہام فہم کی طرح ——— اس میں کوئی شبہ نہیں۔ اکرم نے محسوس کیا۔ میں نے بہت شدید غلطیاں کی ہیں۔

اکرم دیر تک یوں ہی سوچتا رہا اور بحث کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ ایک اور آدمی بھی برابر جاگ رہا ہے۔ وہ بھی اس کی طرح سوچا نہیں۔ اسی بحث کے مختلف پہلوؤں پر وہ بھی غور کرتا رہا ہے۔ وہ متیرہ رائے تھا۔ . . . اکرم کو بڑی حیرانی ہوئی۔ جب متیرہ رائے نے اس کا نام لے کر پوچھا کہ اس پہلی بحث میں متیرہ رائے نے اب تک کوئی حصر نہیں دیا تھا۔

”اکرم؟“

”ہاں۔“

”جاگ رہے ہو؟“

”ہاں۔“

”اس بحث کے متعلق میں ایک بات سرچا رہا تھا“

”کیا؟“

”ستیدائے کرٹ جیل کے اکرم کے قریب ہو گیا۔ سرگوشی میں بدلا ہنگامہ دوسرے سونے والے جگ نہ بنائیں۔“
 ”جے کوئی دل چاہی نہیں تھی۔ چہاڑی غلوں میں یا جس طرح کی غلیں قبلے دوست بناتے ہیں۔ میرا
 مطلب ہے کہ ذہنی دل چاہی تو نہیں۔ مگر کرٹشل، قبلے جب غلیں مہم ہونے لگیں تو ایک بے چارہ بدکر
 دلال کیا کرے گا“

”دوست ہے“ اکرم بلا۔

”مگر۔۔۔“ ستیدائے نے ایک لمبے وقفے کے بعد کہا ”گمراہ کی بحث سے میو یا خیال ہوتا
 ہے کہ اگر میرا مطلب ہے۔ ٹھیک طریقے سے جیسا کہ دوسرے لہجہ جوت کہتے ہیں۔ ٹھیک طریقے سے ان
 باتوں کو رکھا جائے۔ ایک غم میں تو بھائی نکلن ہے وہ غم کامیاب ہو جائے۔ چانس زیادہ ہے۔“
 اکرم چسپاں۔

”ستیدائے بلا“ کیا کہتے ہو“

”اول۔ ام“ اکرم نے جواب دیا۔

”ستیدائے آہستہ سے ہنسا“ اور نہیں ماننا چاہتے۔ خیر ٹھیک ہے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اب کے قہر
 ہم ل کے ایک تصویر بنائیں۔ ویسی ہی۔ ان نئے خیالوں کو اسی طریقے سے پیش کریں؟ کیا خیال ہے؟“
 اکرم نے کہا ”میں کی روٹی کا تو کچھ پتہ نہیں تصویر بنانے چاہتے ہیں“

”ستیدائے نے کہا“ ”میا۔ تم ستیدائے کو نہیں جانتے۔ بنگالی پس کا سمتہ۔ دنیا کو ہاروں کا ایک ہنسنے
 میں دو ٹیری ٹیری دھمی دھمکتے ایچک دھل گا۔ اور سیر کی ٹیری ٹیری (سمند پار کے طاقے، تاروں ہنگی
 بجاتے جاتے گا۔ اور اس کے بعد بنگال۔ بنگال میں اہر نیند گھوش ڈسٹری پر ٹر میرا پناہ دوست ہے

”جب وہ ٹیری لڑیاں سن گئیں تو ہرزناس مابیل کن کیا نکل ہے رکھا۔ بانڈھا۔ تا۔ کہینا اور کچھ کے
بھٹو یا کہ جاتو چٹا گلے رہو“

اپنی انکیم سرگشتی میں بیان کرتے کرتے تھیانے اس قدر جوش میں آگیا کہ اس نے آخری فقرہ
بہاں چٹکے کہا۔ اس کی پاٹ دلدادہ اس کے جوتے پر سونے ہوئے دوسرے تھی بکہ اس پاس کے
ہستے لوگ جاگ گئے اور چوہ کی صدا میں بند ہو گئے۔ گرا کر مٹے جس کرب کر بتایا کہ کچھ نہیں ہوا
تھا۔ تھیانے خواب میں بکلا ہوا تھا۔

”دیکھتے جاتو میں بکلا نہیں ہا ہوں ایک صف میرے خواب غور پرا ہوا“ تھیانے نے لالہ صوفی کے
ساتھ سر ملاتے ہوئے کہا۔

اور واقعی صوفی کے ایک ماہ گزرا جیگا کہ تھیانے اپنی تصویر کی مدد ٹیری لڑیاں بیچنے میں
کامیاب ہو گیا۔ جیسا اس نے وعدہ کیا تھا۔ ایک تو اس سے دوسری بھال کی ٹیری لڑی اس نے بیچ
دی اور کزنیک کے کرم کو دکھایا۔ اس کا کزنیک میں تصویر کا نام تھا ”طوفان“ اور اس کا ڈولکر
اکرم تھا۔

اکرم ہوا۔ مگر تم نے مجھے بتایا نہیں اور ظم کا نام رکھ دیا ”طوفان“ طوفان کی کہانی کیا ہوگی؟
”اب میں کیا جانوں“ تھیانے نے بڑی مسائی سے کہا۔ ”اب کہانی تم بتاؤ۔“ ڈسٹری پر ڈر کہانی کا نام
پوچھا تھا۔ ہم بتائے کزنیک کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے ظم کی نام بھی دینا پڑا۔ میں نے پتا نام نہ دیا۔
تھیانے ہنسنے لگا۔

”اگر کہنی کا پتہ؟“

”سفرِ فٹ پاؤں پہنی۔ فی الحال تو یہی پتہ ہے“ مثیلہ نے ہنس کر کہا ”مگر تم دیکھتے پاؤں اسی طرح ایک
ذایک مددِ نفاض بھی ماسل کریں گا“

”سپ ہپ ہڑے؟“ اکرم اندر سے ہلایا۔

”خدا کی ست کر دے حال ہیٹ بھیدہ ہے“

”ہاں؟ کیسے؟“ اکرم نے پوچھا۔

”بات یہ ہے کہ اکابر داری روڈ پر ایک سنگی سیٹھ کی پیڑھی ہے۔ میں وہاں پیڑھی پر گیا تھا۔ سیٹھ نے
کہنے لگے کہ سیٹھ پوڑو بسروں کو پکڑ کر دی رکھ کر اس پر روپیہ دیتا ہے۔ میں نے اس سے بات کی تو
ہلکی پکڑ کو نفاض کرنے کے لئے تیار ہے۔ اس نے مجھے کہانی بھی سنی۔ کہانی اسے بہت پسند آئی“
اکرم نے کہا ”تم نے اُسے کہانی بھی سنائی۔ کیسے؟“

”بوسیرے ہی میں آیا میں نے بڑا چڑھا کر اُسے سٹوایا۔ ان سالوں میں تم جانتے ہو جب میں اپنی باتوں
پر آجاتی تو کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں نے ایسے کرتے گئے انھوں نے اُسے کہانی سنائی کہ وہ وہاں پر
پت ہو گیا۔ اُس نے میرے گھٹے پکڑ لئے۔ بلا۔ ستیہ بابو ایسی کہانی میں نے زندگی میں نہیں سنی۔ میں نے
کہا تم کیا جانتے ہو۔ یہ کہانی کسی جھوٹے موٹے ٹیلی ٹی وی کی کہانی نہیں ہے۔ اسے یہ کہانی انٹرنیشنل شہر
پانڈراپ ادب شاعر سندھوستان۔ پاکستان چین۔ جاپان اور افغانستان کے عظیم فن کار جناب اکرم بابو کی ہے۔
اکرم بابو تم جھوٹو مارو۔ میں نے قیلا جھنڈاٹ پاؤں پہنی سے اٹھایا۔ ہمالیہ پر گاڑ دیا۔ ہمالیہ سے اٹھایا ایشیا
پر گاڑ دیا“

”مگر کہانی کسے سنائی تم نے؟“ اکرم متکڑ ہو کر بولا ”کہانی تو —“

”ستیہ لائے اس کی بات کاٹ کے بولا“ گھبراؤ نہیں اکرم بابو۔ کہانی وہی تیار ہوگی جو تم چاہو گے۔ ان

یہ سہولت کبائی کہاں یا دیتی ہے اور اگر یا رہے گی بھی تو کہہ دیں گے ہم نے بعد میں بدل دی۔ اس وقت بہت سا جڑا کام تو تھا جس ماحول کرنا ہے۔ سراپا یہ

”مگر سراپا کیسے حاصل کیا جائے۔ یہی تو سب سے بڑی مشکل ہے“ من جیت سنگھ نے کہا ”ایک ہے سردار گو کہ کچھ سنگھ۔ کھڑی کا نثر کچھ تھا کسی زمانے میں۔ مگر وہ صرف ٹیکسیوں پر رو پڑ دیتا تھا“

”ارے ان دو پار ہزار سے کیا ہر گا“ متیہ رائے نے مسکرا کر کہا ”من جیت سنگھ ہی یہاں تو رکھوں گی بات ہو رہی ہے۔ کم از کم ایک لاکھ ساٹھ ہزار چاہئیں“

جسوت نے کہا ”تم اس پڑھی دلائے بیٹھکی بات کر رہے تھے“

”ہاں! وہ تیار ہے ڈیفہ لاکھ دینے کے لئے۔ مگر ایک ٹیری ٹوری ایویک جاتے جب دے گا۔ کہتا ہے شمالی ہند کی ٹیری ٹوری بنگ کے دکھاؤ۔۔۔“

”تو بنگ کے دکھاؤ“ دھوت بولا: ”دو تو تم نے بنگ ہی ڈالی ہیں۔۔۔“

”ارے میرا میں چلے تو میں بھولی پڑی ہی بھی تے کے دکھا دوں مگر میرے ہاتھ میں بھی تو کچھ ہو مجھ سے شام تک مگر سٹ اپنی، بیڑی، خرمپ نہیں چلا۔ خیر وہ سب چھوڑو متیہ رائے یہ کہہ کر گھٹک گیا اور خچیدہ ہو کے بولا ”بات یہ سب دوستو کہ پچاس فی صدی کام ہو گیا ہے۔ اب پچاس فی صدی کام باقی ہے۔ اس میں کچھ تھوڑی سی عدم دم لگ کر دو تو جینڈا ایشیا پرنٹز جائے“

”کیسے؟“ فضل نے پوچھا۔

بات جیت چکر کچھ نم کے بارے میں ہو رہی تھی اس نے بنا بالکل غائوشش بیٹھی تھی۔ اس غلم کا تذکرہ سن کر رنجیہ جو تیسرے برائے بیٹھی تھی۔ اس نے ابھی ابھی سر دھویا تھا۔ اس نے اس کے بال کٹھے اور گیلے تھے۔ اور وہ اس ماری گنگو کو غور سے سنتے ہوئے بار بار تو نے سے اپنے بالوں کو کھانی جاتی تھی۔ باہرام کی بھی زندگی دکھاہوں سے اس کی طوت دیکھو لیتا۔ اس کا چہرہ اس وقت ایک سو تم کتے

کی طرف لاپٹی دکھائی دے رہا تھا۔ بنانے کے بعد جولن صحت کی دھت میں جزا لگی اور بھارا جاتا ہے۔ اس نے باورام کو بالکل بہت سا کر دیا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جتنا بھیجے وہ اس کی جلد کی خوشبو تک سونگھ سکتا ہے۔ وہ بار بار نظر فرما کر اس کی طرف دیکھ لیتا کہ جب دیکھتا تو سر سے پاؤں تک اس کے بدن میں آگ سی لگ جاتی۔

”دیکھو میں غمیزنس کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں“ ستیہ لستے نے سب کو سمجھانے ہوئے کہا۔ ”یہ تیسری ٹیری ٹری اس طرح نہیں کہے گی جیسی یہ پہلے دھپک گئیں۔ نہ پڑھی ولا سیٹھ اس طرح غماض کرے گا۔ اب وہ موقع آگیا ہے کہ ہمیں بڑنگ پانگشی میں ایک کر دیا جائے۔ وہ ٹھی دفنوں کا گلا ہے۔ ہم ڈسٹری جوئرنگ وہاں پر دفن آتے ہیں۔ یہاں دفن لینا چاہیے۔ میں نے بڑنگ کے خبر سے بات بھی کی تھی صرت تین ماہ کا کرنا چاہیے دینا پڑے گا۔ پرنسے پانور دیر پر کچھ فرخچ بھی چاہئے۔ وہ تو خیر کرائے پر آ سکتا ہے ایک چمڑی رکھنا پڑے گا۔ پہلے دفن میں دن دفن کھولا جائے گا اس دن اس کا بہت اچھا ہوگا۔ میں بہت سے ڈسٹری جوئرنگ کو بلاؤں گا۔ اس دن پڑے بانٹے جائیں گے۔ ایک پچاس روپے کا درجہ اس دن ہر گھوڑے میں بھتا ہوں ہمارے پاس اگر شل سات سو پڑے ہوں تو کام چل سکتا ہے۔ تیسری ٹیری ٹری پک سختی ہے۔ ہر گھوڑے پک سختی ہے۔ جتنا اگر آ سکتا ہے۔“

”سات سو پڑے اکٹھے کرنا ناممکن ہے۔“ اکرم بولا

”کیا ناممکن ہے۔“ نصیب نے جوش سے کہا۔ ”پانچ روپے میں دیتی ہوں۔ جس روپے میری پہلی خریدی ہو گی میں روپے میری بیل کا ترہوے گا۔ چونتیس روپے تو ابھی میرے نام لکھو۔“

”بھرتے۔“ جسزٹ آئی بھاکے بولا۔ ”مختی صحت شرم دلا رہی ہے۔ اب تو کچھ نہ رہی پڑے گا۔ کیوں دھوت؟“

”میں چاہو پے وہاں کا۔۔۔ دھوتے اتنا باغ سنا کر بولا۔“ لیکن میں اپنی جگہ میں بات کروں گا

اگر مزدوروں کی بھری بات آگئی تو۔۔۔۔۔ پہلا تارکائی بھی قریب آ کر بیٹھتا ہے نہیں کہوں جا۔۔۔
چونتیس چارائیاں۔۔۔۔۔ مکرم ہوا۔

فضل ہوا۔ ”میں اگلی ریشم تو نہیں دے سکتا لیکن جردوز کی کمان سے ایک روپیہ دے سکتا ہوں۔ ایک
ہینڈ ٹک۔“

”فضل؟ تیس روپے؟ اے سالے!“ من بیت ٹکے مہدی سے تازہ گھا کے ٹھکانوں کو کافی بہت بڑی
رقم بونے والا تھا کہ یکایک اسے اپنے چھوٹے بھائی کرنا کا خیال آیا اور اس کا سونہ کھلے کاٹلہ رہ گیا۔
اس کا چہرہ جو اس وقت شادمان اور ایک سہرت آمیز ٹک سے تاباں نظر آ رہا تھا یکایک بجھ گیا۔ ایک ماہ
سلاس کے چہرے پر آگیا۔ اس نے یہ یکایک اپنا کٹلا ہوا سونہ بند کر لیا۔ سر جھکا دیا اور ہوا۔ میں۔۔۔۔۔ میں
۔۔۔۔۔ دس روپے سے زیادہ نہیں دے سکوں گا۔ وہ جی بیٹھے بھریں دلی محافل کی طرح بڑا بھائی
کھنکھناتا۔۔۔۔۔ وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ فضل نے اسے گلے سے لٹایا۔ اس کی پیٹ پر تھپی دے کر
ہوا۔ ”اے ڈھونگی کے دس روپے تم میں کیا؟ تمہاری طرف سے میں تو اکیلا ہوں۔ تیرے اچھے کرنا کرنا کی
پڑھائی کا خرچہ ہے۔ کیا تم نہیں سمجھتے ہیں؟“

جسوت ہوا۔ ”آٹھ آنے روز کر کے ایک بیٹے کے لئے بھروسے ہی لیتے جاؤ۔“

”واہ! واہ!“ رضیہ نے نقد سے کان بھائی۔ پھر وہ باہرام کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”اور تم۔۔۔۔۔ تم کیا
دو گے؟“

باہرام دودھ روپے کہنے والا تھا مگر جب اس نے رضیہ کو مخاطب ہوتے دیکھا تو وہ بالکل ٹھہر
سا گیا۔ اس کی زبان بند ہو گئی۔ رضیہ کا میٹھا حشر تم سرائے کے کمانے کا۔ ”تم کیا دو گے؟“ ”تم کیا
دو گے؟“ اس کی آواز اس کے کانوں میں دیر تک گونجتی رہی۔

یکایک باہرام نے ہٹلے کہا۔ ”میں روپے۔“ وہ اتنی زور سے براہ کرا سے خود بھی اپنی آواز پر حیرت

ہوئی دوسروں کو اس کی آواز پر نہیں اس کی بیانیہی پر حیرت ہوئی۔ بابرام میں روپے۔ وہ جسے لگا کیسے؟
جسوت نے کہا ”کچھ کم کرو گلاباٹ میں زیادہ بول گئے ہر شاید“

”نہیں نہیں“ بابرام نے اکڑ کے کہا ”میں میں ہی دوں گا۔ چاہے اس پہلی کو لے لو“
”اور جہاد دیکھی تم؟“ رضیہ نے مڑ کر جناح پر چھا اور بابرام کو بے حد افسوس ہو کر رضیہ نے اس کی
بیانیہی اور حرکت پر تالی نہیں بجاتی۔ وہ اسے اس طرح بھول گئی جیسے وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ اسے دوسرے
لئے میں اپنی سماعت پر سخت فضا آیا۔ وہ خواہ مخواہ میں روپے بول گیا۔
”اسے یہ کیا دے گی“

من جیت سنگ جواب تک نیم دراز حالت میں چوتھے کے ایک طرف لیٹا ہوا تھا۔ یہ ایک اٹھ کھڑا
ہوا۔ سب ہاتھ تھے کہ من جیت سنگ کو جناح سے بڑی نفرت ہے۔ وہ جب ہی کا پڑھنے والا۔ پورا پاٹھ کا
پر سیاہ باتا۔ دگر دوسرے ہاتھ والا۔ دھرم کرم کا سچا سادہ لوح بکھ تھا۔ اسے جناح سے اس کے بیانیہی کی
وجہ سے نفرت تھی۔ ہاں سچی میں بھی جب اس نے دیکھا کہ وہ کتنی کتنی سمجھے اور کس طرح ایک ایک
پانی پر جان دیتی ہے تو اس کی نفرت اور بھی بڑھ گئی۔ مگر اس کے ساتھ اور دوست اس کے اس دیتے
کو پسند نہیں کرتے تھے اور وہ جناح سے جہاں تک ہو سکے سنی کے دوسرے عام لوگوں سے بہتر سلوک
کرتے۔ اس نے من جیت سنگ بھی اس کی موجودگی کو چوتھے پر برداشت کر لیتا تھا۔ پھر گرجنا ہے
جنت پر جان دیتی تھی گرجا کے کئی طرح کے کام یوں ہی کر دیتی تھی۔ لافین کو صاف کر کے چوتھے پر
لٹاتا۔ چوتھے پر چھاؤ دینا۔ ان کے کڑوں کی حفاظت کرنا کیوں کہ وہ سب لوگ تو اپنے کام سے باہر
پلے ہاتھ تھے تو وہی ان کی جھونپڑیوں کا خیال رکھتی تھی۔ ان میں سے اگر کوئی بیمار پڑ جائے۔ اور ایسا کم
ہوتا تھا۔ تو وہ دوا دلاتی تھی۔ ان کی تیمارداری کرتی تھی اور یہ سب بالکل خاموشی سے۔ چپ چاپ
بیک لٹکا ہونے بہتر عمار جہاں اس قدر خاموش رہتی تھی گریا اس کے مونہہ میں نہاں ہی نہیں۔ بس خالی

ہوں ہاں! نہیں ہے اپنا کام چلتی تھی۔ اس کے بعد رفیع نے جتنا سے بڑا تو پیشتر اس کے کہ جتنا چاہتی تھی
 من جیت سنگھ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا: ”اسے یہ کیا کنوس نکھی ٹرس عورت کیا دے گی۔ اسے
 اس کا دمن ست لڑتے باور تباری پکھر لیا، ہو جائے گی۔ یہ تو دھیلے دھیلے پر جان دیتی ہے۔“
 سب نہیں پڑے کیوں کہ یہ جی تھا، جتنا واقعی سچے پیسے کے بدلے میں بڑی کنوس تھی۔

”اب مت کہو“ فضل نے جتنا کو ٹھپاتے ہوئے کہا: ”جاری جتنا اگر ملنے پر جائیں تو تباری ساری
 پکھر خود بنا ڈالیں۔ جو نپڑت میں اتنا ذریعہ بارود پیر پار کھا ہے۔ جانے مرنے کے بعد ہم میں سے
 کس کے نام وصیت کر کے جائیں گی۔“

پھر سب پہننے لگے مگر رفیع نہیں بٹھی بلکہ اس کے ہاتھ پر نہی پڑ گئے۔ اس نے ہما ہو کر کہنے لگے
 کہا: ”اجتا مذاق ہانے دو سنی۔ بولو تباری کتنے روپے دو گی تم؟“ رفیع بڑی حاجت سے بولی۔
 جتنا کے ہونٹ کانپے۔ اس نے اپنے سونگے ہونٹے بونٹوں پر زبان پھیری۔ آتش بار لگا ہوں سے اس
 نے من جیت سنگھ کی طرف دیکھا اور بولی: ”ایک روپیہ۔“

”انقلاب زندہ باد!“ من جیت سنگھ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کے بولا اور پھر اکرم کی طرف ٹکے کہنے لگا غضب
 ہو گیا اکرم باہر، یعنی میں تم کو انقلاب لے آئے۔ ابھی تک جتنا نے ایک روپیہ تو کیا ایک چھلوم تک کسی نیک کام
 کے لئے نہیں دیا تھا۔ یہ تم نے کیا کر دیا۔ میرے خیال میں تو یہ بڑا کام پر۔۔۔۔۔“

”ہی اچی!“ رفیع نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ من جیت سنگھ گواپا فقرہ پورا نہ کر سکا پھر ہی جتنا نے بھر
 لیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ وہ غصے سے اٹھ کر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد رفیع نے کہا: ”تہیں ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا۔“

”ہاں! ہاں! یہ بہت بڑی بات کی تم نے!“ باہرام نے رفیع کی تائید کی۔

”اچھا یاد۔ من جیت سنگھ ہمارے بولا“ آئندہ نہیں کہوں گا۔ اب تم آگے چلو۔“

وہ ہمیشہ ہی کہتا تھا آئندہ نہیں کہوں گا مگر پھر کیا تھا۔ لوگ اس کی طبیعت کی کمزوری سے متاثر تھے، چپ ہو رہے۔ اکرم نے کہا "میں ابھی کچھ نہیں دے سکتا۔ مجھے صبروت کے بہت سے روپے ادا کار دینے ہیں۔ اس رقم کے چکار دینے کے بعد البتہ . . ."

ستیرہ رائے نے چلا کے فوراً کہا "ارے تم سے تو بہت سے کام لینے ہیں۔ کبانی بیسز روپے کھالے ڈیٹ کاری سب تمہاری ہوگی۔ تمہیں تو تم اپنے پاس سے کچھ دوس کے "پھروہ پٹ کے بوا" طلب کرو کتنی رقم ہونی ہے۔ یہ سب رقم میں دوستوں کو واپس کروں گا۔ ایک ایک پانی۔ سود میت۔ بچکر منسر ہو جانے کے بعد میں پروڈیو سودوں گا۔ اکرم ڈائریکٹر ہوگا۔ رنویہ کا ایک شان دار رول ہوگا۔ اکثر لوگوں پر ایک پانی خرچ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جی کے سب لگ جاسے ساتھ فلم میں اکثر لوگوں کا کام کریں گے وہ رادیو صاف یوں نچ جاتے گا۔ ایشیا پر جیٹا آگڑ جاتے گا"

اکرم کا فخر پر حساب کرنے لگا۔ رنویہ نے توڑے سے دو ایک بار باروں کو جنگ کر جنگ کرتے رہے ان کو جیٹہ بانو دیا۔ باہرام اس کی گردن کے صراحی دار غم کو دیکھنے لگا اس کا بھی چاہا کہ وہ اس فخر پر آہستہ سے اپنی انجلیاں پھیلا دے۔ اتنی زندگی گزر گئی تھی۔ آج تک کسی جوان عورت نے اس کی طرف منکرا کے نہ دیکھا تھا۔

اکرم نے کہا "ایک سو تین سو روپے ہوتے ہیں۔"

"ابہ میں چاہتیں سات سو روپے" ستیرہ رائے نے بڑی آداسی سے کہا۔ جیسے اس کی بلند بلا میلو کا قصر کا ایک زمین پر آگڑا ہو۔

سب چپکے ہو گئے۔ پانچ دس۔ بیس، سو کی بھی بات ہوتی تو وہ لوگ کچھ کرتے مگر اسٹے چور سو روپے۔ بہت زیادہ فرق تھا غراب میں اور حقیقت میں۔ امیتھ میں اور سلامت میں۔ آسمان میں روز زمین بہت زیادہ فاصلہ تھا۔

سب کے سب میرے پاس آکر اس فکر آنے لگے۔

اکرم نے وہ کانڈ کا پرندہ نکڑے نکڑے کرتے ہوئے ترش رو ہو کر کہا ”ہٹاؤ۔ گولی مارو“

لیکن اس کے چند ماہ بعد جب نئے ماہ کی پہلی تاریخ کو دھوئے نے اکرم کو تین سو روپے لاکے دے کر وہ چونک پڑا۔ دنگ رہ گیا۔ اور جب دھوئے نے اسے بتایا کہ یہ تین سو روپے مزدور دال نے اپنی غول پیسنے کی کمائی میں سے دو دو پار پار کئے کر کے دئے ہیں تو اکرم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اکرم نے روپے گن کے ستیرے دئے کو دئے۔ ستیرے کا جہرہ اس طرح کھل گیا جیسے کسی نے اس کی آنکھوں کے اندر کا بھاہر اب آکر کر نیا باب روشن کر دیا ہو۔ اس کا جیٹا چھلچھلہ چہرہ خوشی سے چمکنے لگا اور اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا ”مجھے کھلایا!“

رضیہ بولی ”میں نے اپنے ہاں ڈالسنہز یونین میں بات کی تھی۔ وہ لوگ ہماری تصویر میں منت کام کریں گے۔“

”بھڑے!“ اکرم نے ہلکی جہانی۔

”ابہاں۔ یہ دس روپے رضیہ نے دئے ہیں“ رضیہ نے اکرم کو دس روپے دئے۔ اکرم نے ستیرے دئے کو دئے۔

”زمانی تین سو ابھی ابھی“ اکرم نے سوچتے ہوئے کہا ”کہاں سے آئیں گے؟“

”سوہیں گے! سوہیں گے!“ ستیرے دئے نے خوش ہو کر کہا ”غیر باز۔ میں کل جاکے نہیں بلانگ

کے سینہ سے بات کرتا ہوں۔ شاید وہ کم ایڈوانس یعنی پیرامی ہو جائے ؟

وہ رات بہت تاریک تھی۔ آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ بارش کم تھی مگر ہوا کے زہد سے اس قدر تیز فزٹوں میں آئی کہ لوگوں نے ہستی میں اپنی جھونپڑیوں کے دھواڑے بند کرنے تھے اور اندھ چٹے سب بے تھے۔ صوف اکرم کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ وہ رات کے ستارے میں اپنی جھونپڑی کے صوف سے پرکھڑا دھواڑا سانسوں کی طرف نگہ رہا تھا جہاں طوفان کوڑک رہا تھا۔ بجلی چمک رہی تھی، اور ہوا بارش کی ہوجھاڑیں اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے سارے شہر میں ایک دیوانہ وار مستی کے عالم میں ناچ رہی تھی۔ اکرم خیالوں میں گھویا ہوا تھا۔ وہ اس وقت چڑھا جب اس نے دیکھا کہ جناح اس کے پاس کھڑی ہے اور انہیں اٹھانے اس کے چہرے کی طرف نگہ رہی ہے۔ اکرم کو معلوم تھا کہ بنا رات کو نہیں سوتی ہے۔ پھر بھی وہ اس طرح جناح اپنے سامنے دیکھ کر چنک گیا۔

جناح نے اپنے بے راخت کے سوزھوں سے سکراتے ہوئے پوچھا "نیند نہیں آئی ؟"

"ہاں! ——— ہاں!"

اکرم ان باتوں میں گھویا گیا۔ وہ بڑھی چلیاں جنہوں نے ہائے کسی کسی زندگی دیکھی تھی۔ وہ بکلوں کے بغیر پہلے کسی ان آنکھوں میں دھڑکی تھی۔ ان آنکھوں پر کبھی صفت آراستہ چلیاں کہتے تھے اُن کو، مگر کر۔ اُن کو، مگر کر فوجوں دلوں کو مستحکم کر دیتی تھیں۔ جناح اس کاڑی کی رہنے والی تھی؛ شاید اس کا کوئی باب بھی تھا۔ کوئی باب۔ کوئی بہن۔ کوئی بھائی۔ ———؟ پھر کیا ہوا ———؟

اکرم ان باتوں میں گھویا گیا۔

جنانے اپنے پرڑوں کو چہلاتے ہوئے جو کرم کو بڑے منہکا فیزے معلوم ہوئے، آہستہ سے کہا: ”تم کہیں کہانی
سوتلا رہے ہو؟ اپنی فلم کے لئے۔۔۔۔۔؟“

”یہ ایک کہانی ہے کسان اور اس کی زمین کے متعلق“

”کسان؟۔۔۔۔۔ زمین؟“ جنات نے آہستہ سے سوالیہ انداز میں دُہرایا۔ پھر اپنے آپ سے کہنے لگی
”میں ایک کسان کی بیٹی تھی“

پھر وہ چپ ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر پوچھا ”اور اس کہانی میں لڑکی بھی ہوگی۔۔۔۔۔ یا لڑکیاں
ہوں گی؟“

”ہوں گی!“ اکرم نے جواب دیا۔

”تم کیسے ان کے ساتھ سلوک کرو گے؟“ جنات نے لاپرواہی سے پوچھا۔

”کیا مطلب؟“ اکرم نے پوچھا۔

”جناہوں!“ میرا مطلب ہے۔ وہ کہیں لڑکیاں ہوں گی۔ مردوں کے کھلنے یا انہن؟“

اکرم نے چونک کر حیرت سے جنات کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتا ہی گیا۔ دیکھتا ہی چلا گیا۔

”جواب دو!“ جنات کی آواز میں خدا کی سختی تھی۔

”انسان!“ اکرم نے آہستہ سے کہا۔

جنات نے وہ لائینیں اوپر اٹھائی۔ اوپر اٹھائی۔ لائینیں بائیں کرم کے چہرے کے سامنے آگئی۔

اتنے میں بجلی کا ایک چمک اٹھی۔ زور کا زور کا ہوا۔ بجلی کا کونڈا شہر کے چاروں طرف پھیل گیا۔ اکرم کی آنکھیں
بے اختیار بند ہو گئیں لیکن سب کچھ تو وہ پراسی بڑھیا کی لائینیں دیکھ رہا تھا۔

بہت دیر کے بعد بڑھیا نے سانس لے کے کہا ”بھئی نہیں ہے۔ بھئی نہیں ہے! تم ان

انسانوں کا ساملوٹ کرو گئے“

پراس نے ہاتھیں نیچے کر دی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی چوٹی میں ہاتھ ڈالا اور تین سوکے نوٹ نکال کے اکرم کے ہاتھوں میں دے دئے۔ ”جاؤ فہم بناؤ۔ جگوان تمہیں کامیاب کریں۔“ اور وہ جلدی سے قدم مڑے تیزی تیزی اپنے جھوپڑے کی طرف چلی گئی۔ یکایک بارش کے ایک تیز تھپڑے سے لاشیں جھونکی اور چاندل طون اندھیرا چھا گیا۔

مگر اُس رات بہت دیر تک اکرم جھوپڑے کے دروازے پر کھڑا رہا اور حیران ہوتا رہا۔ اس کے ذہن میں سیڈم آئی۔ اور پھر صورت جس کا نام جتنا تھا۔ وہ سیٹھ میں کا نام باخڑیا تھا۔ اور یہ کیسی ڈرا تھیر جس کا نام فضل تھا۔ من جیت ننگ تھا۔ وہ بچن دت جس نے اپنے لوگ گیتوں کو بچا دیا تھا۔ اور دھوئے اور موت کتنے ہی چہرے تھے اور پڑانے قطار اندر قطار آنے سے سامنے اس کے سامنے کھڑے ہوتے گئے۔ اور وہ ان دونوں دنیاؤں کے نیچے میں دروازہ پر کھڑا رہا اور حیران ہوتا رہا ہر ایک آپنی دلد میں بجلی کے کونے کی طرح اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اُسے کدھر جانا ہے ؟

یکایک دروازے کو چھوڑ کر اکرم باہر گئی پلا آیا۔ بارش کے تیز تھپڑوں نے اُسے فردا جگودیا۔ مگر اکرم نے ذرا پرانا کی یکایک سڑت کی ایک رکبتی ہوئی لہر اس کے سارے جسم میں پرتی ہوئی چلی گئی۔ اور جب بادل گرجا تو اس نے اپنے سینے کے ٹٹن کھول دئے اور اپنے دونوں ہاتھ خوشی سے کسمان کی طرف اٹھا دئے اور بے تھوون کے الفاظ میں کہا ”میں آدمی ہوں اس لئے میں بادلوں کی طرح گرجوں گا اور اتنی ہی گھبر، بلند اور بلند مال موسیقی قہیر کروں گا۔“

وہ دن کتنا عمدہ اور آسودگیوں سے بھرپورا تھا جس دن ستیہ رائے اور کرم نے اپنی کمپنی کے دفتر کا نیا بندنگ میں جھڑپ کیا۔ ان کی جان بچان کے غم کے بہت سے لوگ اس موقع پر موجود تھے لیکن ایک نیا عنصر بھی موجود تھا جو اس سے پہلے ایسے موقعوں پر کسی نے نہ دیکھا تھا۔ یعنی من بیت سنگہ کیسی ڈائریڈر۔ دھوئے ٹیکسٹائل مزدور۔ جس وقت ٹاٹسٹ۔ بابو رام، فضل اور ستی کے بہت سے مزید کارکنان موقع پر موجود تھے۔ چنانچہ ان کی مدد کرنی یونین نے اس موقع کے لئے اپنے تین نمائندے بھیجے تھے۔ ڈائریڈر یونین، اکثر لائیو یونین اور اسٹینڈرڈ یونین کے نمائندے بھی موجود تھے۔ اور ان لوگوں کی تعداد شاکر سنگھ کی پٹوں اور دو گھوڑا بٹنی کی قیوں اور اسٹیل یا نقلی سونے کے ٹین پہنے والوں سے کہیں زیادہ تھی۔ یہ لوگ بول پال، خراج اور سنگ روپ کے اعتبار سے بھی گھروڑے، اکثرے، بہت اور توڑندہ نظر آتے تھے۔ لیکن آج یہ سب گڑبے سے خوش نظر آتے تھے۔ دفتر کا کمرہ ان لوگوں کے ہمراہی ٹھکانوں سے معمور تھا۔

ایک کونے میں جہانمید و مرقی پہنچے۔ سبھی مٹائی مٹھی تھی۔ بہت دنوں کے بعد آج وہ دن کہ بھی جاگ رہی تھی۔ اُس نے پہلے تو آنے سے انکار کیا تھا۔ مگر تیار مائے اس کے ساتھی نہیں لانے زندہ گی میں جہانم کے لئے شاید یہ سیلا موٹہ تھا کہ وہ بہت دیر لوگوں میں اس طرح عزت سے بطور ہی

حق۔ بلکہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں اور وہ انہیں آہستہ سے اپنی سفید دھوئی کے اُبلے ٹیڑے پر چڑھتی۔ بستی میں تو وہ اگر غلط نہیں تو کم از کم بے حد میلے کپڑوں میں رہتی تھی۔ ہاں یہاں پہلی مرتبہ جانے کتنے سالوں کے بعد وہ ایک سفید دھوئی ن کرائی تھی۔ اسے ان لوگوں میں بیٹھ کر ایسا محسوس ہوا جتنا کہ جیسے خود اس کی مودخ سفید اور اُبلے ہو گا۔ ہے۔

جب دفتر کا مہورت ہو چکا اور پڑھے بٹ چکے اور لوگ اکرم اور ستیہ رائے سے ہاتھ ہلا کے مبارک بارے کر چلے گئے تو سردیش پر اپنے اکرم اور ستیہ رائے کو دفتر کے باہر چھنہ ہونے پر کمرے میں لے گیا اور کہنے لگا۔ ”تم جانتے ہو، سیٹھ نے سٹوڈیو کے ملازمین کو چار مہینے سے تنخواہ نہیں دی۔“

”ہوں“ اکرم نے کہا۔

”ہاں کسی نہ کسی طریقے سے ان چار مہینوں میں ہم کام چلائے رہے۔ مگر جب پانی سرے گزر گیا تو ہم نے سیٹھ کو ہڑتال کرنے کی دھمکی دی۔ سیٹھ بلا میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تم کچھ سٹوڈیو تیار ہے تم اسے چلاؤ۔ اس کا خیال تھا شاید ہم اسے چلا نہیں سکیں گے۔ ہم لوگوں نے ایک منگ کر کے سٹوڈیو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔“

”مگر تم کیا اسے چلا پاؤ گے“ ستیہ رائے نے پوچھا۔ ”ایسا نہ ہو۔ جیٹا کیس بہت لیرے اٹھے اور کپڑے میں گر جاتے۔“

سردیش نے مسکراتے کہا۔ ”نہیں ایسا نہیں ہو گا۔ ہم نے بہت سوچ بچ کے ایسا کیا ہے۔ ہم نے سٹوڈیو درکنز کی ایک کواپریٹو بنائی ہے اور یہ کواپریٹو اب سٹوڈیو کو چلائے گی۔ ایک سال کے لئے ہم نے یہ بھی سوچا کہ سیٹھ سٹوڈیو کا کرایہ بہت لیتا تھا۔ ساڑھے سات سو روپے روزانہ تو ہمیں ملتا تھا۔ تو آؤ نا تھا لوگوں کو۔ ہمیں کوئی ٹرانزاکشن ہے نہیں۔ ہم نے سٹوڈیو کا ریٹ گھٹا کر چھ سو کر دیا ہے۔“

”بہت اچھا کیا“ اکرم بولا۔

’سودیش نے کہا۔“ اب میں اصلی بات کی طرف آتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم لوگ کس طرح یہ تصویر بنا رہے ہو۔ کس طرح کے تم لوگوں کے عزائم ہیں۔ کون لوگ تمہاری مدد کر رہے ہیں اور کون کون سے چاہیں گے۔ ہم لوگوں نے فیصلہ کیا ہے۔ اگر تم لوگ ہمارے شوڈیو میں تصویر کی شوٹنگ کرو تو ہم تمہیں پچاس فی صدی امداد دیں گے یعنی چھ سو روپے۔ اس میں سے تمہیں ایک شوٹنگ کا صرف تین سو روپے ملے گا۔ باقی تین سو منہرہ کے لئے۔“

اکرم نے نودہ سو روپے سودیش کا ہاتھ پکڑ لیا اور سودیش نے اس کا۔ اور دونوں نے یہی حکم دے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ ایک بڑا ہی مضبوط معاملہ تھا۔ اکرم کو معلوم تھا کہ شوڈیو کے مزدور کتنی ہیرانی کر رہے تھے۔ اس تصویر کے لئے اپنی روز مزد کی ناکافی تنخواہ میں سے بھی میں ہزار روپے امداد اس کے لئے دے رہے تھے۔ ستیہ رائے، اکرم اور سودیش دونوں سے منہ گر ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو برائے اور اس نے ہلکے کہا۔ ”کاڑیا جیٹا کا لڑیا۔ میںیں بلڈنگ سے اٹھایا اور ساری فلم انڈسٹری پر ملا دیا۔ اب دنیا کی کوئی طاقت میں شکست نہیں دے سکتی۔“

وہ اتنے زور سے جھپٹا کر آہیں پاس کے دفاتروں کے باہر بیٹھے ہوئے بہت سے اونچے ہوئے چپراسی جاگ گئے اور چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ کئی لوگ قراپنے دفاتروں سے باہر نکل آئے۔ سودیش اپنے مسکرایا اور وہ ستیہ رائے کی بن میں ہاتھ ڈال کر اسے واپس دفاتر کے اندر لے گیا۔

شام کے قریب جب اکرم، رہہ کر کے چرچ گیٹ جانے والا تھا، جہاں موہنی دہستان میں۔ وہی نے اسے چائے کی دھن دی تھی ایک لاکھ اس کے دفاتر میں آئی۔ اس کی ٹھوڑی چھوٹی تھی۔ ہنسنا پچھتے ہوئے لیکن آنکھیں بڑی بڑی نوروز نشین۔ وہ آتے ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اجازت لئے بیٹھ کر کہنے لگی۔ ”مجھے کام چاہئے۔“

”ہوں!“ اکرم نے جواب دیا۔

”میں کھا سکتی ہوں۔ ناچ سکتی ہوں۔ کھالے بول سکتی ہوں۔ تیرا گھوڑے کی سواری کرنا۔ بائیسکل چڑانا پس کام کر سکتی ہوں۔ کالج کے ڈراموں میں اکثر کام کرتی تھی“

”ہوں“ اکرم نے نیزکی دراز کھول کے اس میں سے چند ورق کھالے اور اس لڑکی کو پڑھنے کے لئے دئے۔
”چلے انہیں پڑھ لیجئے اور پھر اس صورت کے کھالے آپ برتے۔“

چند منٹ کے ملاپ کے بعد اس لڑکی نے وہ کھالے سنائے۔ طرز ادا بہت عمدہ مشنرور تھے۔
گولڑ میں جان اورس اور دھام۔

”آپ کا نام؟“ اکرم نے پوچھا۔

”آہ پارا“

”گھر والے تو یہاں نام نہیں رکھ سکتے تھے“ اکرم نے سکرا کے پوچھا۔

”اے نہیں۔ یہ میرا اصلی نام ہے۔ میرا اصلی نام تو بھلا ہے۔“

”بھلا کیا بڑا ہے“

وہ لڑکی خاموش ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد بولی ”تو آپ مجھے کام دیں گے۔ آپ کو مجھے کام دینا ہی ہوتا“

اکرم نے سوچتے ہوئے آہستہ سے کہا ”ایک چھوٹا سا رول ہے۔ ایک ماہ میں آپ کا کام ختم ہو جائے گا۔ صرف ڈھائی سو روپے ملیں گے۔ اس کام کے لئے۔ اس سے زیادہ ہمارے پاس بحث نہیں ہے۔“
”مجھے منظور ہے۔“

اکرم نے صورت کی طرف دیکھ کر کہا ”بھئی ان کا کنٹریکٹ ٹائپ کر دو“ پھر کمرے آہ پارا کی طرف۔
”غائب ہو کے کہا“ آپ اپنا ایڈریس پورا پتہ وغیرہ۔ اب انہیں بتا دیجئے۔ وہ آپ کا کنٹریکٹ ٹائپ۔

نہایت میں

جنوت نے شام کے دو گھنٹے اپنی فلم گپنی کے دفتر کو دیکھا منظر کئے تھے۔ وہ اپنا ٹاپ راتر یہاں اٹھا کے لے آتا تھا اگر فلمی کانسٹریکٹ واکاروں کے، کانسٹرکٹ، ڈسٹری بیوٹروں کے مسئلہ کائنات ٹاپ ہو سکیں۔

جب کانسٹریکٹ ٹاپ ہو کے آو پارا کے سامنے آیا تو اس نے اسے پڑے فیروز دستخط کر دئے اکرم نے دستخط کرنے کے بعد کانسٹریکٹ کی ایک نقل آو پارا کو دی۔ آو پارا نے اپنے پرس میں ڈال دی اس کے بعد بھی دو کرسی پر بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد بلی "ایڈوانس؟" اکرم نے جنوت سے کہا۔ "بھئی انہیں تیس روپے دے دو۔ رسید لے لو"

تیس روپے لے کر لڑکی نے اپنی پرس میں ڈال لئے۔ اس کے چہرے پر نہ کانسٹریکٹ پر دستخط کرتے وقت نہ ایڈوانس لیتے وقت کسی قسم کی خوشی کے جذبات اُبھرے۔ وہ شکر کی باتیں جس حرکت لری پر بیٹھی رہی

اکرم نے سوچا خطاب دوپہل جاسے گی۔ خود بخود مگر جب چند منٹ گزر جانے کے بعد بھی وہاں سے نہ گئی تو وہ خود پٹنے کے لئے تیار ہو گیا۔ کیوں کہ اسے دیر بھر بیٹھی تھی۔ وہ ذی سون جنی میں اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔ اکرم نے جنوت کو دو ایک کانسٹریکٹ ٹاپ کرنے کے لئے دئے۔ دفتر کی چابی اس کے حوالے کی اور کرے سے باہر چلا گیا۔ وہ لڑکی بھی اس کے ساتھ ہی کرے سے باہر نکل آئی اور اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ اکرم نے کوئی زیادہ توجہ نہیں کی۔ لیکن جب فیس بلڈنگ سے باہر نکل کے ہاسٹل کے بجلی کی کٹ جاتے ہوئے بھی اس نے اس لڑکی کو اپنے ساتھ پایا تو اس نے شمس ماکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا "فرمائیے"

وہ لڑکی اس کی فٹننگ کرتی، آپ فرمائیے

”کیا مطلب؟“ اکرم نے پوچھا

”آہ پارلے بڑی مصلحت سے اس کی طرف دیکھ کے کہا“ آپ نے اپنا کام کر دیا اب میری باری ہے۔ نپاؤ بنے نہیں۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ رات کو آپ مجھے جو پرپے جانے کے لئے آؤں گے۔ اس وقت آپ کو بھی میرا پیڈیس ڈھونڈنے میں گرفت ہوگی۔ مجھے بھی ہوگی۔ میں اس وقت آپ کے ساتھ چلے کو تیلہ ہوں۔ جہاں آپ چاہیں“

اکرم نے کہا ”میں چاہتا ہوں آپ اپنے گھر چلی جائیں۔ میں آج نہیں آؤں گا“
”اوہ۔ تو آپ کل آئیں گے“

”کل بھی نہیں۔ پرسوں بھی نہیں۔ کسی دن بھی نہیں۔ آپ کو اس کہانی میں نہ میرے ساتھ نہ کسی دوسرے کے ساتھ جو ہو جانے کی ضرورت پڑے گی۔ آپ ایمان داری سے اپنا کام کیجئے۔ ہم ایمان داری سے آپ کو آپ کی رقم دے دیں گے بس! یہی آپ کا ہمارا کام نہ کیٹ ہے“

”لیکن کام نہ کیٹ میں ایک شرط دے بھی تو جتنی ہے جو کبھی نہیں جانی مگر جتنی ہے“

”مس آہ پارا“ اکرم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا ”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے پاس آپ سے کہی کوئی بدسلوکی نہیں ہوگی“

آہ پارا اب دیر ہو گئی۔ اس نے زور سے کرم کا ہاتھ پکڑ لیا اور گلو گراؤں میں بولی ”آج میں ہر بات کے لئے تیار ہو کے آئی تھی۔ مہینوں تک اس کے لئے کبھی تیار نہ ہوئی تھی۔ جس جگہ جاؤں گے بات کرو۔ وہی اشارہ۔ وہی کناہ۔ وہی سوال۔ آخر میں۔۔۔۔۔ وہی ایک سوال میں ڈھونڈنے ڈھونڈنے تک گئی تھی۔ آج میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔۔۔۔۔ دو دن سے بھوک تھی۔ بے خواب میں بھی خیال نہیں آسکتا تھا کہ آپ مجھے۔۔۔۔۔ اس۔۔۔۔۔ اس طرح۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔ اس طرح کام دے رہے گے۔۔۔۔۔ میں ایک غریب سندی لڑکی ہوں۔ میرا سب کچھ تھا۔۔۔۔۔ اب تو کچھ نہیں با۔۔۔۔۔

ہائے اکرم صاحب۔ میں نے کتنی بڑی بڑی باتیں سونچیں آپ کے پاس میں۔ آپ کو دل ہی دل میں بہت سی گھایاں دے ڈالیں۔ مجھے کیا معلوم تھا آپ اتنے شریف آدمی ہیں۔

اکرم نے کہا۔ میں پہلا شریف آدمی نہیں ہوں۔ مجھ سے پہلے درجنوں اچھے آدمی اس انداز میں موجود تھے۔ آج بھی سینکڑوں کیا ہزاروں ہیں۔ اس سے پہلے بھی مرث کام کی قربانی کر گئی لوگوں کو کام ملا ہے۔ میں آہ پارا آگے بھی بے گار اور غنا ہلے گا۔ اور بھی آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جائے گی جو مرث آپ کے کام اور آپ کی فنی صلاحیتوں کی بنا پر آپ کو کام دیں گے اور ہر ایک سب وہ بھی آہلے گا اس آہ پارا جب اس قسم کی بڑی باتوں سے غمناک نہ ہوں گا دامن یک سر ہائے گار مجھے اس کی پوری امید ہے۔

تب آہ پارا نے ایک عیب و غریب بات کی۔ اس نے اکرم کے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے گھایا اور فریاد کیا کہ بھائی بھائی بھائی بھائی

مولن جی میں دیر تک آرام اور دودھی بیٹے ہاتھ پر فروش گیتیاں کرتے رہے۔ پہلے کئی مہینوں سے وہ ایک دوسرے کے قریب آ رہے تھے۔ کئی نے کئی سے کہہ دیا تھا۔ لیکن ان دونوں میں سے ہر ایک پر محسوس کرنا تھا کہ دوسرے کی جانب کھینچا جا رہا ہے۔ مگر انہی کو کبھی نہ کاؤٹ نہ حس تھا۔ کہ محسوس کرنے کا ٹھوٹے کا۔ سوچنے اور جتنے کاؤٹ نہ حس نہ ہوئی اکرم کی کامیابی سے بے حد خوش تھی۔ مستونے اس کی آنکھیں تاروں کی طرح چمک رہی تھی اور شعلوں کی سی چمک نہ حس کے رفتار

پر تھی۔ اس نے سیاہ مگرٹ پہنا ہوا تھا اور اس سیاہ مگرٹ پر سنہری کام کا لہریا اس کے بازو تک جاتا تھا۔ یہ سنہری بیل اس کے سینے سے اس کے ٹخنوں تک کھینچی ہوئی اس کے جسم کے دل آویز خطوط آبشاری تھی۔ دیوار گیر۔ مہم مہم نیلی نیلی روشنیاں رون ہنی کے ڈانس ہال میں جاتے تھے کاسا پر کینٹ منظر میں کرتی تھیں۔ ہاؤس اسٹیلیٹا اپنے گہرے بھرے بالوں کو شانوں تک چٹکائے، ایک طرف ہنکائیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک نازک سی گیار تھی۔ ان کے پیچھے ایک بہت بڑا کلاب کے رنگ کا ایپ ٹیڈ تھا جس کی روشنی ہمیں کران کے بالوں اور ان کے ہاتھ میں تھامے ہوئے گیار پر پڑ رہی تھی۔ اسٹیلیٹا کی ٹیم ہاتھ میں گیار پر جبک گئیں اور مہم مہم ناچ کا ڈولنا ہوا نغمہ گیار کی آکوں سے پھوٹ پڑا۔

خاموشی سے اکرم اور دزدی لٹھے اور ناپچے گئے۔ دزدی اکرم کی بانہوں میں تھی، اور ناپچے ناپچے اس سے ایک لمبے کے تھے اپنی آنکھیں بند کر میں اور اس کا سر اکرم کے سینے سے لگ گیا اور اسے محسوس ہوا جیسے وہ پھولوں کے تختے پر ناچ رہی ہے۔ ہرے بھرے سرخواریں ہیں۔ برن پرش پہاڑوں کے دامن میں کسی اجنبی بھیل کے ساحل پر ناچ رہی ہے۔ گھائیوں پر کھڑے ہوئے دفاتر کی ہر شاخ وائیلن ہے اور ہوا اسٹیلیٹا ہے اور ان ہزاروں وائیلنوں کے آرکسٹرا سے جو موسیقی ابھر رہی ہے۔ اُن سے دو داترے، دو دول، دو افراو، گونے گونے ایک دوسرے کے گرد طواف کرتے ہوئے آپس میں یوں گھول گئے ہیں جیسے اب موت ایک دائرہ ہے، ایک دل ہے، ایک فرد ہے۔ موسیقی کی ایک لمبے ہے جو ہزاروں لاکھوں وائیلنوں سے جتنی محبت سنارہی ہے۔

اور مغربی موسیقی کی دھن کے ساتھ ناپچے ہوئے اکرم نے سوچا، کبھی ہماری مشرقی موسیقی کے فن کھرجی کوئی ایسی دھن بنائیں گے جن پر دو محبت کرنے والے ناچ سکیں۔ ایک دوسرے کی کر میں ہاتھ ڈالتے۔ جسم سے جسم ہاتھ آٹھکوں میں آنکھیں ڈالے اپنے جسم کی نے گورو دوسرے جسم کی نے، سوئے ہوئے موسیقی کی گت پر ایک دوسرے میں کوبائیں۔ ایسا فیس ہا سے ازیب نہیں بنیم نے گا

مٹی ہدی کٹھا کی! کھٹک۔ بھارت ناٹیم — نہیں۔ نہیں۔ بھارت ناٹیم ہی نہیں، محبت ناٹیم بھی چاہئے
 صرف کٹھا کی ہی نہیں، محبت کی گئی بھی چاہئے۔ مگر کیسے؟ ہزاروں برسوں سے ہم نے، ہمارے آباؤ اجداد
 نے محبت کی۔ مگر محبت کرایا یا جاں بھ کر۔ مرہ کر جیون کا جنجال بھ کر۔ رُوح کی ضرورت بھ کر نہیں۔ تو کیا ہم
 لوگ کبھی محبت کی موسیقی نہ پاسکیں گے۔ ہمارے ہاں ایک کس لئے موسیقی ہے اور دوس کے لئے بھی
 ہے۔ لیکن دو کس لئے۔ صرف دو کے لئے؟ ایک مزار ایک عورت کس لئے۔ ایک اکرم اور ایک مذہبی
 کس لئے؟ اے خدا۔ اس ملک میں محبت کرنا اتنا بڑا گناہ کیوں ہے۔

وہ دن ختم ہو گیا۔ کتنا خوب صورت دن تھا۔ کتنا بھرپور میل، منہا، سورج کی دھمکی ہوتی۔
شعاعوں کا لباس پہنے ہوئے، آج بستی میں بھی ہر کوئی خوش تھا جیسے آج کوئی قوی سیل ہو جس
میں ہر فرشتے، ہر خیال اور ہر مذہب کے لوگ مٹے رہے ہوں۔ جیسے آج بستی میں قوس و قزح
اتر آئی تھی اور اس نے اپنی رنگارنگی سے دلوں کو شاداب کر دیا ہو۔

کمال کا کمال کے سب لوگ آج جلدی سے سو گئے۔ بون بھر کے تھکے ہوئے تھے۔ ستیہ رائے
بھی لگے دس سال کی بچہ زلی کا پروگرام بنا کے کر گیا۔ جنا بھی جو آج دن بھر نہ سوتی تھی، آج کئی ہزاروں
کے بعدوات کی مہربان آغوش میں اپنے بازوؤں کا بھیک لے کے سو گئی۔ صرت اگر مہربان تھا اور دیر تک
جاگتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ آج بہت سے پرانے دوست اُس سے چھوٹے گئے تھے
اور نئے ساتھی اسے ملے تھے۔ ایک زندگی کا دروازہ اس پر بند ہو گیا تھا اور دوسری دنیا نے اپنے
بٹ اس کے غیر مقدم کے لئے کھول دیے تھے۔ کامیابی نفع کی طرح تھی۔ پھر بھی وہ اپنے دل میں
خدا کا خوف نہ دھتھو تھا۔ خدا کا سر جتا چاہتا تھا۔ یہاں سے اب وہ کدھر صراطے گا۔ اس کے دل میں ایک
عجیب بلبل سی تھی، ایک طوفانی جہانی کیفیت، یادوں کی، خیالوں کی، جذباتوں کی، بھگہوں کی تصویر
کی اور ان کی پر مہائیاں اس کی روح پر ایک کونے سے دوسرے کونے تک چھاتی ہوئی تھیں اور وہ

سوتا پاتا بنا تھا۔ یہ ایک چوتھے پر فیہ آگے بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں گلاب کا ایک پھول تھا۔
اکرم نے پھول کی طرف دیکھا، پھر فیہ کی طرف۔

فیہ بولی: "یہ بابرام نے مجھے دیا ہے۔"
اکرم سکرایا، مگر فیہ ڈرا بھی نہ سکرائی۔ وہ بہت ادا سی تھی۔
اکرم نے کہا: "جسٹن تو خوش ہونا چاہئے۔"
فیہ اس کے آٹھ ہے۔

ہیکوں؟

جواب میں فیہ نے اس سے ایک سوال کیا: "تھا کیا خیال ہے۔ بابرام کی کیا عمر ہو گی؟"
کوئی باؤن تین برس کے قریب ہو گی۔
میں اس خبر میں نہیں برس کی ہر باؤں گی۔
اس سے کیا ہوتا ہے؟

ہر لکے اور نہیں بھی ہوتا ہے۔" فیہ نہیں کے بولی۔

وہ نہایت مضحکہ خیز باتیں کرتا ہے۔ کسی طرح سے کوئی بھی حسرت اس سے جبت کر سکتی ہے؟
سکھایا ہوا؟

وہ آج شام کو جب تم لوگ یہاں نہیں تھے میرے پاس یہ پھول لے کے آیا۔ پہلے تو بہت دیر تک
اموش بیٹھا رہا۔ ہاتھ میں پھول کو پھول کی طرح نہیں چمتی کی طرح پھڑپھڑے ہوئے۔ فیہ نے وہ نہیں
میں نے پرچا لیا ہے۔ ہلا۔۔۔۔۔ یہ گلاب نہ پھول ہے۔ میں نے کہا اتنا تر بجے بھی لگائی
ہے۔ اس پردہ بے پردہ چپ ہو گیا۔ اور اب اس نے اس پھول کو اپنے ہاتھ سے یوں نیچا کر لیا
یہ آدمی کسی منزل پر پہنچ کر چلتے کر نیچا کر لیتا ہے۔ تو یہی پھول اس کے ہاتھ میں تھا۔ پھر اس نے کہا

میں رضیہ — کبھی — میں —۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میرا مطلب ہے حساب کی کتابوں کے سوا۔ پھر میں نے تجسّیں دیکھا اور —۔ پھر — ایک عرصے کے بعد کہ نہیں مٹا کتنے عرصے کے بعد میں نے آسمان کو نہ دیکھا۔ اور مجھے آسمان بڑا خوب صورت دکھائی دیا۔ کیوں میں نے اتنے عرصے تک آسمان کو نہ دیکھا تھا۔ کہہ نہیں سکتا۔ تم جانتی ہو ایسا کیوں ہوتا ہے۔ میں تو ہمسیر جانتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ نپ ہو گیا اور اپنی ہاتھوں پر پھول کو ایسے گھمانے لگا جیسے جڑ سے موت کی آغوش گھماتے ہیں۔ ”رضیہ نہیں۔ پھر بولی۔ ”مگر میں بارہم کی بہت بڑھانا نہیں چاہتی تھی اس لئے غاموش رہی۔ یہ میری غاموشی اس کے لئے کتنی بھینٹ رہ تھی۔ خود اس کی گریانی اس کے لئے کتنی پریشانی کا باعث تھی۔ یہ میں بھی طرح سے دیکھ سکتی تھی۔ وہ بار بار اپنے بوٹوں پر زبان پھیرتا تھا۔ اور وہ مرتبہ تو اس نے ہاتھ پر سے اپنا ٹھنڈا سپینڈ صاف کیا ہوا جو۔ اس کے آواز میں گفت بھی تھی۔ ”اے پھر اس نے بڑی بہت سے کام لے کے کہا۔ ”ان کی طرف جاتے ہوئے ہم بڑھ میں پھول والے کی دوکان سے گزرا کرتا ہوں۔ شاید عجیب تھیں یہاں سے گزرا ہوں۔ مگر مجھے یاد نہیں کبھی میں نے پھول دیکھے ہوں۔ میں نے کبھی اس دوکان کی حالت نظر بھی نہیں ڈالی۔ میرا دل اپنے حساب کی کتابوں میں تھا پھولوں میں نہیں اور میں رضیہ میرا کام بھی ایسا ہے کہ روز میں آٹنے پانی کی غلطی ہو جائے تو سینٹو میرا حساب برابر کرے گا۔ ”

”کوچہ دونوں سے تھا۔ میرا مطلب ہے تم آئیں۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ میں نے پھول دیکھے۔ ”

”عجب۔ ”تو یہ چہا پھولی۔ پھول ہی پھول تھے جو اس دوکان میں بچے ہوئے تھے اور کئی سال سے میں نے انہیں نہیں دیکھا تھا۔ ”۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔ تو میں۔۔۔۔۔ آج یہ پھول لے آیا۔ ”تو اس کے بعد اس باون برس کے بندے نے وہ پھول اس طرح شرانے لہاکے انھیں جہاں کے مجھے دے دیا۔ جیسے وہ مجھے پھول نہیں اپنی ماری زندگی دے رہا ہو۔ ”

”تم سے بہت کتنا ہے۔ ”اکرم نے ترس کھاتے ہوئے کہا۔

”میں یا کروں“ رُفیع ایک آہ بھر کے بولی۔ ”وہ اگر بادن برس کا نہیں تیس برس کا بھی ہوتا جب بھی میں اسے جنت نہیں کر سکتی تھی۔ کیوں کہ میں کسی اور سے محبت کرتی ہوں۔ اور اگر میں کسی اور سے محبت نہ بھی کرتی ہوتی تو بھی اس سے محبت نہیں کر سکتی تھی۔“

”ہائے وہ کس قدر مُنکھ خیز ہے۔“

”بالکل بُرے آؤ کی طرح میری طبت دیکھتا ہے۔ اُجالا!“ رُفیع پہلے شہی۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو گئی بولی۔ ”وہ کیا تھا جب میں نے اس سے پوچھا تھا کہ میری عمر چونتیس برس کی ہے۔ دیکھو تو نہ سے لے کسا صورت ہو!“

اکرم ہوا۔ ”وہ نہیں اس کی محبت بہت ہوٹ ہوں رہی ہے۔“

یہ ایک وہ دونوں آدمیوں سے ہو گئے۔ ابراہام کی بادن برس کی بچہ اور بے معنی زندگی پر سیدہ جیدہ کی طرت ان کے سامنے پہنچی پہلی گئی۔ اس زندگی میں کہیں ایک ہلچل نہ تھا۔ پھول کی ایک کی نہ تھی۔ پھولوں سے لڑی ہوئی ایک ڈانی نہ تھی۔ سمرت رُفیع آلفہ پانیوں کے اعلیٰ و شمار ہزاروں۔ لاکھوں کروڑوں کی تعداد ریت کے فتول کی طرح اس کی زندگی کی سطح پر پھیلے ہوئے تھے۔ بادن بے شکایتیے والے طویل برس ریت کے ٹھیلے ہوئے ٹیلوں کی طرت ابراہام کی زندگی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھڑے تھے۔ ایک قتل تو وہ ہوتا ہے جس میں آدمی کو گواگونٹ کر مار دیا جائے لیکن یہ کس قسم کا قتل ہوتا ہے جو ابراہام ایسے لوگوں کی زندگیوں سے روا رکھا جاتا ہے۔ کیوں یہ لوگ ایسا کرتے ہیں۔ ایک دن نہیں۔ دونوں نہیں۔ ساہا سال ایک ہی آدمی کو گٹکا گٹکا کے مار دے سہتے ہیں کہ پھر کوئی امید نہیں رہتی۔ کوئی سکا بہت نہیں رہتی اور کوئی یاد نہیں رہتی۔ اور کہیں پر کوئی پھول دکھائی نہیں دیتا۔ اور کہیں پر کوئی آسمان نظر نہیں آتا۔ سمرت، مع، تفریق، ضرب تقسیم، سمرت مع تفریق ضرب تقسیم۔ ۱۰۰۰!

رُفیع نے آہستہ سے کہا۔ ”جب میں نے پھول لے کے بھی اس سے کہہ نہ کیا۔ اس کا شکریہ تک ادا نہیں کیا۔“

اکرم نے چھ مہینوں میں تصویر نکل کر لی۔ اس نے اس کا ہم دکسان رکھا۔ سرسے کی کٹی، اور چند بڑے بڑے پروڈیوسروں کی دہلی بی سرگوشیوں میں چلنے والی مخالفت کے باوجود اگر یہ تصویر بننے لگے۔ اس میں نکل رہی تھی۔ تو اس میں اکرم کی دن رات کی ان تھک محنت کے علاوہ اس کے یونٹ کے لوگوں کی ہر خوش خدمت اور سٹوڈیو کے مزدوروں کی ہر غلوں مسامی کو بڑا دل تھا۔ انڈسٹری کے جو چھوٹے چھوٹے لوگ تھے۔ وہ ایک طرف سے اس تصویر کو اپنی تصویر سمجھتے تھے۔

اس دفعہ اکرم نے بھی پوری کوشش کی تھی کہ وہ بیت اونچا نہ اٹھے۔ ان تمام غلطیوں کا اعادہ نہ کرنے جو اس نے کچھلی تصویروں میں سرزد ہوئی تھیں اس بار جو مسئلہ اس نے اپنی تصویر میں اٹھایا تھا۔ شہری مسئلہ نہیں تھا۔ کسان اور اس کی زمین اور جاگیر وادی، زمیندار کی نظام زیادہ تر وہابی مسئلہ تھا۔ مگر ہندوستان، دیہاتیوں میں جود ہوتا ہے۔ اس لئے اکرم نے یہ مسئلہ اٹھانا مناسب سمجھا۔ مگر اس بار اس کے کردار تقریری نہیں کرتے تھے۔ اپنے عمل سے اور حرکات و سکنات سے بولتے تھے اب کچھ بار اس کا گاؤں ایک کچھ کا گاؤں تھا۔ کسان کچھ کا کسان معلوم ہوتا تھا۔ وہ فلی کسان نہ تھے۔ اس کی ہیر وئی کھیتوں میں کام کرنے والی ہیر وئی معلوم ہوتی تھی۔ ہیر وئی حقیقت کے اس قدر

قریب تھی کہ گاؤں کی زندگی سے مربوط۔ اس بار اکرم کے کردار بالکل سیاد اور معیہ نہیں تھے اور نہ ان
 تھے اپنی تمام غامبیوں کے باوجود چھوٹے چھوٹے انسان۔ ان کی زندگی بڑی تلخ اور بڑی مصیبت کی
 تھی۔ مگر اکرم نے کہیں بھی کوشش نہ کی تھی کہ وہ مصیبت کو اتنا بڑا معاملہ کر دکھائے کہ زندگی کے
 دوسرے پہلو اس میں چھپ جائیں۔ یہ تو مرکزی نقطہ تھا۔ یعنی زمین اور اس پر کام کرنے والے کسان
 مگر آندروں کے درمیاں ہنسی بھی تھی۔ چاندی کی گھنٹی کی طرح سرٹتی ہنسی۔ جو کبھی تو زندگی کے چھوٹے
 چھوٹے دکھوں کو اپنی شاداب آواز میں گھلا دیتی ہے اور کبھی بڑے دکھوں کو تھلا دے زیادہ اُبھار دیتی ہے
 لیکن اب کے یہاں اس تصویر میں ہنسی بھی تھی۔ صاف ستھری زندگی سے بھرپور محبت کرنے والی ہنسی
 اور گیت۔ گاؤں کے ٹیڈیٹ گیت۔ رکیٹوں میں گانے جانے والے۔ چڑیا ہوں میں گونجنے والے۔ چچی کی گھر گھر
 اور سیاد کی پر شور چل پہل میں گانے والے گیت زمین اور زندگی کے ساتھ جدمے جوئے گیت اور ناچ
 اکرم نے اس سے قبل اپنی کسی تصویر میں ناچ نہیں رکھے تھے مگر اس دفعہ اس نے دعوت کی سچی سے
 فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ تیرہ ایک ایسی تصویر کی صورت میں نمودار ہو رہا تھا جو اپنی تمام غامبیوں کے باوجود ایک
 چھوٹے سے ہندوستانی گاؤں اور اس کی زمین اور اس کے کسان کے مسئلے کی ایک مٹی جگتی اداسی
 دستاویز تھی۔ اکرم کو سنسکرت کا بہت خوف تھا۔ اگر سنسکرت نے اصل موضوع ہی سے اتفاق نہ کیا تو اس کی
 ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔ موضوع کے اعتبار سے اس میں سیاست کا بھی دخل تھا اور وہ لوگ
 جو زمیندار تھے اور جاگیر دار تھے اور صدیوں سے ہندوستان کی پچھرتی صدی آبادی کی معاشی، سماجی اور
 تہذیبی زندگی پر قبضہ کئے بیٹھے تھے وہ کس طرح اس تصور کو چلنے دیں گے۔ اور اکرم نے جہاں تک
 مرکزی نقطہ رکھنے کا حق تھا۔ اس پر ٹری بے باکی سے، بڑی فن کاری سے مگر صاف صاف کہہ دیا تھا
 کہ زمین کسانوں کی ہے اور جو غاصب ہیں انہیں زمین اور کسان کے بیچ میں سے ہٹا دینا چاہیے۔ اس
 مرکزی نقطہ پر اکرم نے کسی قسم کا بھگوتہ نہیں کیا تھا۔ اس لئے وہ سنسکرت رائے سے بہت

ڈر رہا تھا۔

مگر یہ دیکھ کر اُسے ایک گونہ حیرت اور پھر نرسیت بھی ہوئی کہ سنسنے اس کی تصویر پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں کیا۔ پوری تصویر ایک فٹ کالے جانے کے بغیر پاس کر دی۔ نہ نرسیت پاس کر دی گئی بلکہ سنسنے نے اکرم کے اقدام کو سراہا۔ اُسے ذاتی طور پر مبارکباد پیش کی۔ کہ اس نے اتنے بڑے قوی مسئلے پر ایسی جرأت کرنا تصویر بنائی اور فلموں کے تمام رجحان کے خلاف ایک نہایت صاف ستھری مشق مذاق کی خوب صورت تصویر تیار کی۔

اکرم اس تعریف سے بہت خوش ہوا۔ کیونکہ یہ تعریف خلاف توقع تھی لیکن پھر کو فانس کرنے والے سینٹو کمرچند کا چہرہ اتر گیا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اور جب نائش کا دسے واپس آئے ہوئے اکرم اور ستیہ رائے نے سینٹو سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے غصے سے چلا کے کہا۔

”تم نے مجھے ڈبو دیا۔ کہانی کچھ سہنائی اور اب کچھ بنا دی۔“

”کیا نسخہ کیا؟ ستیہ رائے نے پوچھا۔“

”سنتے نہیں سنئے سنسہ کیا کہہ رہا تھا۔“

اکرم نے کہا ”وہ سب تو تعریف کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے دس سال میں پہلی بار ایسی تصویر آئی ہے۔“

سینٹو نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کے کہا ”جس کی سنسنہ تعریف کرے مجھ کو اس تصویر کی قیمت پھوٹ گئی۔“

”کیا بات کرتے ہو سینٹو جی“ ستیہ رائے نے برا فروخت ہو کر کہا ”ہم نے جھنڈا....“

”رہنے دو اپنے جھنڈے کو“ سینٹو کمرچند نے فوراً ستیہ رائے کی بات کاٹ کر نہایت ہی غصے سے کہا

”بڑے آئے جھنڈے خاں کہیں کے ہیں بیس سال سے انڈسٹری میں بھاڑ نہیں جھونک رہا ہوں

میں نے پیاس بارود کو دیکھا ہے جس تصویر کی سنسٹر تعریف کرے جس میں سے کھنڈ کاٹے مجموعہ تصویر
 غلاب ایک دم بندل۔ ہیل۔ اور جس تصویر کی سنسٹر مانی کرتے اس میں سے کاٹنے کو کہے وہ بدو شنگ
 کو کہے مجموعہ تصویر اُترنے والی نہیں ہے۔ کم از کم سنسٹر جو بی تو سنسٹر سے ملے گی۔ تم لکھا کہ سنسٹر فائے
 کہتے تھے وہ ایسی انہوں نے ایسی صاف سنسٹر فلم نہیں دیکھی ہے۔ تو سمجھو۔ دس سال میں اس سے بڑا
 غلاب بھی کسی نے فلم اندھ شری کو نہیں دیا ہو گا۔ تیسویں دن ہی رولوں سے اُتر جائے گی۔ میں تو جیسا
 رولوں میں اُسے لگا تا ہی نہیں۔ کیوں خواہ مخواہ میں پائیس ہزار اس کی پیسٹی پر خراج گد میں اے
 کسی قدر سے درجے کے تعییر میں مدد ہفتے کے لئے ہاتھ دوں گا۔

اسی اعتبار سے کہنا میسر ہو گیا کہ اگر رول ایک بھی قوی فائدہ کی تصویر ہے۔ تب میں اس کی اچھی
 طرح سے پیسٹی کر فیا جائے۔

”قوی فائدہ لئے بھاڑیں۔ پہلے تو میں اپنا فائدہ دیکھوں گا۔ بڑے کئے بچے سن پڑ جانے والے۔ بندل
 پچر کے ڈاکٹر کیڑ۔ تم نے تو مجھے لوٹ دیا۔“

”کیا لوٹ دیا۔“ ستیہ رائے نے ہلکا کر کہا۔ تصویر معدی چلے یا دس دن یا دس بیسے۔ تمہارے پیسے
 کھے ہیں۔ سب علاقے بکے ہوئے ہیں۔“

”بکے ہوئے میں تو اس سے کیا ہوتا ہے۔“ شیو کتر چندر خا ہو کر بولے ”سب پیسے سب علاقوں سے
 آگئی جائیں۔ تو بھی مجھے قصاصی رہتا ہے۔“

”کیسے؟“ ستیہ رائے چپک کر بولا۔ ”سارا خرچ میرے ہاتھ سے ہوا ہے۔ میں نے پانی پانی کا حساب
 رکھا ہے۔ سب میرا آجائے تو پائیس ہزار کا نقد فائدہ ہے جس میں تمہارا سود اور رائی کاٹ کر کے

پندرہ ہزار بچتا ہے۔“

”کیسے پندرہ ہزار بچتا ہے تم مجھے روزی شیشائی کا سود نہیں دو گے؟“

”سیٹر کا غلم نہ کرو“ اکرم بولا ”دوسری ششماہی میں صرف دس دن اور بچے ہیں۔ میں نے یہ تصویر
چھو بیٹے اور دس دن میں تیار کی ہے۔ تم نے خود ستیرائے سے کہا تھا۔ تم اس دس دن کے لئے
سود نہیں لوگے۔ دوسری ششماہی کا سود نہیں لگاؤ گے۔“
”میں نے باطل نہیں کیا تھا“ سیٹر نے کہا۔

”تم — تم جھوٹ بولتے ہو ستیرائے نے غصے میں آپ سے باہر ہوتے ہوئے کہا اتنی بددیانتی،
تم نے ہی آدمیوں کے سامنے کہا تھا۔“

”ذرا غصہ الٹ میں نے کے آنا انہیں“ سیٹر کوڑھنے لگا ”مگر اے کہا“ مجھے جھوٹا اور بددیانت کہنے والے
کون ہیں۔ میں ان کا چہرہ دیکھنا چاہوں گا۔“

خیر میں نے کہا براہ کیا ہو چکا سیٹر کیٹ میں تو لکھا ہے کہ چھ ماہ میں اگر تصویر تیار نہ ہوئی تو دوسری
ششماہی کا سود چر جائے گا۔ تم دو دن کان کھول کر سن لو اور اس حساب سے تمہیں ستر ستیرائے، بچے
دوسری ششماہی کا سود دینا پڑے گا اور اس حساب سے ستر اکرم نائی غلام کے بڑے دوسرے ستر ستیرائے
کو تمام ٹیری کوڑھنے سے مذہب وصول ہو جائے گے بعد میں مجھے آٹھ ہزار کی رقم دینا پڑے گی جسے
وصول کرنے کے لئے مجھے ان کے خرافات مذاکرات سے ڈھرنی لے کے ان کے باہم کے فلیٹ پر لٹائی
لائی پڑنے گی۔ اور ان کے زیرِ کمر پڑنا اور ستر ستیرائے اور غلام کے کوئی کرنا پڑے گا۔ اور تو
کوئی طریقہ ہے نہیں۔ ستیرائے فاب سے روپیہ وصول کرنے کا۔“

یہ کہہ کر سیٹر چلے گئے دو دن کو کھانا ہی نہ آتا دیا اور اپنی بیوی گما کر کا بیاڑی رزڈ کی جانب
لے گیا اور ستیرائے اور اکرم دو دن تک دوسرے کا نہ دیکھتے رہ گئے۔

کمر مرنے غصے میں کہا ”سالہ۔ جب کہتے پھر مٹل نہیں ہوئی تھی کہتے تھے اکرم بیٹا میں دوسری
صورت بھی تمہارے سنگ بناؤں گا۔ ابھی سے انا دس کر دو۔“

ستیرائے نے کہا ”پاجی سارا دہ پیہ خود کھا لینا چاہتا ہے“
 ”صرف یہی نہیں اکرم نے کہا ”وہ تو تمہارے فلیٹ پر قرقی لا رہا ہے“

جب سے تصویر کا کام شروع ہوا تھا۔ ستیرائے چونکہ پروڈیوسر تھا اسے بہت سے
 ڈسٹری بیوٹروں اور دوسرے فنانشروں اور سرمایہ داروں سے ملنا پڑتا تھا اس لئے وہ جتنی چھوڑ کر
 چلا گیا تھا اور اہم میں اس نے ایک فلیٹ لے لیا تھا اور اُسے ایک فلمی پروڈیوسر کے فلیٹ کی
 طرح سہایا تھا۔ ٹیلی فون ریفریجریٹر، ریڈیو گرام، غلیچے، مٹھی پر دے۔ اگر کوئی کئی تھی تو ایک سوئی اکھ
 ایک داسشتہ کی اور یہ دونوں ہی بہت ہنگامی تھیں۔ گو ستیرائے موٹر کے خلاف تو نہیں تھا لیکن
 داسشتہ کے بہت خلاف تھا اور جب اس کے دوسرے دوست جیسی جیسی میں اس کا مذاق اڑاتے
 ہوئے کہتے ”تم کیسے پروڈیوسر ہو۔ تمہاری تو کوئی داسشتہ ہی نہیں ہے“ تو ستیرائے جس کے جواب
 دیتا ”میں خود ہی اپنی موٹروں خود ہی اپنی داسشتہ ہوں“

”تمہی کہتا ہے، مجھے اس کی فکر نہیں ہے۔ ستیرائے کا پتہ پھر صرف فٹ پا تو ہو سکتا ہے مجھے اس
 بات کی اتنی فکر نہیں ہے جتنی اس بات کی کہ وہ اسے کہیں دوسرے تیسرے درجے کے فیئر میں نہ
 ڈال دے۔ اور اس کی اچھے طریقے سے پلٹشی نہ کرے۔ اکثر اوقات ایک عمدہ تصویریری پلٹشی سے
 مر جاتی ہے“

ستیرائے کا غصے سے تھمتا ہوا چہرہ فوراً تبدیل ہو گیا اور وہ اپنی جیسی روک دسکا سکولتے ہوئے
 کہنے لگا ”دیکھو اکرم میں دعا کرتا ہوں یہ سچ نہ ہو مگر بھائی جانے کیا بات ہے۔ ہر نامو ایسا ہی ہے جب
 تصویر کی سنس تعریف کرتے ہیں وہ سالی دودن میں اڑ جاتی ہے“

”اوہام پرستی ہے اور کچھ نہیں۔ اکرم نے جھلکے کہا
 ”نہیں اصل بات یہ ہے۔ ستیرائے نے بمشکل اپنی جیسی روک کے کہا ”سنس دے جو بڑے

ہیں۔ بہت سے اسی میں سے اب زندگی کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ جہاں فطری طور پر انہیں دلچسپی نہیں جو ان اور صحت مند فلمیں مری معلوم ہوتی ہیں۔ ان کا شوق کھلناڑا پن انہیں ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے وہ عموماً ان فلموں کی تفریق کرتے ہیں جو عوام کی دلچسپی کی نہیں ہوتیں..... بچے بھی ڈر لگتا ہے کہیں یہ تصویر کبھی ناہام نہ ہو جائے۔ تو پھر گھبراہٹ اور یہ بستر بستی سے گول! اکرم نے کہا: تم دیکھتے جاؤ۔ آج تو کچھ سنس ہوئی ہے۔ ایک بڑا سا شو کہتے ہیں اس میں مختلف طبقوں اور خیالات کے لوگوں کو بلاتے ہیں۔ اسی سے تصویر کے بارے میں صحیح رد عمل معلوم ہوگا۔“

مگر اس پرائیوٹ شو سے بہت پہلے بہت سی باتوں میں گولا بڑ ہو گئی۔ سینٹھ نے سہارے کی دوسے بہت سی چھوٹی موٹی غلام و درزیوں کی مثالیں دے کر ستیہ رائے کے کہان تصور کا ٹیکٹو اپنے نام کھوایا۔ پھر اس نے اپنے آٹھ ہزار روپے کے کاغذ کاٹا کیا اور ایک فوجی بھتہ کھل کے ستیہ رائے کے غلام ڈگری حاصل کر لی۔

ایک نجی تصویر بنانے کے بعد بھی اکرم کے منہ میں ایسا ذائقہ تھا جیسے وہ لکڑی کا براہہ کھا رہا ہو۔ یہ لوگ تصویر نہیں دیکھتے، اس کا تاثر اس کی خوبصورتی، اس کی عجیبی صفات پر غور نہیں کرتے۔ اب تو اس بچہ کی سب ٹیری ٹیری بک چکی ہیں، تجارتی اعتبار سے اس میں منافع بھی ہے مگر یہ

سیٹر لوگ مرنے لگے تھے۔ یہ سارے کا سارا بندھن ان کی جیب میں جانا چاہئے۔ وہ لوگ جنہوں نے گذشتہ چھ بیسے اس پر غمت کی ہے فائیں فلز کا خاتمہ جنہوں نے اُنکی تحریروں پر کام کیا ہے۔ شوڈ لو کے مزدور جنہوں نے شوڈ لو کی شوڈنگ کا سرٹ آدھا روپیہ لیا ہے۔ آدھا آدھا روپیہ ہے۔ ڈائمنڈ لوہن کی لوکیاں۔ اکثر لوہن کے لوگ بستی کے لوگ جنہوں نے اس پگھ میں کام کیا ہے۔ ان سب لوگوں کی آجرتیں ماری جائیں گی۔ چھانل کے وہ مزدور جنہوں نے دو دو لے کر کے اس فلز میں چند روپیہ اُن کے من سو روپے تک واپس نہیں ہو سکیں گے۔ جتنا — کیا زندگی ہے ایک تیسری بنانے کے بعد اتنے سینکڑوں آدمیوں کی مسلو اتیں سننا پڑیں گی۔ کوئی نہیں کہے گا کہ سیٹر کٹر چند نے بد معاشی سے کام لیا ہے۔ سب ستیہ رائے کو اہر اکرم کو گالی دیں گے۔ یہ لوگ روپیہ کھائے قوم کے نام پر ترقی پسندی کے نام پر۔ ایک یا دو آدمیوں کو بھانا آسان ہے۔ اتنے سینکڑوں آدمیوں کو کیسے بھایا جائے گا۔ کیسے انہیں بتایا جائے گا کہ محنت کے رس سے چمکتا ہوا ہیں کس طرح معنی شائخوں سے توڑ کر ناصب کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے جو اس سانچ کا بدیہ اصول ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی طریقے سے اس عمل کو اپنی زندگی کے دائرے میں دیکھتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں نہ اپنے کو مظلوم اور دوسروں کو بے ایمان سمجھنے پر مجبور ہے وہ لوگ کسی طرح ان کی قوت کو نہیں کریں گے۔

جس وقت بے کیا کسی نہ کسی طریقے سے ستیہ رائے کے قلیٹ کو اس سانچ سے بچا جائے۔ ہر گز اس سانچ سے ستیہ رائے پریشان ہو گیا۔ پوچھا کہ ستیہ رائے کیسے اس بری طرح نہیں سے ہر جہت انکا ٹاپ ہے کہ وہ چپ ہو گیا۔

کوئی نہ کوئی رستہ نکالے گا۔ یہ دعا نہ سہی طیر تھا ہی

اور وہ اپنے خیالوں میں مستغرق ہو گیا۔

قرنی کے دی جب سیٹھ کتر چند سیلٹ اور اس کے پانچ آدمیوں کو لے کر ستیہ رائے کے فلیٹ میں داخل ہوا تو اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ دس بارہ آدمی فلیٹ میں جمے ہیں اور حلق کر رہے ہیں حلق چیزوں کے قریب دھرتا دئے خاموشی سے بیٹھے ہیں۔ سیٹھ کتر چند نے اِدھر اُدھر دیکھا، مگر کوئی شخص اس کی تعظیم کے لئے نہیں اٹھانہ کسی نے اُسے آداب کیا۔ سب خاموشی سے اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔

سیٹھ کتر چند نے بھونک کے کہا ”طہانچ لویا ہوں“

ستیہ رائے نے کہا ”لئے ہر تو لے آؤ۔ لے جاؤ حوالہ تھا رہا ہے“

سیٹھ نے اِدھر اُدھر خاموشی سے دیکھا، مگر کوئی اپنی جگہ سے ہلا نہیں اُسے ایک گونہ حیناسی ہوا وہ ریڈیو گرام کے پاس گیا۔ وہاں دھوئے پنا سر منڈائے، ہاتھ میں ایک ذنی ہنڈو لائے بیٹھا تھا سیٹھ نے ریڈیو گرام پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”یہ فرق کرو“

سیٹھ کے ہاتھ پر زور کا ایک ہنڈو لڑا وہ جیللا کے اور اچل کے ریڈیو گرام سے دو فٹ پرے جا رہا ”کیا بات ہے، کیا بات ہے۔“ دھنکا کرنا چاہتے ہو“

دھوئے بولا ”میری چیز کو تم ہاتھ نہیں لگا سکتے“

”تمہاری بیڑا“

”ہاں“ ستیہ رائے یہ ریڈیو گرام عرصہ ہوا مجھے فروخت کر چکا ہے۔ یہ کانڈ دیکھ لو، دھوئے نے کانڈ خاموشی سے سیلٹ کو دکھائے، کانڈات تانوفی تھے، بااصل درست ریڈیو گرام عرصہ ہوا فروخت

دھچکا تھا۔

سیٹھ کتر چندھنے میں ریفریجریٹر کی طرف بڑھا۔ وہاں سودا میں جیت سنگھ ہاتھ میں ایک بڑا سا سونا بھلے ایک اسٹول پر بیٹھے تھے اُن کا سونے والا ہاتھ ریفریجریٹر پر تھا۔ سیٹھ کو اپنی طرف آنے دیکھ کر زور سے بولے ”سٹیا ادمر نہ آویں۔ پہلے سے کہنا ہوں۔ ادمر نہ آویں۔ نہیں تو مارا سا کے پھلجڑی بنا دیوں گا۔“
 ”یہ کاکو دیکھ لے“ من جیت سنگھ نے کاغذ بلیٹ کو دکھایا، بالکل ٹھیک تھا قانونی حیثیت سے اس فرخت میں کوئی نقص نہ تھا۔ سیٹھ ریفریجریٹر کو ہاتھ نہ لگا سکا۔

سیٹھ نے بٹنا کے کہا ”اچھا یہ سو ذرا ٹھان لو یہاں سے“

مگر سو سیٹ بھی بکا ہوا تھا تین مزدور وہاں بھی بیٹھے تھے ایک سے ایک ٹھوڑا اور ہاتھ میں اُن کے بازوؤں سے بھی ٹھوڑا اور قانونی پرزد۔

”قریب غالبہ“

مگر غالبہ بھی بک چکا تھا۔

کریاں، اسٹول، میز، الماریاں، کپڑوں کی کمونیاں تک بھی ہوتی تھیں غصے کے مارے سیٹھ کے منہ سے جھانک نکلتے گئی۔

اس نے چلکے پوچھا ”یہاں کوئی چیز ایسی بھی ہے جو پہلے سے بکی ہوئی نہیں ہے؟“

”ہاں ہے؟“ اکرم نے بڑی گھبراہٹ میں کہا ”یہ میری قلم دوات ہے آٹھ تک کوئی خرید نہیں سکا اسے تم فری کر سکتے ہو۔“

ستیرا نے سیٹھ کتر چندھ کے قریب آیا اور کہنے لگا ”وہی قلم ہے ایک نیا چیک لکھ دو دس ہزار

روپے کا“

”۳۰ ہے کے لئے؟“ سیٹھ کتر چندھ نے حیران ہو کر پوچھا۔

”دوسری بچہ کے ایڈوانس کے لئے۔ میں دوسری بچہ تیارے لئے بنا تا ہوں۔ دس ہزار ایڈوانس کرو یہ آٹھ ہزار جو تم نے مجھ سے زبردستی کا لیا ہے اس رقم کو بھی اگلی بچہ میں ڈال دو“

کتر چند ستیرائے کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھنے لگا۔ تجریر مسقول تھی۔ مگر اس وقت اُسے اپنی اکائی پر منت غصہ آ رہا تھا۔ اس نے فلم دولت اٹھا کر فلیٹ کی کڑائی سے باہر پھینک دی اور غصے میں جھلٹا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد بلیف اور اس کے آدمی بھی چلے گئے۔ ان سب کے جانے کے بعد ستیرائے نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر چلا کے کہا ”جسٹہ اگاڑ دیا۔ رکھا! ہاندھا! تانا کیچھا اور کیچہ کے چھوڑ دیا۔ جاؤ بیٹے نکلے رہو۔ گھو بھیا“ ستیرائے نے جسوت سے پوچھا ”کیسی رہی میری ترکیب“

جسوت نے تعریفی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کے کہا ”اب لوگوں سے جتنا تم خوب جانتے ہو“

ستیرائے نے کہا ”اور کیا، اب ہم ان چیزوں کو بیچ کر جن لوگوں کی رقیں باقی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ جن رقموں کا حساب تصویر کے ذریعے دو تو سٹھ کیا سٹھ کے باب کو بھی دینی پڑی گی۔ لیکن کچھ رقمیں جو ذاتی حیثیت میں ہم نے رکھی ہیں جھٹاٹیل کے مزدوروں کا قرضہ جتنا کاروبار بستی کے پیشان خیمہ زخان کا روپیہ یہ روپیہ تو ہم اب واپس کر سکتے ہیں۔“

جسوت نے ستیرائے کا ہاتھ دیکھ کے کہا ”میں نے سمجھا تھا تم صرف صوفیوں کے دلال ہو۔ معلوم ہوا تم انسان بھی ہو۔“

ستیرائے خاموشی سے مسکراتا رہا جسوت نے پوچھا ”اب تم کہاں جاؤ گے“

”رہی تمہارے پاس بستی میں صرف فٹ پانچ بھی! ستیرائے کا وہی پرانا پتہ ہے اب تو“

پرائیویٹ شو کا دن آن پہنچا۔

اکرم نے طرح طرح کے لوگوں کو بلایا تھا۔ فلم انڈسٹری کے سربراہان وہ لوگ تو موجود تھے ہی۔ مگر اکرم نے فرزندوں۔ چھوٹے چھوٹے دوکان داروں، طالب علموں، ٹیکسی ڈرائیوروں۔ کام کرنے والی عورتوں کو خاص طور پر مدعو کیا تھا اس نے انگریزی تصویریں دکھانے والے تمام سینماؤں کے منبر لوگوں کو بھی دعوت دی تھی۔ ان میں ماترو سینما کا امریکی منبر جان رولینڈ بھی شامل تھا۔

”ماترو سینما کے منبر کو کیوں بلاتے ہو“ دھومے نے چلا کے کہا ”وہ فرزند تمہاری تصویر دیکھے گا یا کی؟“

اکرم نے کہا ”میں تو سب کو بلاؤں گا، امریکی ہوا تو کیا ہوا، کیا امریکی کسی اچھی چیز کو پسند نہیں کر سکتا“ دھومے نے ہنس کر طنز کیا ”ہاں کیوں نہیں پسند کرے گا بہت جلدی تم نے سن آت انڈیا ایسی بکھر تیار کرلے ہے بہت اس میں راجہ ہمارے ہیں۔ سانپ میں جوگی ہیں۔ نیم عریاں ناچ میں ناچو وہ اسے ضرور پسند کرے گا؟“

اکرم حینہ پ گیا ”بہت سے امریکیوں کیا بہت سے مغربیوں کا ہندوستانی کے بارے میں یہی نظریہ تھا۔ مگر اکرم جب بھی ڈھارہا۔ کہنے لگا ”اُسے بھی ایک سو فی صدی ہندوستانی فلم دیکھنے دو کیا ہرج ہے؟“

اور اس طرح سے ماترو سینما کے امریکی منبر جان رولینڈ کو ”کسان“ کا پرائیویٹ شو دیکھنے کی اجازت ملی وہ چھوٹا اونچا لانا بہت ہی عمدہ گوشت اور بہت ہی عمدہ محکم پر پلا ہوا امریکی تھا۔ نیوارک کا رہنے والا۔ پتلے پتلے زپ کی طرح بند ہو جانے والے ہڈیٹ۔ فلاو کے رنگ کی سی آنکھیں،

جہاں پڑ جائیں وہاں گویا ایک کیل کا ڈس۔ بڑے بڑے ہاتھ بے عیب ہیں اور مضرب جب
”کسان کا شو ختم ہوا تو حسب دستور اکرم کو ڈائریکٹروں اور اداکاروں نے گھیر لیا۔

جمال آبادی ڈائریکٹر نے اکرم سے ہاتھ ملا کے کہا۔ ”راہ واہ لطف آگیا۔ پھر منہ پھیر کے اپنے
دوست گوند شرم سے کہا۔ ”سارے نے بور کر دیا۔“

ڈائریکٹر صریندر کمار نے اکرم سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا ”فائن“ دھیرندر کمار کا سکرانا ہوا گورا
چہرہ غلوں اور محبت کی زندہ تصویر تھا۔

اکرم نے سر جھکا کے شکریہ ادا کیا۔

دھیرندر کمار نے واپس جاتے ہوئے اپنی بیوی سے فریب کہا ”بھواس“

جوشی جی نے اکرم کو گلے لگایا ”واہ۔ واہ۔ کیا تصویر بنائی ہے تم نے ہندوستانی فلم انڈسٹری کی

لاج مکملی۔ جوشی نے جوشی میں آکے اکرم کا منہ چوم لیا۔ اسے اکرم تم GENUS ہو GENUS
کیوں سیٹھ۔“

جوشی جی نے سیٹھ باجوا سے داد چاہی۔

سیٹھ باجوا بڑی دیر تک اکرم کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے رہتے ہوئے ”کیا بتاؤں اُن دنوں میں
لے تمہاری قدر نہیں کی۔ میری نظلی تھی۔ پارٹراب تم کسی دن دفتر میں آ جاؤ۔ مگر دفتر میں آنے سے پہلے
ٹیلی فون کر لینا اور دو غلوں کے کانسٹریٹ پر دستخط کے اپنا ایڈریس لے جانا“

اکرم نے پھر سر جھکا کے سیٹھ باجوا کا شکریہ ادا کیا۔

اکرم سے دور جا کے سیٹھ باجوا نے جوشی سے کہا۔

”جوشی جی بال بال بک گئے۔ یہ اکرم تو پھر میرے چار لاکھ پر پانی پھر دیتا۔“

”اجی کیا پوچھتے ہو سیٹھ! ایسی بڈل بچہ زندگی میں میں نے نہیں دیکھی۔ سارے کوشاٹ لینے کی تیز

نہیں ادا جلتے ہیں مگر سے ڈائریکٹر بننے! اس توصیٹ پر کلپر لوائے نہ رکھوں اسے! جتنی اور سیٹھ باجھو یا اسی طرح باتیں کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔

راج ہمشاد اور رجن نے اک بڑی خوب صورت سی ثلیٹ بنا کر اکرم کو گھیر لیا۔ وہ ہی عہد سافریاں اور بلاؤز پہن کے آئی تھیں۔ ان کی محاسن بار بار اکرم کی تصویر کی تعریف کرنے ہوئے ادھر ادھر ہنک جاتیں۔ وہ محاسبین دراصل فوٹو گرافر کو تلاش کر رہی تھیں جو اس موٹے کا پوزے لے، عہد سافروٹے لے تو قیفاً کل کے اخبار میں آجائے گا۔ حالانکہ ان تینوں میں سے کسی نے کسان میں کام نہ کیا تھا مگر یہ سبٹنی کرنے والے کہاں اصل کام کرنے والوں کو دیکھتے ہیں۔ وہ تو خوب صورت اور مشہور چہرے دیکھتے ہیں۔

شمشاد نے مسکرا کر اپنی گہری آنکھوں سے اکرم کو دیکھتے ہوئے نیم اُٹاس لیجے ہیں کہا ”کئی جگہ تو میں مدھی پڑی۔ آپ بڑے ظالم ہیں“

راج نے چمک کے کہا ”ارے ان کے ظالم کا کچھ مت پڑھو یہ تو بہت بڑے شاعر ہیں۔ پہلی بھی اداکاروں سے قربات کرنا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ اب تو یہ کچر سلور جوبلی منائے گی۔ اب ان کے ٹھانڈ دیکھنا۔ ہم غریبوں سے ...“

اتنے میں اتفاق سے اک فوٹو گرافر آگیا۔ تینوں ہیردینوں کی جان میں جان آئی۔ راج اپنا فقرہ بیچ میں چھوڑ کر اپنی ساڑی کا پلو ٹھیک کرنے لگی۔ جلدی جلدی تینوں ہیردینوں نے اکرم کے ساتھ ایک دلفریب پوز لیا۔ کیرے میں کشکا سا براؤن ختم۔ تینوں ہیردین جلدی جلدی سے اکرم سے ہاتھ ملا کے بلکہ ہاتھ چڑا کے بھاگیں۔

راتے میں شمشاد نے کہا ”یہ شہناخ خوب صورت آدمی ہے۔ مگر اسی پر کچر کیوں بنانا ہے اور کے دلچسپی ہے۔ کسانوں کی زمین میں۔ یہاں۔ یہی میں تو ایک کیمت بھی نہیں!“

راج نے کہا ”بہن میں نہیں ہیں۔ مگر بیٹی کے باہر تو ہیں۔“

ششاد نے چڑکے کہا ”گروہاں کھیت ہیں۔ وہاں سینا گھر تو نہیں ہیں۔ کون اس تصویر کو دل چاہی ہے دیکھئے؟“

”رینجا بلی“ ہاں ری۔ اور میروئن کے کپڑے دیکھے تم نے ایک بھی تو اچھا ڈیس نہیں دیا اس کو۔“
 اری جب میرو بھائی بہت کی کچھ کسان پتری“ میں کام کر رہی تھی تو میرا بھی کسان کی بیٹی ہی کا دل تھا۔
 اسی کسان کی طرح وہ غریب تھا مگر میرو بھائی نے مجھے ہندو تھے ڈیس دے تھے۔“

”اری چوڑو“ راج نے چڑکے کہا ”کس کی بات کرتی ہو۔ یہ اکرم سر پر اے دون بھی اس کی بچہ میں جائے
 تو میرا نام راج نہیں گیراج رکھ دیتا۔“

اس پر رینجا اور ششاد بہت خنسیں۔ رینجا نے ترقی چکا ہوں سے راج کی طرف دیکھ کے کہا ہائے
 راج سے گیراج۔ ارے بھئی۔ کچھ راج تو بڑی اعلیٰ چوٹل باتیں کرتی ہے۔“

جب میں چھٹ گیا اور بہت کم لوگ رہ گئے۔ اس وقت جان دد لینڈ اکرم کو ایک
 طرف لے گیا اس نے اکرم سے بڑے مولیٰ طریقے سے مسافر کیا اور پھری بنجیدہ آواز میں اس سے
 کہا ”تم نے ایک عمدہ تصویر بنائی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں میں اسے اپنے سینا میں چلانا پسند
 کر رہا ہوں۔“

”ہاں میں؟“ اکرم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

روڈینٹ نے آہستہ سے اپنا سر ہلایا۔

اکرم چکر گیا مکان "اتر دین؟ ایسا تو اس نے اپنے کسی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔
روڈینٹ نے اُسے خاموش دیکھ کر کہا: مجھے نیو یارک سے اس کی منظوری منگانی پڑے گی۔ مگر وہ
ایک مضابطے کی کارروائی ہے۔ اس میں میرے خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ میں تمہیں پارہنٹے کی
کارٹھی دیتا ہوں۔"

اتر دین پارہنٹے؟ جاں بڑی سے بڑی تصویر دوہنٹے سے زیادہ نہیں بڑھائی جاتی تھی محال کے
پینک دی جاتی تھی جہاں کوئی ہندوستانی تصویر آج تک پیش نہ کی گئی تھی جہاں صرف امریکن
تصویریں پیش کی جاتی ہیں۔

اکرم نے ہاتھ کے اشارے سے سیٹھ کتر چند کو بلایا جس کے پاس تصویر کا نیگیٹو گروی تھا۔ تصویر
دیر کی گفتگو کے بعد سیٹھ کتر چند جاں روڈینٹ اور اکرم اور ستیہ رائے نے ایک دوسرے سے
ہاتھ ملا اور رخصت ہو گئے۔

"مذیہ تو ایک سپنا ہے۔"

"بہت جلدی ہماری شادی ہو جائے گی اب" مذیہ نے رنگ رنگ کے کہا۔

اکرم تلچتے تلچتے رنگ گیا۔

ایک اور چوڑے نے اکرم کی طرف گھور کے کہا "آگے چلو"

دائرہ ہاتھ لگا کر کم کیا سوچ رہا تھا۔ یہ ایک گھورتے ہوئے لپچتے ہوئے بوڑھے کی طرف
 دیکھ کے معافی مانگ کے سر کیا اس کے ہاتھ ہر روزی کی کرکری طرف گئے اور دائرہ بچنے لگا
 ”روزی کیا نہیں انوس تو نہیں ہوگا کہ تم نے دوسرے مذہب کے آدمی سے شادی کی؟
 روزی نے کہا ”میرا تھارا مذہب تو ایک ہے عہت؟“

اکرم روزی کا جواب سننے کے لئے پھر رگ گیا تھا پھر اُسے ایک ٹاپتے ہوئے بوڑھے کی خنکی کھانا
 کرنا پڑا۔ وہ اچھا مار کے ہنس پڑا اور روزی کو اپنے ساتھ ہال کے باہر کھینچ لایا ”اؤ روزی آج ہم ایک
 سوئس تک چلتے جائیں گے۔ پیدل آ“
 ”کہاں؟“

”یہ تو بے معلوم نہیں! عہت کی کوئی منزل ہوتی ہے؟“
 ”اؤ ستاروں سے پوچھیں“ روزی نے مشورہ دیا۔
 ”اؤ۔“

روزی نے اپنی دونوں باہیں آسمان کی طرف پھیل کے کہا ”اے ستارو!“
 اکرم نے اپنے دونوں بازو روزی کی کمر میں ڈال کے اُسے اُٹھایا، اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں
 ڈال کے کہا ”اے کبکشاں؟“

ایک سپاہی نے اُسے اُسے ٹھوکا دیا ”اے تم کیا فتنے میں ہے؟“
 ”کیا پٹیل ہے کا جو؟“ سپاہی نے پوچھا۔

”نہیں؟“

”طہرا؟“

”نہیں۔“

”پھر کیا ہے تو؟“

”عزت!“

پرسیدہ مسکرایا ”اتحقِ عزت کرنے سے یہی بہتر ہے کہ تو بڑھاپے میں نوکری کر لے“
”کیوں؟“

”کبھی میں نے بھی عزت کی تھی تو میرے سات بیچے ہیں۔ خواہ شہر روپے ہوں۔ عزت کہہ سکتی ہے۔
پرسیدہ نے گہور کر اکرم کی طرف دیکھا جیسے اُسے کچا کھا جائے گا۔

اکرم نے اک آہ بھر کے روزی سے کہا ”اکو روزی گھر چلیں۔ یہ آدمی بھی مائیت پرست معلوم ہوتا ہے“

شہر میں گورنمنٹ آف انڈیا کے فٹ ڈویژن کی طرف سے ایک نمائش جاری تھی جس میں
 امریکی، روسی، انگریزی، جاپانی، اطالوی، چینی، چیک اور فرانسیسی فلمیں دکھائی جا رہی تھیں مختلف
 ملکوں سے برگزیدہ فلمی ہستیاں بھی اس موقع پر مدعو تھیں۔ روس سے پردوکن اور چرغوسف اور لڑکی
 سے فریک کیہ ایسی مشہور ہستیوں نے بھی کے فلمی مطلقوں میں اک ہل چل سی دڑا دی تھی۔ جلد ستی
 میں بین الاقوامی فلموں کی یہ پہلی نمائش تھی اور اس قدر کامیاب تھی کہ محنت گروں پر گھنٹوں کی نوک لگا رہتا
 تھا یہ شو کئی کئی دن پہلے بک جوجاتا تھا۔ بین الاقوامی فلموں میں روسی، اطالوی اور چیک فلموں میں
 لوگوں نے بڑی دل چسپی ظاہر کی کیونکہ امریکی فلمیں تو ہر روز دیکھتے تھے۔ یہ ان کے لئے پہلا موقع تھا کہ وہ
 دوسرے ملکوں کی فلموں کے موضوعات ان کی قومی حیثیت ترتیب و تدوین اور شاٹس سے اکادم
 ہو سکیں۔ اور دل ہی دل میں ذہنی طور پر موازنہ کر سکیں۔ روسی فلموں میں "خال آف برلن" اور "ٹین
 باس انٹرز" بہت پسند کی گئیں، اور پبلک کے اسرار پر ان کے کئی شو کئے گئے۔ اس کے بعد اطالوی
 فلموں کا نمبر آتا تھا "بائیکل چور"۔ "روٹی ٹی" "مرکل آف میلان" کو عوام نے بہت سراہا چیک فلمیں
 کی فلمیں بھی پسند کی گئیں۔ اطالوی تھی حقیقت شکاری کے اسکول سے ہٹ کے کچھ لوگوں کو فرانسیسی فلموں

میں بات کہے جلنے کی جوا دل سے بہت بھائی، جینی غلوں میں سفید بالوں والی لڑکی نے ہر ایک کے دل کو مرہ دیا۔ جینی غلوں کا انداز ہماری غلوں سے ملتا جلتا تھا۔ اُن کی طرزِ ادا میں ایک ایسی ایذا نیت تھی جو انہیں ہمارے بہت قریب لے آتی تھی۔ اس ناش میں حصہ لینے والے ہر ملک نے اس موقع پر ایک غلطی دفع کی بھیجا تھا۔ مختلف دفعوں کا حکومت اور پبلک کی طرف سے شاندار سواگت کیا گیا۔ اکرم آج رات ہی ابھی ایک سیر تھریڑے واپس آیا تھا جس میں روسی وفد کا شاندار استقبال کیا گیا تھا، ہندوستانی غم کی تہم اہم اور نامور ہستیاں اس موقع پر موجود تھیں۔ لیکن جس چیز نے اس سواگت کو یادگار بنا دیا وہ پنڈت نہرو کی اس کچھل سواگت میں غیر متوقع شرکت تھی۔ پنڈت جی اسی دن لندن سے لوٹے تھے اور سفر کی سحان اور اپنی دلچسپ معروضات کے باوجود انہوں نے استقبال کی کمی کی انتہا پر اس میں شرکت کی تھی۔ ایک سیر تھریڑ کا ہال کچا کچ بھرا ہوا تھا بلکہ لوگ اُس کے باہر بھی کھڑے تھے۔ ہر حیثیت سے یہ یادگار دن تھا۔ اس لئے دوسرے دن اکرم کو بہت غصہ آیا جب اس نے تنگ نظر دفع ناموں میں یہ ٹیڑھا پنڈت جی کو اس استقبال جلسے میں شرکت نہیں کرنی چاہیے تھی وہ بہت صاف صاف کھل کر توذ کہہ سکتے تھے کیونکہ ایک عام سیدھے سادے خوب صورت کچھل جلسے کی مخالفت کرنا بہت مشکل ہوتی ہے۔ اس لئے وجہ الفاظ میں اور منہ بنا کر اور طرح طرح کی دھڑکار باتیں کہہ کر وہ پنڈت جی کے اس اقدام کی مذمت کر رہے تھے:

جسوت نے کہا "میں تم سے کہتا نہیں تھا۔ ہمارے ملک میں تنگ نظروں اور رحمت پرستوں کا ابھی تک ایک بہت بڑا گروہ ہے جو پنڈت جی کی صلاح کل چالیسی سے اتفاق نہیں رکھتا جو ہر موقع پر اس کی چیخ میں ٹھہرا بھونکنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اس لئے وہ لوگ جو باشعور ہیں، اور صلح میں ان کے لئے یہی جانی لینا کافی ہے کہ پنڈت نہرو اور ان کی حکومت ان کے لئے خاطر خواہ کوشش کر رہی ہے۔ ہیں خود بھی اس کوشش میں ان کا ہاتھ بٹانا ہو گا۔ اپنی ترقی پسند کاوشوں

کو جاری رکھتے ہوئے پنڈت نہرو اور اپنی حکومت کی صلاح پر ایسی کے ہاتھ مضبوط کرنے ہوں گے ؟

”جیہ بڑے غور سے اس گفتگو کو سن رہی تھی ان پہلے سات آٹھ ماہ میں اس نے ذہنی طور پر بہت فاصلہ طے کر لیا تھا۔ کسان تصور کے متخل کرنے میں اس کی ان جھک کو شیشوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا وہ دہائی رات کام کاج میں جتنی رہتی تھی سیٹ پر وہ اکرم کی اسسٹنٹ کا کام باقاعدگی سے کرتی تھی۔ اس کے علاوہ عورتوں کے لباس اور آرائش کا شعبہ بھی اکرم نے رضیہ کے سپرد کر دیا تھا۔ رضیہ کا خیال تھا کہ شاید رضیہ ضرورت سے زیادہ کام کرتی ہے مگر رضیہ زیادہ کام سے کبھی گھبراتی نہیں تھی بڑی خندہ پیشانی سے روزمرہ کے شوٹنگ کی الجھنوں کو سلجھا دیتی۔

ایک دن رضیہ نے پوچھ لیا ”تو جو دہائی رات کام میں لگی رہتی ہے یزیدی کبھی گھومنے کو نہیں چاہتا ؟ کہیں تفریح کرنے کو رضیہ ؟“

رضیہ بیک ایک سی ٹی بولی ”گھومنے کو؟۔۔۔۔۔ اب نہیں چاہتا اب کسی کے ساتھ کہیں تفریح کرنے کو نہیں چاہتا!“

رضیہ نے اسے گلے سے لگا لیا ”اسی لئے زیادہ کام کرتی ہے؟“

رضیہ نے کہا ”نہیں۔۔۔ بات نہیں ہے۔ مجھے کام میں بہت گھٹن آتا ہے غم کا کام مجھے پسند ہے تو پھر میں اُسے اچھی طرح سیکھ کیوں نہ لوں؟“

”فلم ڈائریکٹر بننے کی؟ ایک عورت ہو کر؟“

”عورت ایک فلم ڈائریکٹر کیوں نہیں بن سکتی؟“

رضیہ نے ہنس کر کہا ”میں جانتی ہوں۔ تو اس لئے زیادہ کام کرتی ہے کہ کسی کو بھول سکے؟“

رضیہ چپ ہو گئی۔ بہت دیر کے بعد بولی۔ گویا اب تک اپنا دل ٹول رہی تھی ”یہ بھی ٹھیک ہے رضیہ میں اب تک عسرت کو بھولی نہیں ہوں۔ مگر اسے بھڑ دینا چاہتی ہوں مگر اس کام میں زیادہ دل لگانا

موت اس نے نہیں ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے۔ مگر سب سے بڑی وجہ نہیں ہے۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ کام۔ خود اس کام میں مجھے بڑی دلچسپی ہے میں سمجھ نہیں سکتی۔ ہم میں سے بہت سی لڑکیاں عمدہ ساڑی پہنے پ اپ اسٹک اور سُرخ لٹکائے زیوروں میں جیم جھپاتی ہوئی سیٹ پر اس کونے سے اُس کونے تک بھل جاتی ہیں اور کہتی یہ نہیں سوچتی کہ ظلم کیسے تیار ہوتی ہے۔ کیونکر تیار ہوتی ہے اس کی تیاری میں کون سے مراحل آنے میں کون سے مسئلے اُنہیں کس طرح حل کیا جاسکتا ہے ایک چیز جو ہماری روزمرہ کی زندگی ہے جس کی بنیاد پر ہماری ساری زندگی چلتی ہے ایک اسی سے ہم اس قدر لاپرواہ ہو جاتی ہیں کہ دل میں ہمیشہ خیال رہتا ہے کہ کب کسی طرح جلدی سے شوٹنگ ختم ہو اور ہم بھاگ جائیں۔ یہ بھاگنا ہمیں بہت ہنسکا پڑا ہے رضیہ

رضیہ بیک ایک خاموش بوگٹی۔ اتنی بلی تھی کہ اس نے زندگی میں کبھی ذکی تھی اب جب وہ ایک سانس میں اتنی باتیں کہہ گئی تو خود اپنے آپ پر اُسے حیرت ہونے لگی اور رضیہ کا تو منہ کھلے کا کھلا ہی رہ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد رضیہ اُستے سے ہوئی "اسی کم نیت تو تو بہت لگے پڑے گی" رضیہ کے ایک اس جملے نے رضیہ کی ہمت اور بندھادی۔ اب تو وہ اکرم کے ساتھ ساتھ اس کے دوسرے ساتھی کاموں میں بھی حصہ بناتی تھی۔ رضیہ بھی کام کرتی تھی مگر اسے اپنے لباس میں اپنی خرابی و آرائش ہی سے کم فرصت ملتی تھی۔ دوری کہ ان دونوں سے حسین تھی اور وہ ایک زیادہ آزاد ماحول میں پائی تھی اور مسلسل شوق کرنے سے اب اُسے اپنے میک آپ میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا مگر ابھی وہ نوکرانہ محنت تھی کام کم کرتی تھی اکرم کو زیادہ دیکھتی تھی۔ آپس زیادہ بھرتی تھی اور خاص طور پر جب کبھی اکرم کہیں اس کے نزدیک جوتا تو اس کے گرد پیش کیا۔ ہر اُسے کچھ یاد نہ رہتا اس وہ طرز پر آرام کو دیکھنے لگتی اور رضیہ کو اُسے ڈانٹنا پڑتا اور روزی کا چہرہ کد دم سسرخ ہو جاتا اور وہ رضیہ سے مساتی تاکہ کہہ رہا ہے کام میں لگ جاتی۔ مگر پھر جب کبھی اکرم اُسے دکھائی

دے جا کر پھر اپنے گرد پیش کی دنیا کو بھول جاتی۔ ان دنوں صفی کے لئے سدا آسمان بھولی تھا اور ساری زمین اک نیلگوں سبزے میں کھوئی ہوئی تھی۔ تھیرے صفی کو بخشش میں آتے ہوئے اپنے دل میں اک چہی ہی محسوس کرتی۔ اک لمحے کے لئے عشرت اس کی نگاہوں کے سامنے آکر دکھائی دے مگر پھر اس کی یاد کو بڑی سختی سے دل کے کسی کونے میں دھکیل دیتی اور اپنے ہونٹ چبائے ہوئے اپنے کام میں مصروف ہو جاتی۔

اس وقت جنوت اور اکرم کو رات کے چلے پر بحث کرتے ہوئے دیکھ کر اُسے یاد آیا کہ رسولِ بستی شامی بسا کی فلم کیٹی کی طرف سے باہر نکلے ہوئے قنفلت ملک کے فلمی دھندوں کو مستلِ مشغولہ میں ایک دھرت دی جانے والی ہے جس کا ذرا اکرم اور اس کے ساتھیوں نے یاد ہے اور انکی اس سلسلے میں کچھ کام نہیں ہوا ہے۔

دھیرے اکرم کو یاد دلاتے ہوئے کہا "اُنٹوک بنگ یہاں بحث کرتے رہو گے۔ اس دھوت کے خلق کہاں کہاں جاتا ہے۔ کچھ پتہ بھی نہیں ہے۔"

اکرم کچھ کہنے ہی والا تھا کہ جنوت نے پوچھا "اس دھوت میں کئی لوگوں کو بڑا رہے ہو۔"
"تمام فلمی دھندوں کو۔"

تھرکچوں کو کبھی ستیہ رائے نے چلائے ہوئے "کم نیت جیہاں جلتے ہی فلاں کھڑا کر دیتے ہی۔ کوریا میں۔ انڈیا چائنا میں، فاروسا میں، جاپان میں، خانات سلو کے جزیروں میں، قرقس میں، آلی میں، برطانیہ میں، اورے جہاں جاؤ۔ یہ سب لوگ اپنی خلیوں کی اپنا بوائی اٹا، اپنا ٹیم لے کر جگہ موجود ہیں؟"

"کیوں نہیں جلائیں گے۔ خود جلائیں گے۔"

"کام کرنے پر شامی بسا کا۔ پلانے ہو چنگ بازوں کو...."

جس نے کہا "مجھے ستیہ رائے کی دلیل میں کچھ وزن معلوم ہوتا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ بالکل غلط بات ہے کہ امریکی جنگ باز ہیں۔ ایک آدمی جنگ باز ہو سکتا ہے دس آدمی جنگ باز ہو سکتے ہیں، دس ہزار آدمی جنگ باز ہو سکتے ہیں لیکن دس کروڑ آدمی جنگ باز نہیں ہو سکتے۔ کیا تم مجھے یہ بتانا چاہتے ہو کہ امریکہ کے شہروں اور دیہاتوں میں انسان نہیں بستے۔ کیا ان انسانوں کے گھر نہیں ہیں۔ ان گھروں میں ان کے محبوب بچے، عورتیں، مائیں، باپ اور بھائی نہیں رہتے۔ کیا تم مجھے یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہو کہ وہ لوگ اپنے سر پر اٹیم کی تلوار لٹکتے ہوئے نہیں دیکھتے کیا ان کو یہ بھروسہ ہے کہ اگر کوئی جنگ شروع ہوئی، تو یہ اُن کے گھروں پر نہیں گرے گا کیا وہ لوگ اوپر سے یہی دل ہی دل میں یہ دمانیں لگتے ہوں گے یا خدا کسی طرح یہ جنگ کی مصیبت ٹل جائے، کسی طرح سے ٹل جائے؛ کیا ان ایسا نہیں سوچتے ہوں گے میرا خیال ہے کہ ضرور سوچتے ہوں گے۔ کیونکہ میرا اعتقاد ہے کہ حکومتیں بُری ہو سکتی ہیں، سماج بُرے ہو سکتے ہیں معاشرے بُرے ہو سکتے ہیں، معاشی نظام بُرے ہو سکتے ہیں لیکن لوگ بُرے نہیں ہوتے۔ چند آدمی بُرے ہو سکتے ہیں لیکن سارے لوگ بُرے نہیں ہوتے۔"

"جناب کا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا" ستیہ رائے نے جھٹکے کہا "آج کل تو جو اخبار پڑھو جنگ کی خبریں آتی ہیں جو امریکی جنرل یا ایڈمرل اٹھتا ہے۔ اٹیم بم کا سوٹا گھماتے ہوئے دھماکا آئینہ نقسری کرتا ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ ان موت بلاؤ۔ یہ لوگ سادی دنیا پر اپنا جھنڈا لگانے کی فکر میں ہیں یہ لوگ پختے جنگ باز ہیں۔"

اکرم نے کہا "تم کہتے ہو وہ لوگ جنگ باز ہیں وہ لوگ کہتے ہیں سادی مسرہت کی جرم کنوٹ میں بہر فیصلہ کس طرح سے ہو گا۔" اٹیم بم سے: "دوسرے نے سر ہلا کے کیا۔"

اکرم نے جس کے کہا "فیصلے ہی کی ایک صورت ہے۔ دونوں کو ایک ہی ذمہ داری میں جبا یا جائے۔"

کہہ نہ کم میں تو بلاؤں گا اسی دعوت میں :

جسوت نے شیعہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا "تم بلاؤ گے مگر میرا خیال ہے وہ نہیں آئیں گے۔ مگر آجائیں تو آجائیں مگر نہ کنیڈین آئیں گے نہ فرانسیسی، نہ اطالوی وفد کے سربراہی ہم کی فلم کئی کا جلسہ ہے۔ امریکی لوگوں، حالت میں نہیں آئیں گے دیکھتے ہو یہ سوجگ کتنے زوروں پر ہے۔"

اکرم نے کہا "وہ آئیں نہ آئیں میں تو ضرور جڑوں گا۔"

مگر شانتی سبساکی فلم کئی کی دعوت خطاوت قوت بہت کامیاب رہی امریکی بھی لکے اور برطانوی بھی اور کنیڈین بھی۔ فرانسیسی بھی اطالوی بھی۔ روسی چینی اور چیک وفدوں کے اراکین بھی زیادہ سے زیادہ تعداد میں موجود تھے۔ وہاں فرینک کیپرل تھے اور پیو وکن تھے اور فرانسیسی ڈائریکٹر اور اطالوی کیمرو مین، کنیڈین اور چینی اور ہندوستانی فلم انڈسٹری کے تمام ذمہ دار افراد برگزیدہ پروڈیوسر اور فنانشر تمام بڑے بڑے اداکار موجود تھے۔ سنٹرل سٹوڈیو کے نمبر دو سٹیج کاشن مارہال بہت عمدہ طریقے سے سجایا گیا تھا ہندوستانی طریقے سے یہاں نہ کرسیاں تھیں نہ میز فرش پر بڑے بڑے نرم اور گداز غالیچے بچا دئے گئے تھے اور سب لوگ شرقی بھی اور مغربی، ایشیائی اور یورپین سب لوگ ہانگیں پرارے یا ہانگیں دبائے یا ہانگوں پر ہانگیں رکھے یا ہاتھی پانی مارے۔ صبح ہندوستانی طریقے سے بیٹھے تھے اور ہندوستانی اداکاروں کی طرف سے پیش کئے گئے کپڑے بدگرم کو بڑے خوبے دیکھ رہے تھے اور سن رہے تھے یہ ایک عجیب و غریب دعوت تھی جو رات کے تین بجے تک

چلتی رہی۔ کوئی دہاں سے نہیں ہلا اس خد دل چسپ پروگرام تھا۔ بار بار پروگرام کے مختلف حصوں کو سوز
مہانوں کے اسرار پر دہرایا گیا اور تھوڑے ہی عرصے میں امریکی، روسی، چینی اور ہندوستانی فرانسیسی اور
اطالوی۔ شہر و شکر ہو کے دس سو بول رہے تھے جیسے کبھی ایک دوسرے سے جوا نہ تھے۔

اور اس ہال سے باہر سرد جنگ جاری تھی۔ سورہے لگے تھے۔ خد قیں کھدی تھیں، اختیار میں کئی جگہیں
پراس وقت بھی بیماری ہو رہی تھی۔ جوانی جہان کو ریاض میں غلام کا آتش گیر مادہ غریب کو ربائی کا لڑن
کے چھوٹے چھوٹے گھروں پر برسا رہے تھے آج کی اس تاریک رات میں کہیں پر کوئی گھر جھکے
اڑ گیا۔ کوئی تخریب ہو گیا کوئی یہی ہو رہی ہو گئی۔ کوئی ماں اپنے جوان بیٹے کی شکل ایش سے ہٹ کر رہ گئی۔
اور لاکھوں یورپی گھروں میں مائیں اور بچے۔ بیٹے اور جوان۔ آئندہ جنگ کے خوب سے ہے
ہوئے اس وقت بھی یہ سوچ رہے تھے کہ کس کی جگہ کون سی خبر لائے گی۔

لیکن اس ہال میں کتنا امن تھا۔ کتنا سکون تھا۔ کتنی مسرت کتنا بھرپور سیماں پر فتنے تھے اور تاج
اور گیت اور تالیاں، یہاں دوستی کے پر جوش مصلحت تھے اور مٹھا جوں میں دوستی اور مفاقت
انسانیت۔ بھرپور اور مہربانی کی چمک اور تابانی !

اس ہال میں تمام دنیا کے مختلف قوموں، نسلوں، رشتوں اور نظریوں کے لوگ جمع تھے۔ لوگ جو
انگ انگ ایک دوسرے سے برگشتہ فاطمے تھے۔ یا یوں تھے اور نفرت کے نقطے پر پہنچتے جا رہے
تھے۔ شاید جب وہ اس ہال میں آئے تو اپنی تمام مجبوریوں، کمزوریاں اور اپنے پہلے سے سوچے گئے
ہوئے خیال اپنے ساتھ لائے تھے۔ لیکن جب یہاں ان کی نگاہیں ایک دوسرے سے ملیں تو پہلے
بٹ گئے اور ساتھ بیٹھے ہوئے ان لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک ہی گیت کو پسند کر سکتے ہیں
ایک نغمہ پر تالی بجا سکتے ہیں۔ ایک ہی مذاق پر سنیں سکتے ہیں۔ وہ آدمی تھے اور سارے وہ کئے تھے
ہاں ! ہاں کے اندر! — تو پھر ہال کے باہر کوئی نہیں۔

اس واقعے کے چند روز بعد رضیہ رضیہ کے پاس جھونپڑوں میں آئی اور اس سے کہنے لگی
 "حضرت سائیں ہسپتال میں ہے اور مر رہا ہے"۔

رضیہ کا چہرہ اک دم پتلا پڑ گیا اتنے زور سے اس نے سانس اندر کو کھینچی کہ اس کے طلق سے ایک غیبی
 زخمی جانور کی سی چیخ نکل گئی۔ رضیہ نے اُسے سہارا دیا۔ مگر وہ رضیہ کا رد عمل دیکھ کر حیران ہو گئی۔ اتنے
 عرصے سے کبھی اس کے اور رضیہ کے درمیان عشرت کے متعلق کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اگر کبھی رضیہ
 نے بات کی بھی۔ تو رضیہ نے ہنس کر ٹال دیا۔ یا ایسی لاپرواہی سے اس کا ذکر کیا۔ جیسے وہ اُسے بھول
 چکی ہے۔ لیکن اب رضیہ کو اس حالت میں دیکھ کر رضیہ کو اپنی رائے بدلتا پڑی۔ اس نے سوچا۔ اگر مجھے
 معلوم ہوتا۔ یہ موتی سے اپنی جان کو لٹکانے لگی تو میں یہ خبر دوسرے طریقے سے آہستہ آہستہ سے
 سناتی۔

تھوڑی دیر کے بعد رضیہ نے پوچھا۔

"کہاں ہے وہ؟" اس کی آواز سرگوشی سے ذرا ہی بلند تھی۔

"سائیں ہسپتال میں"

”سائیں ہسپتال کہاں ہے؟“

”سائیں میں؟ جہاں پہلے ٹری کی پارکس ہوا کرتی تھیں نا انیس اب جہل ہسپتال میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔“
”تھیں کیسے معلوم ہوا۔“

”جیسے ٹاکر گج راج سنگھ اپنے اکثر اہلین کے پریذیڈنٹ نے بتایا وہ اُسے دیکھنے گئے تھے۔ کیوں کہ عشرت نے اُسے بلایا تھا اور اس نے.... میرا مطلب ہے عشرت نے خاص طور پر کہ: ان سنگھ سے کہا تھا کہ رضیہ کو میری بیماری کی اطلاع نہ ملے۔ مگر چونکہ اب وہ مر رہا ہے اس لئے میں نے.... رضیہ نے فقرہ اتھام چھوڑ دیا۔ رضیہ نے اپنا پس بٹھایا اور جھونپڑے سے باہر نکل گئی۔“

”کہاں جا رہی ہے تو۔۔۔۔۔ رضیہ نے پتلا کے پرچھا
مگر رضیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔“

وہ بستی کی گلی سے دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ وہاں سے بائیسٹل کے پل تک بھاگتی ہوئی گئی۔ ایک دیوانی عورت کی طرح۔ جب وہ بائیسٹل کے سبس اسٹینڈ پہنچی تو اس کا دم پھول رہا تھا اس کا سارا جسم پسینے میں تر ہو رہا تھا۔ لیکن اُسے اپنی جسمانی تکلیف کا کوئی خیال نہ تھا۔ وہاں سے اس نے سائیں جانے والی تیز پس لی اور اس میں بیٹھ کر سائیں ہسپتال کے نام کے پر جا اترتی۔ اور سیدھی اندر چلی گئی۔ مریضوں سے ملاقات کا وقت ساڑھے چار بجے کا تھا اور ابھی اس میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ کچھ عرصہ تو زخموں اور ڈاکٹروں سے پوچھنے میں گزر گیا کہ عشرت کو کون سے د۔۔۔!

میں داخل کیا گیا تھا اس کے بعد رفیعہ دینک ہسپتال کی مشینوں اور پگ ڈنڈیلوں پر مشغول رہی گھاس کے قطعوں میں کہیں کہیں پھولوں نے کھلنے کی کوشش کی تھی۔ مگر ہسپتال کی بیمار فضا میں ان کی کوششیں کچھ عجیب محسوس نہ ہو رہی تھیں۔ سبز سے بھی قائل اور شیل کی بو نہ رہی تھی۔ سرخ ایشیوں کی لمبی لمبی نجی نجی بارکیں ایک عجیب افسردہ منظر پیش کرتی تھیں۔ آہستہ آہستہ ملاقاتیوں کی تعداد بڑھتی گئی بہت سے لوگوں کے ہاتھوں میں پہل اور پھول تھے۔ ان سے رفیعہ کو بھی خیال آیا اور وہ دوری دوری ہسپتال کے باہر گئی۔ جہاں دو تین ٹھیلے والے دوکانیں بھلے بیٹھے تھے۔ جن لوگوں کی شہ نرغ بازار سے دو گئی تھی۔ پھر کبھی رفیعہ نے آدمی و جن موسمیاں اور حوسیب خریدنے اور ٹکسید کے پھولوں کا ایک گچھا اُسے چار آنے میں مل گیا پھل اور گلاب لے کر وہ پھر ہسپتال کے اندر آ گئی عشرت بنی وارڈ میں داخل تھا۔ رفیعہ جلدی سے بنی وارڈ کی روشنی کی طرف گئی کیوں کہ ہسپتال میں اب ملاقات کے وقت کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اور لوگ باگ تپے عورتیں ماٹیں اور بھائی باپ اور بیٹیاں دوست اور رشتہ دار مریضوں کو دیکھنے کے لئے مختلف وارڈوں میں گھس رہے تھے۔ رفیعہ بھی جلدی سے بنی وارڈ میں گھس گئی۔ جنرل وارڈ کے اندر قطار در قطار لیٹنگوں پر مریض بیٹھے یا لیٹے ہوئے اپنے ملاقاتیوں سے باتیں شروع کر رہے تھے۔ ہسپتال کی زندگی میں مریضوں کے لئے یہ زندگی کے سب سے دل خوش کن لمحے ہوتے ہیں جب باہر کی زندگی کے تلاء جھونکے ہسپتال کی بیمار فضا میں داخل ہوتے ہیں اور اپنے ساتھ اُمید، مسرت اور ہمتی بھی لے جاتے ہیں۔ کی شادمانی اپنے ہمراہ لے جاتے ہیں۔ مریضوں کے بھوکے تڑپے چہرے بیمار اور اداس چہرے اس مسرت کی طرف اس اُمید اور اشک کے طے جلے جذبات سے دیکھتے ہیں جیسے زندگی کو اپنے ہاتھوں اپنے ہاتھوں اور اپنے پیروں سے پکڑ کر اسی سے ٹک جائیں گے۔

رفیعہ ایک بار سارے وارڈ کا پکڑ لگا کے گھوم گئی۔ اسے عشرت کہیں دکھائی نہ دیا۔

دوسری بار وہ پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہر ایک پنک کو غور سے دیکھتے ہوئے زس کی طرف
 بڑھ رہی تھی تاکہ اس سے پہلے کہ عشرت کہاں سے کہیں اس کا پتہ چلنے میں زس نے غلطی تو نہیں
 کی دوسری بار وہ ذرائع دیوار سے لگے ہوئے بہت سے پنکوں کو دیکھتی ہوئی مرکز میں گچے ہوئے
 زس کی بیزر کی طرف جا رہی تھی کہ کسی نے اُسے خفیہ آواز میں پکارا۔

”رضیہ“

رضیہ نے ہلٹ کر دیکھا۔

”یہ بیزر کے بیڈ سے ایک سیاہ دھواں اٹھا ہوا چہرہ اس کی طرف تک رہا تھا۔ آنکھیں گہرے گڑھوں
 میں دھنسی ہوئی تھیں۔ رخسار اندر کو گھسے ہوئے تھے ملتوی پتی گردوں سے باہر کی پڑانے وقت
 کی گرہ بند جڑ کی طرح جو زمین سے اُکھر کر باہر اُٹھی ہو۔ ایک پتلا سا نلوا سا ہاتھ اُٹھا اور ہر پنک
 پر گر گیا۔ رضیہ نے بڑی حیرت سے اس بھنی کی طرف دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ اُس کے قریب گئی، اور
 پوچھنے لگی۔

”میں نے آپ کو سہانا نہیں۔ صاف کیجئے گا۔ آپ کون ہیں“

وہ تاریک گڑھوں کے اندر کی سیاہ سیاہ پتلیاں ذرا سی جھلک گئیں۔ بہت عرصے تک وہ چار
 چہرہ رضیہ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ سوکھے سیاہ سے ہونٹ بٹے۔ ”عشرت“
 ”عشرت“ رضیہ جی اور اُس پاس کے پنکوں کے مریض اور اُن کے ملاقاتی چونک کر ان کی طرف
 دیکھنے لگے زس نے کہا ”شیش شیش شیش شور نہ کرو“

”عشرت! اپنی آواز کی حیرت کو بدلے ہوئے فیر پھر ہوئی۔ اور عشرت کے پنک پر ٹیپ گئی عشرت! آ
 ”وہ بہت دیر تک اُس سخ شدہ چہرے کی طرف دیکھتی رہی اور اُن نے پھوٹے کھنڈوں
 کی اینٹوں سے اس چہرے کو تعمیر کرتی رہی، جو کبھی عشرت کا چہرہ تھا۔ بہت آہستہ سے اسی

بھلا سے وہ لب اُبھرے جو کبھی عشرت کے تھے اور ان گالوں پر وہ سُرخیاں اور صباحت آئی جو کبھی
عشرت کی تھی۔ بہت ہی آہستہ سے وہ آنکھیں ان تنگ مادہ تاریک گڑبڑوں سے اُپر اُٹھنے لگیں
سیاہ دھواں کھا ہوا پُرشکن، اتھا روغن اور بھات ہوتا گیا، اور جب رخصی نے اپنے عشرت کو بھان لیا
تو اس نے اس کا خیف و زار ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور چُپ چاپ روئے لگی۔ تلتے سالتے
کی گھنٹی بونڈ نری ہوئی، مجروح محبت اس کی آنکھوں سے اُبل کر باہر آگئی اور اس کے خدایوں پر پہنچے
لگی اور وہ اپنے آپ کو روک نہ سکی۔ اور چُپ چاپ آنسو پونچھے بغیر روتی رہی۔ اور عشرت کا ہاتھ اس
کے ہاتھ میں کاٹیا رہا۔ یہ ہاتھ جو ہاتھ نہ تھا مانی کا ایک پٹا ہوا دق تھا۔ ایک دق کتاب زندگی
سے اُکڑا ہوا جس کے مستقبل کے سب صفحے غائب تھے۔ ”تم اس زندگی کا یا بنا سکتے ہو۔“ رضیہ
بچی نہیں جو کہ اس کاغذ کی ایک گشتی بنا ڈالو اور اسے زندگی کے دریا میں بہا دو۔ اور اسے لہریں
لیتے ہوئے دریا کی سطح پر غائب ہوتے ہوئے دگتی رہو۔ تم اس قدر غیر جذباتی بھی نہیں ہو کہ اس
کاغذ سے اپنے جوتے بوجھ لو اور اُن کا پالش چکا لو۔ میت سے لوگ دوسروں کا زندگیوں سے
ایسا ہی کرتے ہیں۔ اس کاغذ پر اب وہ روشن تصویریں آ رہی ہیں۔ وہی تھاری امیدوں کا مرکز
تھی کہ تم اس وجہ سے اسے تھکر کے اپنے بلاؤں کے نیچے دھڑکتے ہوئے بننے لگاؤ۔ یہ
تو ایک شکستہ زندگی کا پٹا ہوا دق ہے جو ساج کے تیز و محکم طوفان کے چھیڑے کھاتا ہوا، بجلی
سے اُڑا ہوا، تھارے سانسے آ رہا ہے۔ اس پر راہ چلتے قدموں کی کچڑ ہے۔ گندی ٹالیوں کی برہے،
بیتے زخموں کا ہوا اور کھنکھارتے ہوئے گلوں کا شور ہے۔ اس سلسلے کچلے پٹھے پٹھے دق کا تم
کیا کرو گی، جس کی زندگی کا ایک حرف بھی اب ٹھیک طرح سے نہیں پڑ جا جاتا۔ بھاگ جاؤ
رضیہ یہاں سے بھاگ جاؤ۔

لیکن رضیہ بھاگ نہیں۔ دوڑی نہیں۔ غائب نہیں ہوئی۔ وہ اس بستر پر چلی۔ سکتی رہی۔ وہ ادھ

بھی عشرت کے خاموش انکار کے باوجود اس کے قریب آگئی۔ اس نے عشرت کو سب کے سامنے اپنے گمے سے لگایا۔ اس نے اس کا ہاتھ چومنا اس کے بٹے ہوئے رخسار چومے اور اس سے آہن تانوں اور سیکیوں کے بیچ میں کہا۔

”تم زندہ رہو گے عشرت۔ تم زندہ رہو گے۔ میں تمہیں زندگی دوں گی۔ اپنی ساری زندگی تمہیں دے دوں گی۔ یہ کہتے ہوئے رفیع کے چہرے پر وہ جلال تھا۔ جیسے وہ خود کوئی انسان نہ ہو، ایسا ہو۔ اور سوتے ہوئے عشرت کے دل میں زندگی کا شعلہ بھڑکا، اور حیات کی بھیجی ہوئی تو پھر سے سہارا پا کر چمکنے لگی، اور وہ سوچنے لگا۔ سچ، کوئی محبت نہیں کر سکتا عورت کی طرح، اور کوئی قربانی نہیں دے سکتا عورت کی طرح، اور کوئی معاف نہیں کر سکتا عورت کی طرح، اور کوئی کسی کے لئے جان نہیں دے سکتا عورت کی طرح، ایک بہت ہی معمولی ہستی ہوتی ہے۔ بہت ہی معمولی چھوٹی اور نازک لیکے اپنے معمولی سے چھوٹے سے ماحول میں اک خدا کی طرح ہستی ہے۔ وہ حقیقت کرتی ہے اور شب و روز زندگی دیتی ہے۔ اور اس کی کوکھ سے اور پیٹ سے ہونٹ اور ہاتھ کی پھلیں سے، زندگی کے ہوا اس کے دودھ اس کے شہد اور اس کے گلاب کی بھک آتی ہے

بہت دیر تک رفیع عشرت کا سراپا آنکھوں میں لے بیٹھی وہی اور صحت دیر تک اس کی باتیں سنتی رہی۔ کوئی چھوٹی باتیں، بے ربط سے جملے۔ خاموشیوں کے وقفے جو کبھی کبھی جھلکے سے نہ ہوتے تھے سیکیوں میں ڈھیلے ہوئے فخرے بے ٹھل بے ٹھل ہاتھ آہستہ آہستہ دیر دیر لگے تھے پالانی میں رفیع کے کہیں بھی مشقت کے منی کی کہانی کہ، خج شعل اختیار کرنے لگی۔ اس کہانی کی کوئی معمولی شکل و صورت نہ تھی۔ وہ ایک سبب ہوتا کہ سیکر تھی، کیوں کہ عشرت نے زندگی کی تلپٹ کا آخری قلوہ پایا تھا، اور وہ ساج کی تہ میں ٹھوب کران کا لالہ لگا ہوا تھا، جہاں ناسودوں کے بھول کھلتے اور بیاریوں اور جراثیم کی پیپ لادے کی طرح بہتی ہے اور غیر سماجی افراد شاک پھیلیوں کی طرح ٹھو

اور بے باک اس جہر آب دنیا میں اپنا شمار ڈھونڈتے ہیں۔ عشرت نے یہ سب کچھ دیکھا تھا۔ اور اب دنیا نے اس کی ہڈیوں تک ہاگڑت کھایا تھا۔ اور اس کی رگوں کا سارا لہو نچوڑ لیا تھا۔ اور اسے یوں کی نچڑی ہوئی کھال کی طرح باہر کوٹے پر پھینک دیا تھا، کسی نہ کسی طرح عشرت اس ہسپتال میں پہنچ گیا تھا، اپنی زندگی کے آخری ایام پر سے کرنے کے لئے....

عشرت نے کہا ”میں چاہتا نہیں تھا کہ میں تمہیں اپنا چہرہ دکھاؤں؟“
”کیوں؟“

”کہ نہیں سکتا“ عشرت نے اپنا دل ٹٹوتے ہوئے آہستہ آہستہ رگ دگ کر کہا ”مرن یہ چاہتا تھا کہ جب مراؤں تو تلاش تمہارے حوالے کر دی جائے“
”کیوں؟“

سوچتا ہوں جن لوگوں نے میری زندگی کی بے عزتی کی۔ وہ میری موت کی کبے عزت کر سکیں گے مرن یہ خیال تھا، تم میرے مرنے کے بعد میری بے عزتی نہیں کر سکو گے؟
”غیر خب ہو گئی۔“

عشرت نے کہا ”ہاں مرنے سے پہلے راج کو اپنا چہرہ منور دکھانا چاہتا تھا“
”درد اک نچر کی طرح دھیر کے طے میں گھوما۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جوتی نہیں لگی تک اس سے نصبت ہے؟“

”نصبت؟“ عشرت ہنسا۔ اس کی آنسو بڑی تلخ اور ناخوش گوار تھی۔ عشرت نے بڑی تیزی اور تندہی سے کہا ”مرن ایک لمحے کے لئے اُسے یہ چہرہ دکھانا چاہتا تھا۔ آج کا چہرہ میرا چہرہ۔ جیسے آج ہے۔ مرن ایک لمحے کے لئے۔ کیا تم سمجھ سکتی ہو؟“
”طیر نے کہا“ ہاں میں سمجھتی ہوں“

عشرت نے کہا ”نرس نے مجھے بتایا، ان کا خیال تھا۔ میں ایک ہفتے میں مر جاؤں گا۔ ڈاکٹر نے دس دن پہلے مجھ سے کہا تھا۔ تم اپنے گمراہوں کو اطلاع کرو۔ مگر میری ہمت نہ ہوئی اور بڑی اماں کے پاس پیسے بھی نہ ہوں گے آنے کے لئے اور پھولے پھوٹے مہین بھائی۔ نہیں۔ نہیں۔ میری ہمت نہ ہوئی۔ میں نے سوچا میں اکیلا ہی مر جاؤں گا۔ وہ ہفتہ بھی گزر گیا اور میں زندہ ہوں“

رفیہ نے کہا ”تم زندہ رہو گے۔ میں نہیں زندہ رکھوں گی۔ اب تم نہیں رو گے۔ رفیہ کے لیے میں بڑا یقین تھا۔ عزم اور اعتماد اور بھروسہ یکا یک ہسپتال کے وارڈوں میں گھنٹیاں بجے ٹیکس ملاقات کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ رفیہ نے اپنے آنسو پونچھ کر کہا ”میں کل پھر نکوں گی۔ ہر روز آتی رہوں گی، مت گمراؤ اب تم باطل اپنے ہو جاؤ گے“

ہسپتال کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے رفیہ گوی، عشرت برابر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اگلے دن عشرت کی حالت زیادہ خراب تھی۔ جب رضیہ وہاں پہنچی تو اس کی آنکھیں
 بے فوری نظر آتی تھیں۔ اور وہ بہت خاموش لیٹا تھا، ٹاکڑوں نے آج اُسے سیلائین پر رکھا تھا
 انیل کے سینڈ پر کلچ کی ٹوٹیوں سے سیلائین قلعہ قلعہ کر کے اُس کے جسم میں پہنایا جا رہا تھا۔
 ”تم اس قدر خاموش کیوں ہو“ رضیہ نے پوچھا۔

”کچھ نہیں! عشرت نے جواب دیا اور پھر بہت دیر تک خاموش رہا۔
 رضیہ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کہاں سے کہہ کرے وہ اسے بہت دلائے۔ کیسے؟ یکا یک اس کی نظر
 قریب کے بیڈ پر پڑی۔ انیس خبر کے بیڈ پر آج ایک نیا مریض آیا تھا اکل والا بیباں موجود تھا، جو
 بار بار رضیہ کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ رضیہ نے پوچھا۔

”تمہارا ٹیوی آج بدل گیا؟“

”ہاں“

”وہ پُرانا کہاں چلا گیا“

”مرگیا“ عشرت نے آہستہ سے کہا۔

رضیہ نے اگلے روز رضیہ سے کچھ روپے اُدھار لئے کچھ اس کے پاس بھی تھے لہٰذا کس نے اس دن کا ایڈوائس کرایہ ہسپتال میں داخل کر دیا، اور عشرت کو پرائیوٹ وارڈ میں ایک بلکمرے میں داخل کر دیا، پرائیوٹ وارڈ میں داخل ہوتے ہی عشرت کی حالت بہتر ہونے لگی۔ رضیہ ہر روز آتی تھی ہر روز اس کے لئے پھل اور بھول لاتی تھی اور یہ قواب پرائیوٹ وارڈ کا کمرہ تھا، اس لئے رضیہ جتنی دیر چاہے وہاں ٹھہر سکتی تھی اس لئے جب بھی اُسے کام سے فرصت ملتی وہ یہاں آجاتی۔ بلکہ کئی بار تو کام کو ترجیح نہ دے کر وہ یہاں آجاتی۔ ڈاکٹر جنت جو ہر روز عشرت کو دیکھنے آتے تھے عشرت کی بہتر حالت کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ رضیہ سے بولے ”جب سے تم آئی ہو اس کی حالت اچھی ہو رہی ہے۔ میں تو تقریباً یارہ سو چھپکا تھا، کیونکہ عشرت میں اپنی زندگی سے روٹنے کے لئے اندقت ذہنی اور جب مریض ہی مرنے چاہے تو ڈاکٹر اُسے کب تک زندہ رکھ سکتا ہے؟“ جب ڈاکٹر چلا گیا تو عشرت نے کہا ”ڈاکٹر چچ کہتا تھا۔ اُن دنوں میرے دل میں بیٹنے کی خواہش تک باقی نہ رہی تھی“

”تم کو زندہ رہنا ہو گا عشرت! اپنی بوڑھی ماں کے لئے اپنے غم بھائی بہنوں کے لئے“

”میں تمہارے لئے زندہ رہوں گا“ عشرت کی آنکھیاں رضیہ کی آنکھوں سے کھیلنے لگیں۔

”رضیہ! کیا تمہیں میری ڈوائیو کی سیر یاد ہے؟“

رضیہ کی آنکھیں یہ ایک سترت سے چمک اٹھیں۔

”جے کبھی یاد نہیں آئی“ عشرت نے کہا ”اتنے سالوں میں۔ راج کے ہاں، شمشاد کے ہاں،

دلایت چمک کے ہاں، قرہ کے ہاں، دادا کے ہاں۔ کبھی مجھے وہ رات یاد نہیں آئی۔ تم سے جھوٹ

نہیں بولوں گا۔ ہاں تمہارا چہرہ کئی بار سامنے آیا جیسے مجھ سے شکایت کر رہا ہو اور ہر بار میں نے

تمہارے چہرے کو اپنے ذہن سے مٹا دیا۔ آدمی شکایت کرنے والے چہرے بھول جاتا چاہتا

ہے میں بھی ایسا ہی کرنا تھا، میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ لیکن جرنل وارڈن میں بائیس نمبر کے
بستر پر موت اور زندگی کے درمیان۔ وہ خوبصورت یا کئی بار میرے ذہن میں چمک اٹھی اور مجھے ب
کچھ یاد آیا کہ کولمبے میں سوزین لیڈر شوز کی دوکان پر جاتا۔

”وہ سبز جوتا ابھی تک میرے پاس ہے اس تہی کے بعد میں نے اسے کبھی نہیں پہنا۔“
عشرت نے کہا۔ ”انڈیا گیٹ سے ہم چو پائی گئے تھے وہاں ہم نے کھٹی میٹی پاٹ کھائی تھی پھر
انڈیا گیٹ سے ہم برٹی گئے تھے، جہاں ہم نے پھلوں والے سینڈ پر...“
رضیہ نے اس کی بات ٹوک کر کہا۔ ”بھولتے ہو جو چو پائی سے ہم برٹی نہیں گئے تھے برٹی جانے سے
پہلے ہم سالبرگ گئے تھے جہاں ہم نے آئس کریم کھائی تھی۔“

”پھر وہ ٹیکسی میں بیٹھا اور بارش کا برسنا اور ہولے ہولے ٹیکسی کا میری ڈرائیور کی طرف چلے جاتا تم
میرے پہلو میں بیٹھی تھیں۔“

”اور وہ، حند؟“ رضیہ نے آہستہ سے کہا، اور اس نوزائی یاد سے اس کا چہرہ متحرک ہو گیا۔ ”ہائے
وہ حند کبھی نہیں بھولتی۔ حند میں تمہارا وہ چہرہ، تمہاری وہ باتیں۔ تمہارا وہ ————
”بوسہ؟“ رضیہ نے شرم سے عورت کا ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیا۔
عشرت کے پیار چہرے پر شرم کی لہر دوڑ گئی۔

”وہ رات اس کے بعد کئی بار میرے بستر پر آئی، بائیس نمبر کے بستر پر زندگی اور موت کے درمیان
فلکے ہوئے کئی بار وہ رات میری زندگی کے مقدس لمحے کی طرح آئی۔ رضیہ تم سے بچ کہتا ہوں جب
میں نے اپنی پوری زندگی کا جائزہ لیا تو صرف ایک وہی رات معلوم ہوئی۔ جیسے میں اسی من و عن
اس طرح رکنا چاہوں گا۔ اس کا ایک لمحہ تبدیلی نہیں کروں گا۔ لیکن باقی ساری زندگی ————
اگر یہ میرے من میں ہو، اگر مجھے دوبارہ زندگی بسر کرنے کی اجازت ملے، شروع سے آخر تک ترقیاتی

سب بدل ڈالوں گا۔ صرت وہی ایک رات باقی رہنے دوں گا۔

رفیہ کا دل خوشی کے مارے زور زور سے دھڑکنے لگا۔

عشرت کچھ دیر چپ رہا پھر بولا ”مگر وقت کے دھارے کے بہاؤ میں تم واپس نہیں جا سکتے اپنی زندگی کو بدل نہیں سکتے۔ کچھ نہیں کچھ نہیں ایک لمحے تک کو بلا نہیں جا سکتا“ عشرت کے لہجے میں اک پر غلوس پھٹا ادا تھا۔

”ماضی نہیں مگر مستقبل تو یہ لا جا سکتا ہے“ رفیہ نے کہا۔

”اب اگر میں زندہ رہا۔ اور اب میں شب دروڑ اپنی زندگی کے لئے لڑتا ہوں، تو میں نے فیصلہ کیا ہے۔“

ان غلطیوں کے لئے، غفلتوں کے لئے نہیں غلطیوں کے بلکہ اس صداقت کے لئے کب سے رفیہ کا دل تڑپ رہا تھا اس کے کان بھوکے تھے ترے ہوئے اس آواز کے لئے وہ کب سے غلامی ڈھونڈ رہے تھے اس نئی آواز کے بلاوے کو جو اس وقت رفیہ کے کانوں میں گونج رہی تھی

عشرت چپ ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد بولا ”تم نے میری ماں دیکھی ہے؟“

رفیہ نے سر ہلایا۔

”اس کے بال سفید ہیں اس کا قد چھوٹا ہے اور اس کا رنگ گورا ہے۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اس کے کانوں پر خیریاں مگر جب وہ ہنستی ہے رفیہ تو اس کی عمر کے دس پندرہ سال کم ہو جاتے ہیں وہ آج بھی ایک بچے کی طرح ہنستی ہے، بہت کم ہنستی ہے کیوں کہ اس کا خاوند مر چکا ہے اللہ اس کے بیٹے نے اُسے بہت دکھ دئے ہیں مگر پھر بھی ان دکھوں کے درمیان جب وہ ہنستی ہے

تو اس کا چہرہ صبح کے تارے کی طرح جگمگنے لگا ہے۔ ان دنوں میں اپنی ماں بچے بہت یاد آتی رہ
ہاتھوں پر مہندی ایسی عمدہ سما جاتی ہے کہ خطے بھر کی جوان لڑکیاں میری ماں سے اپنے ہاتھوں پر مہندی
کے نقش و نگار تمہارے لئے آتی ہیں۔ بایں خبر کے ہنگ پر بیٹھے بیٹھے بھی ماں نے اپنی ماں
کو تمہارے اور ہندی سے جلاتے ہوئے دیکھا ہے :

”رضیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔“

عشرت نے کہا ”کئی بار تخیل میں میں نے دیکھا ہے۔ اپنے آپ کو سہرا لگائے اپنے گھر کے باہر کھڑے
سائیں سے کہتے ہوئے گھوڑا لاؤ۔ پھر نہایت میں جھولنا وہ نوشاہ کا گھوڑا میرے سامنے آیا۔
میں اس پر سوار ہوا اور جانے کن پڑیچا علیوں میں ہوتا ہوا میں تمہاری ڈولی کے آگے آگے اپنے
گھوڑے پر سوار نہیں اپنے گھر لے آیا۔ کون گیت گارہا تھا یہ تو میں نے نہیں دیکھا میں نے تو
مرث گھوڑے سے اُتر کر تمہاری ڈولی کا پردہ کھسکا دیا۔ اور میری ماں ہمیں بڑے پیار اور محبت
سے سہارا دے کر.....“

”ہیں! ہیں!“ رضیہ سبک سبک کر رونے لگی ”ابن تصویروں کو ہاتھ مت لگاؤ عشرت
ایک محرت انہیں تصویروں کو دیکھ دیکھ کر کسی کی سفارقت میں اپنی ساری زندگی بسر کر دیتی ہے“

عشرت کے چہرے پر اک خفیت سی مسکراہٹ آئی وہ شگ کر اپنے بچے پر جاگا اس کی آنکھیں
بند ہو گئیں۔ رضیہ نے اس کی بغض دیکھی۔ اسے گرم گرم دودھ پلایا۔ عشرت کے چہرے پر وہ اسی
سُرخی دہیں آگئی۔

”عشرت تم زیادہ باتیں نہ کرو“ عشرت نے خوشی اور محبت سے رضیہ کی جانب دیکھتے ہوئے بہت آہستہ
سے کہا: ”اچھا۔“

”اچھا“ زم زم شیریں لفظ اچھا چاروں طرف محبت کا مرقم مرقم نور بکھیرتا ہوا لفظ اچھا گہری
 سانس لیتا ہوا پرسکون لفظ جو رخصت کے رخساروں کو اکس بوسے کی طرح چھو گیا۔
 رخصت اپنا پر لے کر کھڑی ہو گئی۔ بولی ”یہ اب کل آؤں گی!“

دوسرے دن سیٹر باخو یا کا دیوالہ نکل گیا۔ کوریہ کی جنگ بند ہو گئی تھی بچی اور شاگ
 اکہنچ کے بھاؤ دھڑے بچے کر گئے تھے۔ باخو یا کا خیال تھا کہ جنگ جاری رہے گی۔ اس کا خیال تھا
 کہ امر کی بھی مرغا نہیں کریں گے۔ جنگ ہوتی رہے گی حالانکہ کئی دنوں سے طرح طرح کی خبریں آرہی
 تھیں۔ مگر باخو یا کو مرغا پر بھروسہ نہیں تھا۔ اس کا پور یقین تھا کہ جنگ جاری رہے گی، یہی سوچ کر
 اس نے شاگ اکہنچ پر بڑے بڑے دانے کھلے تھے وہ اور سیڈم ہمیشہ بڑے بڑے
 دانے کھلنے کے عادی تھے اسی لئے انہوں نے لاکھوں کمائے تھے۔ اسی لئے آج ان کا دیوالہ
 بھی نکل رہا تھا۔

دلورین روڈ پر اور ادمر ادمر کے شوڈیوز میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی سیٹر باخو یا
 نے دیوالہ نکل دیا تھے میں سیٹر کو اتنی لاکھ کا ہرمانہ دیا پڑا اور اس میں کوئی مبالغہ نہ تھا
 سیٹر باخو یا ایک رات میں اسی لاکھ روپے ہار گیا تھا۔ اپنی کل پونجی۔ ایک گھنٹی کوڑی اس کے پاس
 نہ رہی تھی۔ اس کا کل بینک بیلنس۔ اس کے شوڈیوز کارخانوں میں چھتے، بندہ گیس ایک رات میں
 ہلک تبدیل کر چکی تھیں۔ اب سیٹر کے پاس بس وہی روپیہ ہو گا جو اس نے گھر میں رکھا ہو گا یا میٹم

کے زیور اور ایک گاڑی جو خوش قسمتی سے اس کے بھتیجے کے نام تھی۔

یہ خبر سننے ہی جوق و جوق لوگ۔ انڈسٹری کے ہر شعبہ کے لوگ سینٹر بائوڈیا کے دفتر میں اخبار افسوس کے لئے پہنچنے لگے۔ کیونکہ سینٹر بائوڈیا کچھ بھی کہنے فلم انڈسٹری کا ایک نامور مشہور آدمی تھا۔ اب تک درجنوں تصویریں بنا چکا تھا۔ سینکڑوں آدمیوں سے اس کے تعلقات تھے بہت سے اداکاروں نے اس کی آنے والی دو ایک فلموں میں مفت کام کرنے کی پیش کش کی۔ اس کے سٹوڈیو کے مزدوروں نے اگلے تین ماہ کے لئے تزاہ لینے کی آفر دی۔ ہر شخص اپنے اپنے طریقے سے اخبار افسوس کو رہتا کچھ بھی کہہ رہی تھی۔

مکرم بھی یہ سنتے ہی سینٹر بائوڈیا کے ہاں پہنچا۔ وہاں میڈم اپنے کمرے میں بدستور تاش کی بازی کھیل رہی تھی۔ وہی رمی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ صرف میڈم اپنے سینے کے اوپر کا فوک بار بار اس طرح جھٹکتی تھی جیسے وہ خواتین کئی آڑا رہی ہو مگر یہ تو میڈم کی پرانی عادت تھی میڈم کے پاس آگرے کی ایک مشہور طوائف شہی خن جو فلموں میں اپنی قسمت اڑانے آئی تھی۔

میڈم نے مکرم کے اخبار افسوس کا کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے وہی کھیلتی رہی۔ اس نے گھر ہی دیکھ کر بچن دت سے کہا۔

”ایک منٹ سے اوپر ہو گیا تم چال نہیں چلے“

میڈم کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی کیونکہ میڈم وقت کی جیسی پابند تھی۔ وہی کہتے وقت اگر کوئی چال میں دوچل رہا تھا۔ یا سیٹ پر آنے میں دیر کرتا۔ یا کسی کام میں دیر کرتا تو اسے سخت کوفت ہوتی تھی وہ وقت منٹ نہیں سینکڑوں کے حساب کی تھی سے پابند تھی بچن دت موسیقار نے مسکرا کر کہا ”میڈم میرا دل کہیں اور چلا گیا تھا“

”دل؟“ میڈم نے غصا ہو کر کہا ”دل کاری سے کیا کام؟“

”تم بھوتے بوجھن دت“ اکرم نے کہا ”میڈم کسی کے دل کی بات نہیں سمجھتی دوسری دقت کی سوسائیاں دیکھتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں۔ میڈم کے پاس کوئی دل نہیں ہے۔ وہاں اندر بھی ایک گھڑی ہے جس کی ٹک ٹک کو وہ غلطی سے اپنے دل کی دھڑکن سمجھتی ہیں“

میڈم نے چلا کے کہا ”تم خواہ خواہ اپنا فلسفہ بگھاڑ رہے ہو، دیکھتے نہیں میں کیل رہی ہوں“

”میڈم“ اکرم نے پوچھا ”کیا آج بھی آپ کو اس کیل کا پتہ نہیں چلا۔ جو آپ برسوں سے کیل رہی ہیں۔ یہ کیل ہے کہ بزنس ہے۔ جو آپ کو قبہ خانہ بے گناہ ہے۔ بددرو کا مٹرا ہوا پانی ہے؟ کتنے ہی بنگلوں کی چیک کریں۔ کتنی ہی عیصتوں کی ڈوریاں۔ کتنی ہی غلامی کی ریتیاں۔ دھلگے بھیریں۔ ان تماشوں کے تہوں سے بندھی ہیں۔“

”جکے جاؤ“ میڈم نے کہا ”ماتروں میں تمہاری بچہ ساتویں پہنچے میں کیا واصل ہوئی کہ تم اکرم سے دنیا کے سب سے بڑے دانش ور بن گئے۔ یہ تو تم آج اخبار افسوس کرنے آئے ہو کہ بچہ مہاژن آئے ہو۔ تمہیں مشرم نہیں آتی آج میں دلیرا لہ ہوئی ہوں اور تم اس طرح“

”تم اگر دلیرا لہ ہو تو میں میڈم، تو مجھے اس قدر افسوس نہ سوتا“ اکرم نے کہا ”افسوس تو یہ ہے میڈم کہ تمہارے ساتھ آج کتنے ہی اسٹوڈینٹ کے ملازم، کتنے ہی تصویروں میں کلام کرنے والے اداکار دلیرا لہ ہوئے ہیں۔ جب تم شاگ اپنی پیٹھ پر دھاؤ لگاتے ہو تو کیا تم کبھی یہ سوچتے ہو اس ایک داؤ میں تم کتنے سو لاکھ کتنے ہزار انسانوں، زندہ گیوں کو داؤ پر لگا دیتے ہو۔ یوں ایک چکی میں“

میڈم نے کہا ”تمہاری ان باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ مگر اندر حاؤ سیٹھا محو طے بات کرو۔ وہ بے چارہ آج باطل ہو کھلوا رہا ہے۔ میرا قابلِ قدر شوہر۔ وہ آج تمہاری ہر بات سننے کے لئے تیار ہے“

اکرم نے کہا " میں تو اس وقت بھی ری کا کھیل دیکھوں گا۔ مجھے اس میں بٹاؤ نہ کرنا ہے "۔
چند منٹ تک خاموشی رہی۔ پھر بچہ ایک میڈم گہرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی " آج اس تاش میں کوئی
خرا نہیں رہا "۔

اکرم مسکرا کر میڈم کے پاس گیا اور اس کے نازک کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا " تو آؤ میڈم اس
پرانی گھسی پٹی تاش کو بچھاؤ ڈالیں۔ اتنے دھاگوں، رستیوں، زنجیروں، ٹوڈیلوں سے بھنی ہوئی بادل
پتروں والی تاش کو بچھاؤ ڈالیں۔ اور بادل ہزار۔ بادل لاکھ، بادل کروڑ کی بہت بڑی تاش سے زندگی
کا ایک نیا کھیل کھیلیں۔ جس میں کوئی دھاگا نہ ہو، کوئی ڈوری نہ ہو، کوئی زنجیر نہ ہو۔
نچے جاؤ " میڈم بڑی حقارت سے اکرم کی طرف دیکھتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

سیٹھ بانکھڑیا داسی بہت بوکھلائے ہوئے پریشان حال اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے
تھے۔ اکرم کی باتیں سن کر ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ تم آج میرے ڈائریکٹر ہو جس نے میرے
ایک پچر منت بننے کی آفر دی ہے۔ آج صبح سے میرے ہاں لوگوں کا تانا بکھا ہوا ہے۔ اکرم ایک
عجیب و غریب بات مجھے مسلم ہوئی۔ جس سے ٹیلیفون پر ٹیلیفون کر رہے ہیں۔ بڑے بڑے سیٹھوں
کے میرے لکھتی دوستوں کے افسوس بھری دلی کے ٹیلیفون گمراہ شخص بھی ان لکھتوں میں سے میرے
پاس آتے نہیں آیا۔ جنہیں میں نے ضرورت کے وقت پانچ پانچ لاکھ روپے قرض دئے ہیں، اور اگر
آ رہے ہیں تو تمہارے ایسے لوگ تم سے بھی غریب لوگ میرے سٹوڈیو کے مزدور، ملازم، لوکر پیشہ
بد حال غریب لوگ ان کے پاس تو خود ایک پیسہ نہیں ہے لیکن وہ کس بچے دل سے میرے ساتھ
بھردی کر رہے ہیں۔

حالانکہ ————— حالانکہ ————— ان تمام لوگوں پر مصیبت لائے والوں میں ہی وہ اکیلا آدمی ہیں۔ لیکن یہ لوگ بھی اپنی مصیبت کی بات نہیں کرتے۔ مرنے میری مصیبت کی بات کرتے ہیں۔
اکرم چپ رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد سیٹھ نے کہا۔

”میرا خیال ہے! اکرم! کسی کے پاس زیادہ روپیہ نہیں ہونا چاہئے اتنا زیادہ روپیہ پریشانی ہونا چاہئے کہ اس کا دماغ خراب ہو جائے۔“

اکرم نے مسکرا کر کہا۔ ”سیٹھ یہ تم قو آج سوچتے ہو۔ لیکن اگر کسی کو تباہی سے پاس پھر کہیں سے ہانچے ہیں تاکہ روپیہ آیا جائے تو تم پر۔“

”ہاں۔“ سیٹھ ہانچو دینے اپنی افسردگی کے بارے میں نہیں کر کہا۔ ”تم بااصل ٹھیک کہتے ہو۔“ میں بھر دی۔ ”ہاں تم بااصل ٹھیک کہتے ہو۔“ سیٹھ زور زور سے ہنسے گا۔ بات اس کی گہری گئی تھی

ایک رات رضیہ کو مشرت کے پاس رہنا پڑا۔ کیوں کہ اچانک ہی مشرت کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ شام کے وقت جب رضیہ اس کے ہاں پہنچی تھی تو وہ غاصہ ہشاش بشاش نظر آتا ہے۔ آج رضیہ بھی بہت خوش تھی کیونکہ اکرم کی تصویر یہ کہان ”مارو میں آٹھویں چھتریں جاری تھی۔ کلاخانوں کے مزدور۔ ایسے لوگ جو ہمارے شہر کے سینکڑوں مکاؤں میں اپنے چھوٹے چھوٹے گھر اور کھیتیاں چھوڑ کر

آئے تھے یا زینداہن کے غلم کی وجہ سے وہاں سے بے دخل ہو کر چلنے لگے تھے اور شہر بکری میں
 اگر نئے نئے مزدور رہتے تھے۔ ان لوگوں کے لئے کسان اور اس کی زمین کا سلا ایک گہری دل چسپی کا
 باعث تھا، جو حق و سیکڑوں کی تعداد میں یہ لوگ ہر مزدور ماتو سینا میں دس آنے فرج کر کے
 مکان - پکڑ دیکھ رہے تھے اور جان دلاؤ کہتا تھا کہ ماتو میں تاشائیوں کا یہ طبقہ کبھی سینا دیکھنے
 نہیں آیا تھا۔ خود اس کے لئے یہ تصویر ایک نیا تجربہ تھی۔ اتنے سالوں میں ہلی وڈ کی صرف ایک
 پکڑ کے سوا ماتو میں کوئی اور تصویر آنٹھوں پہننے میں نہیں پہنچتی تھی اور جان دلاؤ کا خیال تھا کہ ابھی
 تین چار پہننے یہ تصویر اس طرح زندہ پکڑ کے چلے گی۔ اور گو اکرم اور ستیہ رائے اور دوسرے لوگ
 پکڑ کی کامیابی سے بہت خوش تھے مگر بیٹھ کر چندے جھگڑا ہونے کی وجہ سے وہ کوئی نئی تصویر
 شروع نہیں کر سکتے تھے۔ بیٹھ سے ان کی بدستور ملائی تھی۔ اترو کی بیٹی کے اخراجات بہت
 تھے۔ اور ان اخراجات کو ادا کرنے کے بعد جو تھوڑا سا فائدہ ہوتا تھا وہ بیٹھ کر چند کی جیب میں
 جا رہا تھا۔ ان لوگوں کے پاس ایک پائی نہ پہنچتی تھی جس سے وہ کوئی دوسری پکڑ شروع کر سکتے نہ
 ابھی کسی دوسرے فائبر سے کوئی پیش کش آئی تھی۔ اس لئے ذہنی اعتبار سے نہ بھی مانی اعتبار سے
 یہ لوگ بہت پریشان تھے۔

انہیں دفوں سویت اکسپورٹ فلم بکری کے غلم تھے کسان، فلم دیکھی اور بہت پسند کی
 اس نے ماسکو کو نکھا کہ اس فلم کی نمائش اگر سویت یونین میں ہو تو بہت اچھا رہے گا۔ فلم ماسکو
 بھیجی گئی۔ نہ ہاں ماہرین فن نے دیکھی پسند کی اور سویت یونین میں نمائش کے لئے خرید لی گئی۔ اکرم
 اور ستیہ رائے بہت خوش ہوئے اب وہ نئی تصویر شروع کر سکتے تھے۔

غیر نے عشرت کو بتایا کہ اکرم کہ رہا تھا جب چاروں طرف اندھیرا تھا اور کسی کوئی روشنی نہ
 تھی۔ پکڑ کا سیاب تھی مگر سب مدہر بیٹھ کی تجویز میں جا رہا تھا اور وہ جنہوں نے اپنے دل و دماغ

جسم کی ساری محنت سے اس بچہ کو کامیاب کیا تھا۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھوے بیٹھے تھے۔ اور کوئی تھوکی
 خضوع نہ کر سکتے تھے۔ اس وقت ہاتھ اٹائے۔ یہی میں کام کرنے والوں کے ہاتھ اور باہر کے لوگوں کے
 ہاتھ۔ ایک مضبوط مصافحہ کی طرح ہمارے ہاتھوں سے مل گئے اور ہم نے محسوس کیا کہ ہم اکیلے نہیں ہیں
 مگر لاکھوں کروڑوں لوگ ہمارے ساتھ ہیں۔ ہم ان کے ساتھ ہیں۔ وہ لوگ جو ہماری ہی طرح ہیں وہ
 ہماری ہی طرح محسوس کرتے ہیں۔ سوچتے ہیں، کام کرتے ہیں۔ محنت کرتے ہیں، روتے ہیں، ہنستے
 ہیں اور صلح اور امن کی باتیں کرتے ہیں۔

اور اگر مگر کہہ رہا تھا ”مجھے آج محسوس ہوا ہے جیسے میری والدہ نہیں دس لاکھ دس کروڑ باتیں ہیں“
 آج روفیہ کی آنکھوں میں مسرت کی گہری چمک تھی وہ عشرت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی ”یہ
 دو تین پانچ شکل کے ہیں پھر ہماری نئی تصویر شروع ہو جائے گی اور میں نے گرم سے وعدہ لے لیا
 ہے جب تم اچھے ہو جاؤ گے تب میں دو اس بچہ میں ضرور کام دیں گے۔ بیرو کا نہیں مگر کوئی اچھا
 رول جسے تم بخوبی جانتا ہو۔“

”اچھا ہو کے اب میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی معمولی سا کام، مگر اپنے ہاتھوں کی محنت کا کام۔
 جس سے میرے ہاتھ سے پسینہ چمکے میرے ہاتھوں میں قوت آئے۔ میرے سینے میں سانس
 مضبوطی سے چلنے لگے۔ میں اب ایسا کام کرنا چاہتا ہوں۔ اور اچھا ہو کے اب میں بھی کروں گا۔“
 عشرت چُپ ہو گیا۔ روفیہ خوشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔
 عشرت نے کہا ”کیا تم نے مجھے سمجھا کر دیا ہے؟“

روفیہ نے اپنے رخسار عشرت کے گالوں سے لگا دئے ”کیسی باتیں کرتے ہو میں عورت ہوں مجھے
 معلوم تھا۔ ایک دن تم میرے پاس آؤ گے۔ میری محنت اتنی مضبوط تھی!“
 یہ ایک عشرت کا چہرہ باہل نمودار کیا۔ اس نے آہستہ سے اپنی آنکھیں بند کر لیں وہ نیچے پر لٹکے

گہرے سانس لینے لگا۔

”کیا ہوا۔“

”پتہ نہیں بہت ہی سخت درد ہو رہا ہے۔“

رضیہ بلدی ہے نس کو بلا لائی۔ نس بھاگی بھائی ڈاکٹر کے پاس گئی۔ اب عشرت کا درد بڑھتا جا رہا تھا اس کے ہاتھ پاؤں ٹینو رہے تھے۔ اس کا چہرہ نیلا پڑتا جا رہا تھا۔

ڈاکٹر نے غور سے دیکھنے کے بعد کہا ”پیش کے اندر مہرچ ہو رہا ہے اللہ اندر کا زخم کھل گیا ہے۔“

”زخم؟“ رضیہ چونکی۔

”گروے کا آپریشن جو ہوا تھا۔ وہ زخم شاید کھل گیا ہے اندر سے۔“

”پھر؟“

ڈاکٹر نے اپنے شلے ہلائے اور خاموش بہت درنگ وہ عشرت کے پاس بیٹھا رہا۔ دوا دی گئی انجکشن لگائے گئے۔ سب تزکیوں کی گئیں۔ مگر عشرت کی حالت بگڑتی گئی۔ رات کے تین بجے ڈاکٹر رضیہ کو کچرے کے باہر لے گیا۔ اور اس سے کہنے لگا ”اب کوئی اُمید نہیں رہی“

رضیہ خاموش تھی۔

ڈاکٹر نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا ”اب یہ چند گھنٹوں کا نہاں ہے۔ یہیں اس سے اگر کوئی خاص بات کہنی ہو تو کرو۔ اس کے مگر دانوں کو بلانا ہو تو بلا لو۔ میں اپنی گاڑی دیتا ہوں۔ اب خاتمہ قریب ہے۔ رضیہ بالکل خاموش رہی، ڈاکٹر نے گھڑی دیکھ کر کہا ”مجھے ایک دوسرے مریض کو دیکھنے

جانا ہوگا۔ دوسرے ڈاکٹر کو اوسر بھیجتا ہوں۔ ہم لوگ تو آخری وقت تک لڑیں گے۔ مگر...“

ڈاکٹر نے اپنے شلے ہلائے اور سر جھکائے وارڈ سے باہر چلا گیا۔

”ٹاکٹر کیا کہتا تھا “ عشرت نے پوچھا۔

”وہ کہتا تھا تم زندہ رہو گے۔“ رضیہ نے کہا۔

”میں جانتا ہوں اس نے کیا کہا تھا۔ میں مر رہا ہوں“

”نہیں عشرت!“

”ہاں! میں جانتا ہوں۔ میرے جسم کی ہر ہڈی اور ہر عضو داغ اور اعصاب کا ہر ذرہ اس وقت جانتا ہے۔ رضیہ میرے قریب آ جاؤ۔ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔ اپنے رخسار میرے رخساروں سے لگا دو۔ ہاں اس طرح۔ رضیہ میری بیوی!“

رضیہ کے ہونٹ کانپے۔ اس نے زور سے ہونٹ اپنے دانتوں تلے دبائے اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ اس نے زور لگا کر بڑی خصل سے ان آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں دھکا دیا۔ مگر آنسو نہیں رکے چلا کہ اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ اس کے رخساروں سے ہوتے ہوئے عشرت کے رخساروں پر بہنے لگے جیسا پہلے ہی سے عشرت کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

”دوؤ۔ دوؤ۔ رضیہ! آنسوؤں کو اپنے دھتھلے آنسوؤں کو میرے آنسوؤں کو ایک قدم سے پھل جانے دو! آنسوؤں کا سنگم ہے۔ میری روح اس میں بنا کر پاک و صاف ہو رہی ہے۔ آج ساری غلطیاں ساری کوتاہیاں اور ساری برائیاں چٹ گئی ہیں اور میری روح دلی و صوفیٰ تمہاری محبت کے نور کا لباس پہنے جگمگ رہی ہے۔ دیکھو رضیہ آج میں پھر جان ہوں۔ پہلے کی طرح پھر

میرا دمیں تمہارا میرا!

آج میں ایک ہیرو کی موت مروں گا۔ تباہی باہنوں میں ایک ہیرو کی طرح آؤد زور سے چلتا ہوا۔ پھر
یہ ایک اس کے بازو ڈھیلے پڑ گئے اور وہ بے ہوش ہو کر بستر پر گر گیا۔

اس کے بعد وہ ہوش میں نہیں آیا۔ لمحہ بہ لمحہ۔ سیکنڈ منٹ۔ گھنٹے گزر گئے۔ دیوار پر لگی
ہوئی گھڑی ٹپک ٹپک کرتی رہی ٹپک ٹپک میں جاتی ہوں۔ ٹپک ٹپک میں جاتی ہوں۔ ٹپک ٹپک میں جاتی
ہوں۔ . . . ٹپک ٹپک میں جاتی ہوں۔

”عشرت“

”ٹپک ٹپک میں جاتی ہوں“

لیکن عشرت نے رضیہ کی آواز نہیں سنی۔ اس کا بے ہوش مشنا ہوا چہرہ اب باہل نیلا چڑ گیا تھا۔
آنکھیں بند تھیں۔ اور سینے میں الٹی سیدی سانسون کا شور عالم سکرات کا پتہ دیتا تھا۔ سیکنڈوں منٹ
سیکنڈوں صدیوں کی طرح گزر گئے۔ صبح کے پانچ بجے کے قریب عشرت نے آنکھیں کھولیں، اور
اس نے کہا: ”ماں ڈولی آگئی“

اس کے بعد اس نے آنکھ بند کر لی۔ اس کے گلے کا منکا ڈھلک گیا۔ اور اس کا ہاتھ رضیہ کے ہاتھ
میں سرور ہو گیا۔

”عشرت“ رضیہ زور سے چلائی۔

”ٹپک ٹپک میں جاتی ہوں“

رضیہ بھی ڈھلک کے زس کی باہنوں میں جا گری۔ زس نے ایک بچی کی طرح اُسے گلے سے لگایا۔ اور اسے
ڈھارس دینے لگی۔ مگر رضیہ اس طرح بلک بلک کے رو رہی تھی، جیسے ایک انسان نہیں ایک زخم
رو رہا ہو۔

کہتے ہیں مرنے والے کے ساتھ اس کی ساری مصیبتیں اور دکھ ختم ہو جاتے ہیں۔ جب وہ
مرتا ہے تو اپنی ساری زندگی اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور پھر اس دنیا میں اس کا کچھ نہیں رہتا اس
کی یاد رہتی ہے ابھی یا بُری۔

اور ہونا بھی ایسا ہی چاہئے۔ مگر ہم لوگ بڑے عجیب وقت میں ایک عجیب زمانے میں ایک عجیب نظام
زندگی میں رہتے ہیں یہاں مرکز کی غلامی نہیں ہوتی اور مصیبت کم نہیں ہوتی۔ جو بے عزتی
زندگی میں حاصل ہوتی ہے وہ مرنے کے بعد دو چند ہو جاتی ہے۔ ایک حد ہے جس کے آگے کوئی
نہیں جاتا۔ جہاں مرنے والے کے سارے گناہ بخش دئے جاتے ہیں۔

مگر جس دنیا میں ہم رہتے ہیں وہاں مردوں کو بھی معاف نہیں کیا جاتا۔ یہاں کوئی حد نہیں ہے کوئی
معافی نہیں ہے۔

رضیہ جوں ہی وارڈ سے باہر نکلی۔ سر جھکائے ہوئے آنسوؤں نہتی ہوئی۔ زم نے اس کے ہاتھ میں ایک
پل دیا، رضیہ نے جھللاتے ہوئے آنسوؤں میں اسے پڑھا۔

۲۴۲ — — — — — کرے کارایہ

۳۲۱ — — — — — انجکشن دلائیاں

۴۰ — — — — — خاص غذا اور کمی

۴۶۳ — — — — —

۲۰ — — — — — جو رستم اب تک دی جا چکی ہے

۴۶۳ — — — — — بقایہ

زیر نے کہا ”جیسے تم سے بڑی بھورہ دی ہے۔ ہم نے پوری کوشش کی۔ مگر اُسے دیکھا سکے۔ موت ناگزیر ہے۔ تم ایسا کرنا کہ یہ بل عشرت کی لاش کو لے جانے سے پہلے ادا کر دینا۔ ہسپتال کا قاعدہ ہے۔“

رضیہ نے کہا ”بہت اچھا“ مگر اس کی بھور میں مذا یا کہ وہ چار سو تریسٹھ روپے اکٹھا آنے کا بل آج ہی ان اگلے چار گھنٹوں میں کہاں سے ادا کر سکے گی۔ اکرم کے پاس پیسے نہیں تھے سیدنا کے پاس پیسے نہیں تھے اور اب تو رضیہ کے پاس بھی پیسے نہیں تھے۔

پھر وہ کہاں سے یہ چار سو تریسٹھ روپے اکٹھا آنے کا بل ادا کرے گی۔

یہ ایک اسے راج کا خیال آیا جس لڑکی نے عشرت کو تباہ کیا تھا جس لڑکی نے عشرت کے بیٹے سے لگ کر اس کی جوانی کا سارا رس چوس لیا تھا۔ یقیناً وہ عشرت کے کفن کے پیسے تو دے دے گی۔

اگر رضیہ کے پاس پیسے ہوتے تو وہ مر جاتی مگر کبھی راج کے پاس نہ جاتی مگر اس وقت کوئی چارہ نہ تھا وہ اپنے محبوب کی لاش ہسپتال میں مٹا نہیں سکتی تھی۔

باندہ پہنچ کر وہ دیر تک راج کے بنگلے کے باہر گل ہر کے درخت کے نیچے کھڑی رہے فیصلہ کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ وہ اندر جانے نہ دے۔ اس کا دل اندر جانے کو نہ چاہتا تھا۔ وہ ایک قدم اٹھاتی مگر پھر اس کا احساس اسے روک لیتا۔ پورے میں راج کی بادامی رنگ کی کپڑی لگ سورج کی شعاعوں میں چمک رہی تھی، اس کا خاندان شکر کاٹھی کے اندر خاموش بیٹھا تھا پتھر کی صورت۔ شاید راج کہیں باہر جانے والی تھی۔ یہ ایک رضیہ نے سوچا۔ وہ بڑھ کر اندر چلی ہی جائے اور راج سے بات کرے۔ کہیں راج باہر چلی گئی تو اسے ایسا موقع نہیں ملے گا۔

اس نے بلاؤں سے دوہل نکالا۔ چار سو تریسٹھ روپے اٹھانے والا۔ اور جرأت کر کے کینڈی لک کے کنگے گھوم کے اندر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ جین اس وقت راج اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ بھی بھائی۔ ایک عمدہ بناری ساڑھی میں لمبوس، خوب صورت، دل کش، دل ربا، اس کے ہوشوں پر ایک تابناک تبسم تھا اور اس کی نینل میں ایک نوجوان چل رہا تھا۔ رخصتے دیکھ کر حیرت کی چیز لڑ کر ٹھٹھک کر رہ گئی۔

”بائیں، عشرت تھا، زندہ؟“

دوسرے لمحے میں جب وہ نوجوان قریب آیا تو رخصی نے محسوس کیا کہ یہ عشرت نہ تھا، یہ تو کوئی اور تھا۔ مگر جلدی کیوں اس نوجوان کا چہرہ بہرہ کسی ان جلدی طریقے سے عشرت کی یاد دلانا تھا جیسے اس نوجوان اور عشرت میں کوئی مماثلت ہو۔ دوسرے لمحے یہ اچانک رخصی کی سمجھ میں آ گیا۔ ہاں اس نوجوان کا چہرہ بھی اٹن لائڈ سے ملتا تھا۔

راج نے رخصی کو اس نوجوان کی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر اس کا تباہ کن کولتے ہوئے کہتا یہ بری سبیلی رخصی۔ آپ ہی عشرت؟“

عشرت؟ رخصی چوہکی۔

راج نے ہنس کر کہا۔ تہ تریس گنج والا عشرت نہیں۔ ان کا نام بھی اتفاق سے عشرت ہے۔ دی فراخ سینہ، مسکراتے ہوئے ہونٹ۔ دی بروگ کے جوئے، دی دونوں راتلی لان

کی بیش خیرت۔۔۔۔۔ دی نام۔۔۔۔۔ دی لباس رخصی کا بھی چادر بڑھ کر اس عشرت کو اپنی باڈی میں جکڑے، اس سے چلا چلا کے کچھ نہ جاوے عشرت پرے بھجے عشرت۔ اس زندہ موت کے ساتھ کہیں نہ جاوے راج نے مسکو کے پریشان حالی رخصی سے پوچھا کہوں۔ کچھ کام ہے کچھ چاہئے؟
 رخصی نے ہلکی سی کہا: ہاں مجھے تمہارے کام تھا۔ میں تم سے کچھ ملنے آئی تھی۔

ایک کفن !

عشرت کے لئے ایک کفن

مگر اب میں سوچتی ہوں تم سے کس کے لئے کفن مانگوں؟

اس عشرت کے لئے جو ہسپتال میں مرنے پڑا ہے؟

یا اس عشرت کے لئے جو تنہائی باہنوں میں زندہ ہے؟

رفیقہ نے ایک لمحے کے لئے نظر بھر کے راج کی طرف دیکھا اور پھر چپ چاپ خاموشی سے اسکاں میں

سر لادیا بغیر شعوری طور پر اس نے وہ بات چہچہائی کر لیا جس میں ہنسی بھرا رکھا تھا۔

پھر نہ پلٹ کر اپنے آسروں کو روکتی ہوئی تیز تر قدموں سے دوڑتی ہوئی بچلے کے باہر چلی گئی۔

فہرست کتب

90 00	دیوان سنگھ مہزون	ناقابل فراموش
80.00	جوش ملیح آبادی	یادوں کی بارات
27 00	سعادت حسن منٹو	منٹو کے ڈرامے
18'00	،،	منٹو کے افسانے اور ڈرامے
15 00	،،	چمنازے
15 00	،،	چغند
18 00	،،	پھندلے
12.00	،،	دھواں
12 00	،،	برقمے
12 00	،،	بغیر اجازت
10 00	،،	آتش پارے
10 00	،،	سرگزشتِ اسیر
8 00	،،	شکاری عورتیں
6.00	،،	نور جہاں سرور جاں
10 00	،،	بغیر عنوان کے
27 00	کرشن چندر	باون ہنرے
18 00	،،	ایک کروڑی بوتل
12 00	،،	پوکاپس کی ڈالی
12.00	،،	وزیرون کا کلب

مکتبہ شعروادب سمن آباد۔ لاہور